

سایہ گل

پاک سو ساسی

اسٹیل پبلک لائبریری
اسٹیل
0301-7283296
0334-9630911

ڈاٹ کام

زاہدہ پروین



انتساب

اباجی

کے نام

جو ہم سے یکم اگست 1999ء کو پھرن گئے۔

تاحشر تیرے سائے کو ترسیں گی نگاہیں

یوں تجھ سے پچھڑنے کا نہ تھا وہم و گماں بھی!



پیشکش: اسلام آباد، پاکستان
 آفیس: میل بھنگہ - 7283296
 کاروبار: روزنامہ نگاری، پبلشری، مطبعہ

اس روز چلیلائی دھوپ چاروں اطراف پھیلی تھی۔

غضب کی گرمی اور گھٹن کا دور دورہ تھا۔ گرم گرم لو کے پتھیرے جان و تن جھلسائے ڈال رہے تھے شاید ایسی گرم دوپہروں کے لئے یہ کہات مشہور ہے کہ جیل انڈا چھوڑ رہی تھی۔

اس جھلٹی دوپہر کو جب لوگ باگ جلدی جلدی اپنے روزمرہ کے کاموں سے ہٹ کر اپنے کچے گھر وندوں میں چھپے ہوئے تھے اور کھیت کھلیاں، پگڈنڈیاں، باغات اور گلی کوچے ویران تھے۔ ایسے میں شہر کی طرف سے آنے والی بکی سڑک پر ایک یکہ نمودار ہوا اور ”خٹخٹ“ کا سزا بجاتا اس گاؤں کے رہائشی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کچے راستے کے دونوں جانب پھلدار درخت قطار در قطار کھڑے تھے۔ اس شدت کی گرمی میں کوئی پھول پتا تک ہلتا نظر نہ آ رہا تھا۔ رس دار کالے کالے جاسن اور مونے مونے شہتوتوں سے ڈالیاں لدی پڑی تھیں۔ فضا میں آموں کی میٹھی میٹھی خوشبو اور کبھی کوئل کی درد بھری پکار سے معمور تھیں۔

کچے پر چاروں طرف سے ایک چادر منڈھی تھی۔ آخری گوشے سے ایک چودہ پندرہ برس کی معصوم چہرہ لڑکی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی

پیش لفظ

میرا خیال ہے کہ ہر کسی کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موز ضرور آتا ہو گا جب اس کے بہت سے کبے اور ان کبے جذبوں کو نیند سی آنے لگتی ہو۔ ایسا ہی شائد کچھ عرصہ سے میرے ساتھ ہونے لگا تھا۔ غالباً میں اٹھ رہی تھی جب۔۔۔ ساگر پشپتر نے مجھے بیدار کیا۔ اور میں جڑ بڑا کراچی لکھی اور بے لکھی چیزیں منٹنے لگی۔

”سایہ گل“ ہے تو میرا دوسرا ناول، مگر اس اعتبار سے یہاں کہ کتابی صورت میں پہلی کوشش ہے اور پہلے ناول ”اندھیرے اجالے“ کی طرح قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔

میں نہیں جانتی کہ فنی اعتبار سے یہ ناول کہاں تک کامیابی کی منزلوں سے ہمدرد ہو تا ہے تاہم میں اس کے لئے دعا گو ضرور رہوں گی۔ اس سلسلے میں آپ سب کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ہی آئندہ کیلئے مشعل راہ ہو گی۔ گو کہ میری آپ کی جان پہچان کا عرصہ گزشتہ تئیس سالوں کی طوالت پر محیط ہے مگر کتابی صورت میں تو بہر طور یہ پہلی ملاقات ہی ہے۔

اس موقع پر اگر طارق اسطیل ساگر صاحب کا ذکر نہ کروں تو بات بھی اوصوری رہے گی اور میری کم ظرفی بھی ہو گی۔ ”سایہ گل“، ”کواک“، ”آپ و تاب دے کر آپ کے سامنے لاتا در حقیقت انہی کا کارنامہ ہے۔ ساگر صاحب کی خوش کہان تک بار آور ہوئی اور میرا قلم کس حد تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

زابد پروین

نومبر 1999ء

اس کی نگاہیں پیڑوں کی بلند یوں کا طواف کرنے لگتیں۔ کبھی ان پیڑوں کے عقب میں جھانکنے کی کوشش کرتیں۔ اور پھر ہر طرف سے مایوس سی ہو کر تیزی سے پیچھے سرکتی سڑک کو گھورنے لگتیں۔

سرمنی سڑک پر پکے پکے جامن، شہوت اور کہیں کہیں مکے ہوئے آم بھی پڑے تھے مگر یوں محسوس ہوا جیسے وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہی۔ اس کے دل و دماغ کسی خاص سوچ میں ڈوبے ہوئے لگ رہے تھے یوں جیسے اس کا ننھا سادماغ کسی جتنی کو سلجھانے میں مسلسل مصروف ہو۔

گود میں بیٹھے ہوئے نو سو ماہ کے بچے کو اس نے اپنی نازک نازک بانہوں میں مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مبادا انھوں سے چھوٹ نہ جائے۔

کیکے کی اگلی سیٹ پر ایک باریش صاحب براہمان تھے۔ سرخ و سپید شکل و شبابت اور چوڑی ہڈی سے خاندانی اور بارعب شخصیت معلوم پڑتے تھے۔ دائرہ گو گو سفیدی مائل تھی، تاہم صحت کے لحاظ سے حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھے۔ اس وقت مہین کلیوں دار کرتے اور علی گڑھی پاجامے میں ملبوس انتہائی جامد زیب لگ رہے تھے۔ ان کے برابر میں پہلو سے پہلو مائے کالا ریشمی برقعہ اوڑھے ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ گورگت خاصی گہری سانولی ہی تھی مگر نقوش جینے اور رکھ رکھاؤ میں غایت درجے کا نکتہن پایا جاتا تھا۔ عمر کوئی بھی رہی ہوگی۔ تیس بیستیس سال۔ دبلا پتلا چہرہ براہمن۔ اس وقت گلابی رنگ کا خوب کا دہرا غرارہ اور سبز مہین کرتا پہنے تھیں۔ چہرے پر بلا کی آسودگی اور شادمانی کے آثار تھے۔

کیکے بان بار بار گردن اور پیشانی سے بہتا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس جس آلودہ و پیر میں سڑک پر اور اس کے آس پاس کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ درختوں کے ہریالے سایوں کے باوجود ٹھنڈک کا احساس مفقود تھا۔ کیکے کا گھوڑا بھی مرے مرے قدموں

سے جیسے سوچ سوچ کر چل رہا تھا۔ شاید گرمی اور لو کی تپش سے گھبرا کر مالک نے بھی اسے اس کی مرضی پر آزاد چھوڑ دیا تھا۔

”اماں..... اماں.....“ اچانک کچھلی سیٹ سے ایک باریک سی آواز ابھری۔

مگر خاتون پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح لا تعلق سی بیٹھی رہیں۔

”اماں..... اماں.....!“ آواز پھر بکلی۔ ”مجھے پیاس لگی ہے اماں۔ پانی پلا دیجئے۔“

اماں..... اماں.....“

”چپکے بیٹھے رہو۔“ انہوں نے دفعہ گردن موڑے بغیر اسے جھڑک دیا۔

بچہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ ایک سات آٹھ برس کا سہا سہا لڑکا تھا جو کیکے کی کچھلی نشست پر ایک کونے میں سڑا بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کا ننھا سادماغ جو پسینے کی بوتلوں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس کے روتے ہی جلدی سے پاس بیٹھی بہن نے ایک ہاتھ سے اسے اپنی طرف سمیٹ لیا اور اس کا سر تھپکتے ہوئے دلگیر لہجے میں دیر سے بولی۔

”نہ..... نہ..... روتے نہیں ہیں بھیا! رونے کی کیا بات ہے۔ بس ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔ پھر جتنا چاہے پانی پی لیا۔“

آٹھے بیٹھے ہوئے شخص نے اس گفت و شنید میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی لا تعلق سے انداز میں بیٹھے رہے۔

لڑکے کی بکلی بکلی سسکیاں اب تک ابھر رہی تھیں۔



بڑے سے حویلی نما کپکپے گھر کے آگن میں دو پیر سنساری تھی۔

نیم کے بلند و بالا تاورد رخت کے پتوں میں کتنی ہی مٹھی مٹی چڑیاں پروں میں

چونچ چھپائے ہانپ رہی تھیں۔ ہینڈ پمپ کے قریب بہت سارے سوکھے پتے جمع تھے۔ ایک طرف کیارپوں میں مہندی کے جھلا لگے تھے۔ بیچ آگن میں لمبوں کے دو بیڑ سر نہواڑے کھڑے تھے۔ گھر کے رہائشی حصے سے بہت دور مویشی خانہ تھا۔ جس کی حدود سے قبل کبھی مٹی کی ایک پتلی سی دیوار تھی۔ اس کے اندر ہی چارہ کٹنے کی مشین لگی تھی۔ باڑے میں چند بکریوں کے سوا باقی سارے جانور باہر چرنے گئے ہوئے تھے۔ اس گرمی کی شدت میں بکریاں جگلی کرنا بھی بھولے ہوئے تھیں۔

بازا تو باڑا۔۔۔ رہائشی حصے کی طرف بھی الو بول رہا تھا۔ کشادہ صحن کے بعد ایک طویل و غریب برآمدہ تھا برآمدے کے عقب میں اونچی اونچی چھتوں اور بڑے بڑے مضبوط دروازوں والے چھ کمرے تھے۔

گرد و پر کی ان سنسناتی گھڑیوں میں ہر دروازہ اندر بند رہتا تھا۔

لپا پتا یہ صاف ستر ادھیان تھا اس وقت بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے کینوں سے خالی ہو لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی موجود تھا۔ لیکن کثرت عورتوں بچوں اور لڑکیوں کی تھی۔ غالباً گھر کے مرد اپنے کام پر ہوں گے۔

ایک کمرے میں دو الگ الگ چارپاؤں پر دیورانی اور جیٹھانی لیٹی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک اور چارپائی پر دو تین بچے آڑے تر جیسے لیٹے سو رہے تھے۔

باہر کی قیامت خیز گرمی کی نسبت کمرہ کہیں آرام دہ اور ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ دیواریں مٹی کی تھیں سینٹ بگری کی نہیں۔ یہاں کی نیم تاریکی، فرحت بخش اور سکون آور معلوم دے رہی تھی۔

دیورانی نے گود کے بچے کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف لٹاتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلاتے ہوئے جیٹھانی کو مخاطب کیا۔

”ہائے بھابی میری تو حیرانی کم نہیں ہوئی۔ آخر یہ ابامیاں کو سو جھی کیا؟ بھلا کبھی

پہلے بھی کہتے برادری میں یہ بات سنی ہے؟“

جیٹھانی نے اس سے بھی حیران لہجے میں جواب دیا۔ ”ارے میں نے جب سے سنا ہے دل کو کچھ لگے ہوئے ہیں۔ جی بات ہے میں تو جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ مجھے یقین نہ آئے گا۔ ہائے ریمہ! ابامیاں کی صورت یاد آتی ہے تو تعجب سے دم گھٹنے لگتا ہے۔“

ریمہ نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں بھابی سیکند بات ہی کچھ ایسی حیرانی والی ہے۔ لیکن یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ گل بھیا تو کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتے اور پھر وہ بھی اپنے ہی باپ کے خلاف۔!۔ یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا یہ تو تینوں بھائی ہی باپ سے کس قدر ڈرتے ہیں اور اور پھر گل بھیا سے کسی فضول بات کی توقع کون کر سکتا ہے؟“

”ہاں ٹھیک کہتی ہو۔“ سیکند بھابی نے فوراً اس کی تائید کی۔

”گل نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاتھوں کا پروردہ ہے۔ وہ تو اگر کوئی جھوٹ بات بھی کہہ دے تو جھٹکے۔ ابامیاں سے سب میں زیادہ وہی تو قریب ہے اور پھر اس کا کہنا ہے کہ وہ خود نکاح میں شریک تھا۔ بلکہ ابامیاں نے جتنی خریداری کروائی، جوڑے سلوائے، زیورات بنوائے، گل ہر تیاری میں پیش پیش تھا۔ بھلا وہ تو لکھنوکا کیزا ہے۔ ہر بازار میں اور ہر گلی کوچے سے واقف۔۔۔۔۔“

اچانک ریمہ کا بچہ رونے لگا وہ ”اللہ اللہ“ گھر کے اسے تھکنے لگی۔

بھابھی سیکند نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑتے ہوئے پھر کہا۔ ”میں کہتی ہوں ریمہ اب تو اللہ رکھے ابامیاں کی اولاد بھی سیانی ہو گئی تھی۔ سب سے چھوٹا گل تھا، ماشاء اللہ وہ بھی جوان ہو گیا، اب بھلا انہیں دوسری شادی کی آفت ہی کیا آئی تھی؟ اوندہ! پتلے ہیں بڑھاپے میں شادی رچانے۔ ایمان سے مارے گاؤں میں شور مچا کیا

ہے۔ یوں تو سارے گاؤں والے اپنے ہی کنبے کے لوگ ہیں مگر ایسی انہونی باتیں کنبے والے ہی تو زیادہ اڑاتے ہیں۔ کل تالیا کے ہاں سے ان کی بڑی بہو آئی تھی ساتھ ساتھ وہ کیا کہہ رہی تھی؟“

رئیسہ نے افسوس کے لہجے میں کہا۔ ”یہ بات تو ہر کوئی کہے گا۔ سچ ہی تو ہے کہ اگر شادی کرنی ہی تھی تو اپنے کنبے میں کر لیتے۔ کوئی نہ کوئی راندہ بیوہ مل ہی جاتی۔“

”بھلا گاؤں کی راندہ بیوہ انہیں کیا بھلی لگتی؟“ سیکندہ بھابھی نے تھوڑا انس کر مذاق کے انداز میں کہا۔ ”انہیں تو لکھنؤ والوں سے رشتہ داری جوڑنی تھی اس بڑھاپے میں۔ اللہ کی شان! بیاہر چایا تو وہ بھی بچوں کی اماں سے۔“

”آپ بھی کمال کر رہی ہیں بھابھی۔“ رئیسہ نے مسکرا کر انہیں ٹوک دیا۔ ”اس مہر میں کوئی بیوہ نہ ملے گی تو کیا کٹواری ملے گی۔ تین بچوں کی اماں ہی تو ہے۔ جبکہ خود ابا میاں کی اولادیں بڑھاپے کی دلہیزوں کو چھو رہی ہیں۔ آخری اولاد گھل بھیا ہیں تو وہ بھی جوان ہو چکے ہیں۔ ماشاء اللہ ابا میاں، نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں والے ہو گئے۔ اسے میں تو کہتی ہوں بھابی سیکندہ! بھلا ابا میاں جب اپنی ان لکھنؤ والی بیگم صاحبہ کے ساتھ یہاں گاؤں میں آئیں گے تو کس دل گردے سے آئیں گے؟“ پھر خود ہی ہنسی ضبط کرتی ہوئی بولی۔ ”ایمان سے سچ کہتی ہوں بھابی! اگر خدا نخواستہ میں ابا میاں ہوتی تو مجھے بہت شرم آتی۔ میں تو کبھی گاؤں میں اپنے عزیز، رشتے داروں کو صورت دکھانے بھی نہ آتی۔“

رئیسہ سنجیدگی سے بولی۔ ”یہ سب شہر میں رہنے کی صفت ہے۔ وہیں کے آزادانہ اور بے باک قسم کے طور طریقے اپنانے ہیں ابا میاں نے۔۔۔ لو بھلا پھوپھی اماں (ساس) کی زندگی سے شہر میں رہتے آئے ہیں۔ اول تو انہوں نے یہی غلط کیا کہ اپنی گھر کی زمینداری چھوڑ کر شہر میں نوکری کی اور سداویں کی رہائش بھی رکھی۔ میں نے

اکثر بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ بچپن سے ہی زیادہ تر گھاؤں سے باہر رہے۔ انہیں کبھی باڑی اور مل بیل سے کبھی رغبت ہی نہیں رہی بس عید تہوار گھر آتے تھے، پھوپھی اماں اللہ انہیں جنت نصیب کرے، ہمیشہ اس بات پر کڑھتی رہیں مرتے بھی یہی ایک غم اپنے ساتھ قبر میں لے گئیں۔ اب ان دوسری بیگم صاحبہ کا کیا حال ہوتا ہے! یہ دیکھنا ہے؟“

”ہوں۔۔۔ اس خیال میں مت رہنا!“ سیکندہ بھابی نے طنزیہ انداز میں ایک ابرو چڑھا کر کہا۔ ”ہر عورت ہماری ساس جیسی صبر والی نہیں ہوتی۔ شہر والیوں اور دیہاتی عورتوں میں بہت فرق ہوتا ہے اور پھر یہ دوسری بیگم صاحبہ ہیں بھی کہاں کی؟ لکھنؤ شہر کی جو نزاکت و نفاست میں سب سے آگے ہے وہ تو یہاں گاؤں میں ایک دن بھی نہ رہ پائیں گی۔ سچ کہتی ہوں رئیسہ! اگر انہیں یہاں ہر چیز میں گوبر کی بدبو نہ آئے تو نام بدل دینا میرا۔“

رئیسہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ”چلو ابا میاں کا مزاج تو درست کرے گی ہمیشہ انہوں نے اپنے من کی کی۔ کیا خبر اب حساب کتاب کا وقت آپہنچا ہو اور یہ دوسری بیگم صاحبہ انہیں اپنے اشاروں پر چلا لیں اور اپنے اور اپنے بچوں کے سوا کسی کا بھی نہ رہنے دیں۔“

”دیکھ لیتا تم بالکل ایسا ہی ہو گا۔“ سیکندہ بھابھی نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔

”کیا ہو گا؟ کہاں ہو گا اور ابراہیم بھی تو نہیں!“

گل نے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے کہا اور آتے ہی بڑی بھادج سے پوچھا۔

سیکندہ بھابی نے دیور کو دیکھ کر بات پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

”کچھ نہیں۔ ہم ذرا بچوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ تم سناؤ صبح سے کدھر غائب تھے؟“

گل نے اپنے آپ کو رئیسہ چارپائی پر گراتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

”ارے غائب کہاں ہوتا تھا بھابی۔ گندم کی کٹائی ہو رہی ہے وہیں کیتوں پر بیٹھ کر

”چلو جی۔۔۔ گل میاں بھی گئے کام سے۔“ سیکینہ بھابی نے ننھا سا قہقہہ لگا کر طنزیہ انداز میں کہا۔

گل نے ریہہ کو گھاس دیتے ہوئے شوشی سے جواب دیا۔ ”خیر۔۔۔ وہ آپ کی ساس تو کسی طرف سے بھی نہیں لگتیں۔ ایسی طرہ دار، نازک نازک سی۔۔۔ وضع دار خاتون ہیں بھابی کہ بس کچھ مت پوچھے۔“ شوقین مزاج بھی بہت ہیں۔ اچھے سے اچھا پہننا اور دھنا تو جیسے ان کی سرسرت میں داخل ہے اور کھانا تو اتنا مزیدار پکائی میں کہ گھنٹوں زبان اسی لذت سے آشتار ہتی ہے۔۔۔“

جاتے ہوں گے؟ ان کے اپنے بچے ہی کھا چاٹ جاتے ہوں گے۔
 ”ارے چھوڑئیے بھی۔“ گل نے ان کی لمبی چوڑی تقریر سن کر برا سامنہ بنایا۔
 ”کیا کھا چاٹ جاتے ہیں ان کے بچے! میں کہتا ہوں ایک لحاظ سے تو وہ اپنے بچوں کے لئے بڑی کڑیاں ثابت ہو رہی ہیں۔ پہلے جہل خود میرا بھی یہی حال تھا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے بچوں کے لئے ہی کرتی ہیں لیکن جب میں وہاں رہا تو رفتہ رفتہ میری آنکھیں کھلتی گئیں اور مسلمان ہیں تو یقین کیجئے ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے اپنے سٹھی اور بیچ خیالات پر خود بخود ندامت ہونے لگی اور میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنی کمینگی پر معافی مانگی۔ اللہ پاک کی قسم بھابی۔۔۔“

سکینہ نے اس کی بات کاٹ دی اور چنگ کر بولی۔ ”اے بس اب ان کے اوصاف بیان کر بھی چکو۔ ایسا بھی کیا تم نے دیکھا کہ اپنے آپ کو کمینہ بھی بنالیا اور خدا سے توبہ و استغفار بھی کرنے لگے۔“

لیکن گل ان کی بات کا برا مانے بغیر سنجیدگی سے کہتے رہے۔ ”دنیا میں ایسی کوئی عورت آپ نے دیکھی ہو گی کہ شوہر جب تک سو کر اٹھ نہ جائے نہادھو کر تیار ہو کے ناشتہ پانی سے فارغ ہو جائے اور آرام سے ڈیوٹی نہ چلا جائے بچوں کو ناشتہ بھی نہ کرنے دے؟ ابامیاں کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتی ہیں؟ شاہی نوکری ہے شاہی۔ دس ساڑھے دس بجے سے قبل کبھی دفتر گئے ہی نہیں۔ جب تک وہ سو کر نہ اٹھ جائیں کسی بچے کو روکنے تک کی اجازت نہیں۔ اور بچے بھی کو نہا سمجھ دار ہیں۔ سب میں بڑی لڑکی تیرہ چودہ برس کی ہے۔ ایک لڑکا پانچ چھ سال کا اور سب میں چھوٹا تو ابھی پورنی طرح چلنا بھی نہیں سیکھا۔ میں تو کہتا ہوں آخر میں ہے اس لڑکی پر جمال ہے ابامیاں یا اپنی اماں کے پاس ان بچوں کو پھٹکنے دیتی ہو۔! ہر وقت مرغی کے چوزوں کی طرح گھیرے ہوئے رہتھی ہے جمال ہے جو ماں کے حکم کے بغیر کوئی پھر نہ وجائے یا اوپر کی منزل چلا جائے؟

مختلف خیلے بہانوں سے دونوں کو نیچے ہی بہلائے رکھتی ہے۔ ابامیاں جب دن کے دس بجے تیار ہو کے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی چمڑی ہلاتے ہوئے نیچے اترتے ہیں تو آخری سیر می پر ان کا ردی ان کے انتظار میں اٹھن شن ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ روانہ ہوتے ہیں دونوں لڑکے۔۔۔۔۔ بہن کا ہاتھ چمڑا کر اوپر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھابی اس وقت صبح کے دس بجے ہوتے ہیں۔ بواڑے پہلا گھلا ماں کے پاس یوں پہنچتا ہے جیسے قید خانے سے چھوٹا ہو۔ جب بہن چھوٹے والے کو گود میں سنبھالے اوپر آتی ہے۔

پھر ایک اور تعجب خیز پہلو سنئے۔ ان کی اماں جو ناشتہ ان کو دیتی ہیں، اس کے بعد لڑکے تو قدرے آزادی سے کھیل کود میں مگن ہو جاتے ہیں اور لڑکی دوبارہ شامت آجاتی ہے۔ اپنے کزروں سے ہاتھ خیروں سے وہ جھاڑو لگاتی ہے۔ برتن مناجھتی ہے۔ آنا گوندھنا، مھالے پینا، ملازموں کے اوپر والے سارے کام ذرا سی جھٹ کے بغیر مشین کی طرح کئے جاتے گی۔ جب تک میں وہاں تھا کوئی ملازمہ وغیرہ تو ملی نہیں تھی۔ چند ایک سے کہہ رکھا تھا شاید مل گئی ہو توبے چاری کی جان چھوٹ گئی ہو۔“

سکینہ بھابی اور ریحہ جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ داستان امیر حمزہ سن رہی تھیں، گل کے خاموش ہوتے ہی بیک وقت پوچھنے لگیں۔ ”ذرا سی بچی سے کام کرواتی ہیں اور اماں کیا کرتی ہیں سارا دن!“

گل نے ایک طویل سانس لیا اور پچھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”بیکار تو وہ بھی نہیں رہتیں۔ باورچی کو خود ہی چھٹی کروادی کہ عمدہ کھانا نہیں پکاتا۔ حالانکہ وہ ابامیاں کا بہت پرانا باورچی تھا اور خاصا ذھن کا کھانا تیار کر لیتا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ ابامیاں نے بیک جنبش زبان بے چارے کی چھٹی کر دی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ لڑکی سے تو اوپر کا کام لیتی ہیں اور خود پکاتی ہیں، رینڈھتی اور بگھارتی ہیں۔ مثلاً لڑکی سے چاول بھالائے، مھالے پسوائے وغیرہ اور چوہے پر بیٹھ کر بگھارے خود۔ دم خود

دیا۔ چپائیاں بھی خود پکاتی ہیں۔ اباسیاں اور خود اپنے لئے پکانے کے بعد باقی کا آٹا لڑکی کو دے دیتی ہیں پکانے کو۔ ارے بھابی! ہر روز دو تین ہانڈی تو پکتی ہیں ان کے ہاں۔ ہر دوپہر نئے فروٹ کا اہتمام ہوتا ہے آپ کبھی دوپہر کو جائیں تو محسوس کریں گے جیسے کوئی مہمان آرہے ہوں کھانے پر۔۔۔ ایمان سے بہت نفاس اور سلیقے سے پکاتی ہیں۔ اباسیاں کی زبان گن گاتے نہیں تھکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے ساری زندگی ایسا کھ چھن نہیں ملا تھا۔ لیکن معصوم بچوں کے ساتھ ماں کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے تو بہت رحم آتا تھا۔ ایک طرح انہوں نے اپنے بچوں کو اباسیاں سے ڈرا رکھا ہے اور اباسیاں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کتنے غرور کی حد تک کم خن ہیں! جب ماں ہی توجہ نہیں کرتیں تو سوتیلے باپ کو کیا ضرورت ہے پرانی اولاد کا خیال رکھے۔ کم سے کم میں نے تو کبھی ان کو اپنے بچوں سے پیار کرتے نہیں دیکھا۔ لڑکی اتنی خود دار ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں سمیت ان کے سامنے کبھی پڑتی ہی نہیں۔ یا پھر شاید ماں نے منع کر رکھا ہو گا۔“

سکینہ بھابی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر متر و نثر ڈالیں کہ۔ ”ہاں بھئی۔ دنیا میں ہر ٹائپ کی عورتیں ہوتی ہیں ورنہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر وہ بچوں کو اباسیاں سے مانوس ہونے دیں تو اتنے سنگدل تو وہ کبھی نہیں ہیں کہ ان سے سوتیلا سلوک کریں گے۔ وہ تو کبھی بچوں کی ماں جانے کس مصلحت کے تحت خود ہی ان لوگوں کو دور دور رکھتی ہیں۔ ورنہ یتیم بچوں کا ساتھ دینا اور ان کے ساتھ پیار محبت سے پیش آنا تو اب کا کام ہے۔“

باتوں کے دوران دونوں یورانی جیٹھنی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور کچھ کچھ رنجیدہ بھی ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔

پھر ریمہ نے تھوڑا سا مسکرا کر پوچھا۔ ”اور وہ شوقین مزاجی والی کونسی بات بتا رہے تھے تم! وہ تو ج میں رہ گئی۔“

گل نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ”شوقین مزاجی یہ کہ تین بچوں کی ماں ہو کر بھی ہر وقت سولہ بلکہ سترہ اٹھارہ سنگھار کئے رکھتی ہیں۔ سرمہ مسی، سنگھی چوٹی، بس نئی نئی دلیہں معلوم ہوتی ہیں۔ لباس ایسے دیدہ زیب اور چمک بھمک کر بس دیکھا کرو۔ بہت ہی شوخ رنگ پسند ہیں ان کو پھیکے، دھیسے اور ہلکے رنگوں کو ”اے نوج“ کہہ کر دور..... پھینک دیتی ہیں۔ یہ بڑے بڑے ریشمی غرارے اور اونچی کوالٹی کی ساریاں باندھتی ہیں۔ ارے بھابی! ہر شام تو ایک لونڈا ملازم ان کے لئے موتیا کے ہار گھرے پہنچا کے جاتا ہے۔ پھولوں سے تو اس قدر عشق ہے ان کو اپنے جوڑے اور کلائیوں میں باندھے رہیں گی ہی، پانی کی سراجی تک پہ پھولوں کے ہار لپٹے رہتے ہیں۔ خوش مزاج اور خوش مذاق بھی بہت ہیں۔ میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی تھیں۔“

ریمہ نے شرارت سے دیوار کو چڑانے کے مارے جس کر کہا۔ ”اچھا۔۔۔ تو یہ تھی ان کی شوقین مزاجی!“

گل جھج جھج چڑھ گئی۔ اور غصے سے منہ لال کر کے بولے۔ ”تو پھر سنئے اصلی شوقین مزاجی۔۔۔ وہ۔۔۔ آپ کی ساس صاحبہ ”سنیما“ بھی دیکھتی ہیں۔“

”ہائیں۔۔۔۔۔ سنیما!!“

حیرت کی شدت سے ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

گل بھادو جوں کی کیفیت سے لطف اٹھانے لگے اور نتیجے کو گدگداتے ہوئے کہنے لگے۔ ”اب آیامزہ دونوں کو۔“

کچھ دیر بعد سکینہ بھابی کے حواس درست ہوئے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور پیشانی کا پسینہ خشک کرتی ہوئی بولیں۔ ”تب تو بھیا دور دیکھنے کی چیز ہوں گی۔ مجھے تو بہت اشتیاق ہو گیا۔“

ابھی پورے طور پر الفاظ ان کی زبان سے ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر

کسی نے زوردار لات رسیدی۔ ایک دھماکے سے دونوں کو اڑکھل گئے۔

دھماکہ اس زور کا ہوا کہ سونے ہوئے بچے بھی جاگ اٹھے۔

یہ تینوں حیران ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

دفعۃً گل بوکھلا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہکا کر بولے ”اب..... ابا

میاں.....“

”کیا بات ہے..... یہاں تو سب اس طرح گھومتے بچ کر سو رہے ہیں جیسے یہ دن نہ

ہو..... بلکہ آدھی رات کا وقت ہو۔“ باریش، سرخ و سپید رنگت اور قابل رشک صحت

کے مالک ابامیاں بچ کمرے میں آکر اپنی پٹ دار آواز اور گونجیلے لہجے میں دھڑا لے۔

تیرہ چودہ برس کی معصوم چہرہ لڑکی کی گود میں دبا ہوا بچہ سہم کر رونے لگا۔ چھ

سالہ لڑکا دبے پاؤں چلتا ہوا گل کی ٹانگوں سے جا لگا اور منمنکا کر بولا۔

”بھائی جان پانی..... پانی یاد دہائی جان۔“

گل نے دھیرے سے، بے حد نرمی کے ساتھ اسے اپنے سے قریب کر لیا۔

لڑکی روتے ہوئے بچے کو لے کر ایک گوشے میں سٹ گئی تھی۔

کمرے کی فضا ایک دم ہی بو جھل ہو گئی تھی۔

ابامیاں کی کڑی نگاہیں ایک ایک کر کے چہرے پر انگڑوں کی طرح برس رہی

تھیں مگر یہاں تو سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

جواب کون دیتا؟

دیورانی جھینڈی کی مٹی گم ہو گئی تھی۔ گل سر جھیکائے کھڑے تھے۔ بچے سہم گئے

تھے اور۔۔۔ ابامیاں! بچ کمرے میں کھڑے بیچ و تاب کھا رہے تھے۔ خود بخود ہی ان کا چارہ

چڑھ گیا تھا۔ شاید یہ بھی آگ بر سائی گرمی کا کرشمہ تھا۔

سیاہ ریشمی برقعے والی خاتون نہایت اطمینان سے کھڑی اس طرح ہر چیز اور ہر فرد

کا بازو لے رہی تھیں۔ جیسے معائنے پر نکلی ہوں۔ آنکھوں میں گہری اجنبیت تھی۔

ابامیاں چند لمحے کھڑے سب کو خشکیں لگا ہوں سے گھورتے رہے پھر دروازے

سے باہر جاتے ہوئے آہستگی اور ملامت سے بولے۔ ”آئیے نانہ بیگم..... آئیے آپ

ہمارے ساتھ آئیے۔“

نانہ بیگم جو اوپر کا برقعہ اتار کر ہاتھ میں لے چکی تھیں، دھیرے دھیرے چہرے کا

پسینہ خشک کرتی ہوں ان کے پیچھے پیچھے ”اف..... ہائے گرمی۔“ کے الفاظ بڑبڑاتی

ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں بچوں کی طرف انہوں نے..... پلٹ کر دیکھنے کی زحمت

بھی گوارا نہیں کی تھی۔ گویا ان بچوں سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

اس ایک لمحے۔۔۔۔

لڑکی کے چہرے پر سراسر سنگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں

پریشانی اور فکر مندی کے سائے ڈوبنے لگے۔ وہ بچے کو گود میں لئے لئے تیزی سے ماں

کے پیچھے چلی۔

”مشکبار..... مشکبار!“ گل نے آواز دبا کر دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا۔

اس کے قدم آپ ہی آپ ہٹ گئے وہ مڑ کر استقبالیہ نظروں سے انہیں

دیکھنے لگی۔

”تم یہاں آ جاؤ مشکبار..... بھابی کے پاس بیٹھو۔“ گل نے نرمی سے اسے واپس بلایا۔

وہ مرے مرے قدموں سے واپس کوئی اور سکیلہ بھابی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

گل نے کھڑے کھڑے تعارف کر لیا۔

”بھابی! ان کا نام مشکبار ہے۔ اور بیٹی یہ ہیں ہماری چھوٹی بھابی اور یہ بڑی بھابی۔“

وہ چپ چاپ بیٹھی فکر فکر سب کی صورتیں تک رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی کھلے دروازے

کی طرف دیکھنے لگتی جہاں اس کی اماں اور ابامیاس باہر گئے تھے۔

گل نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ تشفی آمیز لہجہ میں بولے۔ ”گھر اومت مشکبار۔ یہاں سب تمہارے دوست ہیں۔ تم ان دونوں بھائیوں کو اور ان کے سارے لشکر (بچوں) کو بہت محبت کرنے والے پاؤ گی۔ یہاں غیریت والا ماحول ہی نہیں ہے۔ سب اپنائیت سے ملیں گے۔ اب تم آرام اور سکون سے بیٹھ کر بھائی سے باتیں کرو میں جا کر ابامیاس کی طرف ٹھنڈا مشروب وغیرہ پیش کر آؤں دوپہر بہت سخت ہے نا اس لئے وہ لوگ آرام کرنے چلے گئے ہیں۔“

پھر رئیسہ کو مخاطب کر کے بولے۔ ”آپ ان دونوں بچوں اور مشکبار کو سنبھالئے۔ شربت وغیرہ پلائیے۔ شاید یہ تینوں سو جائیں کیونکہ گرمی کا احساس باقی رہا تھا نہ اپنی تھکاؤ کا۔ ان لہجوں میں ان کی تیز طراری اور برق رفتاری قابل دید تھی۔ مشکبار چھوٹے بھائی کو گود میں دبائے پٹنگ کی پٹی پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دوسرا بھائی گل کے چلے جانے کے بعد بہن کے شانے سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

رئیسہ جلدی جلدی روح افزائی بوتل کھولنے لگی۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔

ابامیاس بیٹھک میں تنہا نیم دراز حلقہ گز گزائے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی سوچ کا تاثر تھا مگر مجموعی طور سے چہرہ مطمئن اور آسودہ تھا۔

دفعۂ زیادہ گہرا سش لینے سے انہیں کسانسی کی وحاشا انھی تو وہ آپ ہی آپ چونک گئے اور حلقے کی لے ایک طرف کر کے سیدھے ہو بیٹھے۔ شرف کو بلا کر دو گھونٹ پانی پیا پھر اسے مخاطب کر کے بولے۔ ”اندر جاؤ۔ دیکھو اگر عباس اور ابامیاس آگئے ہوں تو انہیں ادھر بھیج دو۔“

”بہت اچھا میاں!“ شرف نے ادب سے جواب دیا اور گلاس لئے لئے وہاں سے ہٹ گیا۔

دوپہر کی نسبت اس وقت شام خاصی خوشگوار تھی۔ ہلکی ہلکی جی کو بھلی لگنے والی ہوا چل پڑی تھی۔ دن بھر جو گرمی سے طبیعتیں بولا بولی رہی تھیں، اب سکون پذیر ہو گئی تھیں۔ کھیتوں کھلیوں کی طرف سے ہرے برے چارے سے بھری ہوئی نیل گاڑیاں شہر کی طرف آنی شروع ہو گئی تھیں۔ چلچلاتی دھوپ سٹ کر رخصت ہو چکی تھی۔ تو گھروں کے کچے آگن اور ویران گلیاں آباد ہو گئی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ باورچی خانوں سے نکلتی دھوئیں کی لکیریں آسمان کی طرف محو پرواز تھیں۔ غرضیکہ دن کے موسم اور اس وقت کی رت میں بے حد تضاد حاکم تھا۔ جس سے انسان تو ایک طرف چن پرندے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔

ابامیاس کا موڈ بھی دوپہر کی نسبت اب خاصا خوشگوار تھا۔ ورنہ دوپہر کو وہ جس قہر برساتے موڈ میں گر جتے برستے نمودار ہوتے تھے، اس نے تو سب کا خون خشک کر ڈالا تھا۔ مگر پھر دوپہر بھر کے آرام اور اب ہوا کے جھونکوں نے انہیں بحال کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مسجد سے مغرب کی نماز پڑھ کر یہاں اپنے مخصوص تخت پر گاؤ نکلتے سے نیک لگا کر آ بیٹھے تھے اور حلقہ گز گزاتے ہوئے کچھ سوچے جا رہے تھے۔

چند لمحوں بعد ابامیاس اور عباس دونوں بھائی آگے پیچھے چلے ہوئے آئے اور باپ کو ادب سے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔

گویہ دونوں بچوں بچپن والے تھے اور ابھی خاصی عمروں کے سنجیدہ اور بردبار مرد تھے مگر اپنی خاندانی قدروں اور ذاتی اوصاف کی بنا پر باپ کا احترام و خوف کی حد تک کرتے تھے۔ ان کے سامنے کبھی اونچی آواز سے یا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

دوپہر کو جب سے ابامیاس یورپی اور بچوں کے ساتھ آئے تھے، عباس اور ابامیاس

تم سب کی کھال کھینچو لیتا۔ زبانی راکھ لگوا کر کھینچو لیتا۔۔۔ یہاں اسٹیشن پر اتارے ہیں تو دور دور تک گھر کے کسی فرد کا پتہ نہ تھا۔ گھر پہنچے تو۔۔۔ معلوم ہوا کہ سب خواب خرگوش کے مزے لوڑ رہے ہیں۔۔۔ گویا ہمارا یہاں آنا نہ آنا سب کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

ایاس اور عباس کے کان تو بدن میں لہو نہیں۔ صورتوں پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ پریشانی سے برا حال تھا۔

یوں تو ابامیاں کی عادت میں غصے کی آمیزش کچھ زیادہ ہی تھی۔ ان کے جلالی مزاج سے چھوٹا بڑا ہر کوئی گھبرا اٹھتا تھا۔ مگر آج کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ غیظ و غضب سے منہ سے کف جاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

اس غضبناک کیفیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ دوسرے نکاح کے بعد دل و دماغ کے کسی خفیہ گوشے میں کوئی نہ معلوم سا احساس انہیں بار بار یہ سمجھا رہا تھا کہ درحقیقت اس اقدام سے ان کی اولاد ناخوش ہوگی۔ چنانچہ اس سوچ کی روشنی میں انہیں ہر بات الٹی دکھائی دے رہی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ تازہ واقعہ وقوع پذیر ہو گیا تھا۔

دوا بھی تک خشکیں نگاہوں سے بیڑوں کو گھور رہے تھے۔

ایاس تو کبھی ان کے سامنے بولی ہی نہیں سکتے تھے۔ عباس نے قدرے جرأت و ہمت سے کام لیا اور بہت سنجیدگی سے بولے۔ ”جی..... ہاں۔ ایسا کبھی ہوا تو نہیں کہ آپ نے آنے کی اطلاع دی ہو اور یہاں سے اسٹیشن سواری نہ بھجوائی گئی ہو۔ آپ کی بدگمانی اپنی جگہ درست ہے لیکن..... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع کس کے ذریعے بھجوائی تھی؟ وہ کون ہے؟“

ابامیاں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر حقے کیئے دوبارہ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے تسخّر اڑانے والے انداز میں بولے۔ ”جناب! ہم نے اس ڈاکے کے ذریعے یہ خبر بھجوائی تھی جو ہر بیٹے سہارن پور سے اس طرف کے دیہاتوں میں ڈاک

سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ دونوں خاصی دیر پہلے کھیتوں سے آگئے تھے پھر باپ کے سامنے ان کے بانی ہی آئے تھے۔ اب ان لمحوں میں نظریں جھکائے باپ کے کچھ بولنے کے منتظر تھے۔ چہرے دونوں کے پر اضطراب تھے اور اندر سے دل بے چین!

تھوڑی دیر گھر اسانا طحاری رہا جسے ابامیاں کے حق کی گڑگڑاہٹ مجروح کر رہی تھی۔ پھر انہوں نے جلدی جلدی دو چار کس لئے اورئے ایک طرف کر کے پوچھا۔

”ہندم کی فصل کسی جا رہی ہے؟ کتنی کس سے کروا رہے ہو؟“

ایاس چونک پڑے بڑے بھائی کی طرف دیکھنے لگے مگر عباس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”خدا کا شکر ہے پچھلے برس کی نسبت یہ فصل زیادہ بھگڑی ہے اور مزدور تو میں نے وہی رکھے ہیں جو ہر فصل پر ہوتے ہیں باعتبار لوگ ہیں بے چارے۔“

”ہوں۔“ انہوں نے گویا اطمینان کا ہنگارا بھرا۔ پھر دونوں بیڑوں کی صورت غور سے دیکھ کر بولے۔ ”میں نے آج اپنے یہاں پہنچنے کی اطلاع کروادی تھی پھر بھی تم لوگوں نے سواری اسٹیشن پر نہیں بھیجی؟ اس قابل عارفانہ کوشش کیا سمجھو؟“

عباس اور ایاس حیران رہ گئے۔ مارے تعجب کے جیسے ان کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ عباس نے پریشان ہو کر باپ کی طرف دیکھا اور ہکا کر بولے۔ ”آپ نے..... اٹ..... اطلاع کروائی تھی! اکمال ہے ہمیں معلوم بھی نہیں۔“

”معلوم کیسے نہیں۔“ وہ غصے سے سرخ ہو کر بولے۔ ”یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے سہارن پور سے یہاں گاڑی میں اپنے آنے کی خبر پہنچوائی ہو اور نہ پہنچی ہو۔ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟ یہ کہو تم لوگ اپنی ناخلفی اور نالائقی کا ثبوت دینے پر تامل گئے ہو۔ آج مجھے ذاتی سواری کے ہوتے ہوئے اسٹیشن سے یہاں تک کرائے کے کیے میں آنا پڑا۔ جبکہ زائد سواری بھی ہمراہ تھی۔ تھ فہ تم لوگوں کے تعصب اور سطحی خیالات پر۔۔۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ اتنے گرے ہوئے اور بیخ ذہنیت کے بیٹے ہو تو بیٹھے بیٹھے

تقسیم کرنے لگتا ہے۔ اب بہانہ تلاش کیجئے آپ!“

الیاس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لے کر پہلو بدلا۔ عباس کے چہرے پر بھی سرفرخی چھا گئی۔ باپ کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پرجوش لہجے میں اطمینان سے کہنے لگے۔ ”بس تو پھر آپ کی بدگمانی فضول ہے۔ کیونکہ آپ گاؤں میں کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ اس ہفتے یہاں کی ڈاک ہی وصول نہیں ہوئی۔ آج کل وہ ڈاک موصول ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اچانک بیکار پڑ گیا ہو بے چارہ۔ ورنہ وہ تو مدت سے ڈاک لاتا ہے۔“

اس تازہ اطلاع پر ابامیاں نے گھور کر عباس کو دیکھا مگر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا شاید دل ہی دل میں اعتبار آگیا تھا۔

مزید کچھ بولنے کو تھے لیکن اسمد اللہ کو دیکھ کر خاموش رہ گئے جو ہڈ ایک ہاتھ میں پکڑے کھڑکاتے ہوئے آگئے تھے۔

ان کے بعد ایک ایک کر کے عزیز و اقارب آ بیٹھے۔

ان سب کی موجودگی میں خلاف معمول ابامیاں آج خاصے خوش خوش لگ رہے تھے اور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے۔

آنے والوں کے سلام کے جواب کے سوانہ حب معمول مزاج پر ہی کر رہے تھے نہ گندم کی فصل کا حال چال پچھ رہے تھے۔ ورنہ ہمیشہ گاؤں آکر ہر عزیز سے فرد افراد اسی نوعیت کی باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔

حقہ گر گزرتے ہوئے اچانک اسمد اللہ بولے۔ ”عبدالرحمن! سنا ہے تم نے وہاں شہر میں نکاح کر لیا ہے۔“

سب کے چہروں پر دہلی دہلی سی دلچسپی کے آثار دوڑ گئے۔ سب ہمد تن گوش ہو بیٹھے لیکن ابامیاں نہ گجھ اُسنے نہ ہنسنے۔ متانت اور بے پروائی سے جواب دے۔ ”تم

نے شاید صرف نکاح کا سنا ہے اور ہم اپنی منکوحہ سمیت آج گاؤں پہنچ چکے ہیں۔ یہ نہیں سنا تم نے!!“

اس کڑوے کیلے جواب پر اسمد اللہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

گھنگو ایسے نازک موڑ پر آ پہنچی تھی کہ عباس نے بروں کی اس محفل سے اٹھ جانا چاہا۔

الیاس نے بھی ان کی حقیقت کی مگر ابامیاں کی بارعب آواز نے ان کے قدم تمام لئے۔

”بیٹھ جاؤ میاں، کہاں جا رہے ہو تم لوگ!“

چار و ناچار دونوں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر مکمل خاموشی طاری رہی۔

سب لوگ اپنے اپنے ذہن سے سوچ رہے تھے کہ ابامیاں کیا کہنے والے ہیں۔

انہوں نے شر کو پکار کر حکم دیا۔ ”دیکھو اگل کہیں ہو تو اسے بھی بلا لاؤ۔“

گل اسی وقت شام کی سیر سے لوٹے تھے۔ سفید مہین لان کے کرتے اور پاجامے میں بہت جامہ زیب اور کھلے کھلے سے لگ رہے تھے۔ اس اچانک بلاوے پر وہ حیران و پریشان بڑے ہمایوں کے پاس آ بیٹھے۔

ابامیاں نے عادت کے مطابق دو چار لمبے لمبے کش لگانے کے بعد حقے کی ایک

طرف کر دی پھر بنا تمہید اور کسی کو مخاطب کئے بغیر سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”میں خوب اچھی طرح اس امر سے آگاہ ہوں کہ آج کل میری اولاد سمیت میرے عزیز و اقارب کس طرح کی باتیں کرتے اور سوچتے رہتے ہیں اور میں اس حقیقت سے بھی نااہل نہیں کہ اس عمر میں بادشاہ ہر کسی کو میرے اچانک نکل کر لینے پر

ایجنجا ہوا ہوگا۔ لیکن اس وقت میرے بچوں سمیت اتفاق سے آپ سب بھی موجود ہیں اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ ذرا وضاحت سے معاملہ سب کے گوش

گزار کروں۔“

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ دوسرا نکاح کوئی عیب نہیں۔ اس میں نہ عمر کی قید ہے نہ وقت کی، قانون اور شرع کے لحاظ سے خدا جس کو فراغت دے اور اس نعمت سے نوازے کہ وہ ہر دو کے اخراجات بے فکری سے ادا کر سکے، حقوق پورے کر سکے، دوسرا نکاح کر سکتا ہے۔ اور میں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بہت عرصے بعد یہ اقدام کیا ہے اور ظاہر ہے خلاف شرع نہیں کیا، لیکن --- چونکہ ہم پسمنگ کا شکار ہیں اور چھوٹے دل و دماغ سے سوچنے کے عادی ہیں اس لئے حقیقت پسند بھی نہیں ہیں۔“

ان کے آخری جملے سب کو ناگوار گزرے اور سب میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اسد اللہ سے ضبط نہ ہو سکا تو رہا ان کو نوک بیٹھے۔

”عبدالرحمن! تمہارے اندر یہ بہت بڑی خامی ہے کہ تم اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ و ارفع خیال کرتے ہو۔ خود سوچو اس وقت پسمنگ کی گالطعنہ کیوں دیا تم نے؟ کوئی جہالت دیکھی تم نے ہم لوگوں میں؟“

ابامیاء نے جڑے بغیر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کسی کے کردار پر بلا وجہ نکتہ چینی کرنا اور جبکہ اس کے خلاف کوئی جرم بھی سرزد نہ ہوا ہو، پسمنگ کی اور جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کم از کم اپنے مذہب اسلام سے اس حد تک تو ہر کسی کو ضرور ہونی چاہئے کہ اسلام، صاحب حیثیت افراد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے یہاں میرے اپنے رشتے داروں میں میرے خلاف جیسی جیسی باتیں اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں میرے کانوں سے سب گزر چکی ہیں۔“

وہاں موجود سارے افراد کو چپ کی لگ گئی۔ جو کچھ ابامیاء کہہ رہے تھے اس میں ایک بات بھی غلط نہ تھی۔

ابامیاء کے پھوپھی زاد اور ہم عمر بھائی یعقوب نے تکیے انداز میں کہا۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سب کچھ ہم سمجھ رہے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس حد تک

مذہب سے ہم بھی آگاہ ہیں کہ مرد کو ایک چھوڑ چار شادیوں کی اجازت ہے۔ ہم تمہارے نکاح پر نکتہ چینیوں ضرور کرتے رہے ہیں لیکن کیا تم اس بات کی وضاحت کرو گے کہ تم نے اپنے گاؤں اور برادری سے باہر یہ شادی کیوں رچائی؟ کیا کہنے میں تم کو کوئی راز یہ وہ نظر نہ آئی تھی پچاس کو کس دور لکھنؤ میں جا کر شادی رچائی! کیا ہمارے لئے یہ قابل غور بات نہیں ہے!“

الیاس اور عباس نے پاس اب کے خیال سے اس محفل سے اٹھ جانا چاہا۔ کیونکہ اب ان کے باپ پر بار بار تنقید ہو رہی تھی اور ان دونوں کو لحاظ آ رہا تھا۔ مگر اس دفعہ ابامیاء نے اٹھتے دیکھ کر زور سے ڈانٹ دیا۔

”کیا پریشانی ہے تم لوگوں کو! بیٹھے رہو اسی جگہ پر، آج تمہارے سامنے پچھلے تین ماہ سے ہونے والی تنقید اور نکتہ چینی کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم متیوں بھائی بھی کان کھول کر سن لو اور آئندہ کے لئے دلوں میں کسی بدگمانی اور شک و شبہ کا بیج پرورش نہ پاسکے۔“

اتنا کہہ کر وہ ختم گئے۔ اس وقت ان کا صحت مند چہرہ غصے کی شدت سے تپ کر سرخ ہو رہا تھا۔ خدا و خدخال میں ایک بار عجب سا جلال ٹھانیں مار رہا تھا۔ ان پر یہ کیفیت بہت کم طاری ہوتی تھی۔

چند لمبے رک کر انہوں نے دوبارہ کبن شروع کیا۔

”جیسا کہ میں آغاز میں آپ حضرات سے کہہ چکا ہوں کہ --- بلاشبہ میں نے نکاح ثانی کیا ہے۔ خلاف شرع کوئی جرم نہیں کیا۔ چنانچہ جب میں خدا کا مجرم نہیں تو کسی بندے کی کیا مجال ہے کہ میرے اقدام کو قابلِ مزا قرار دے سکے۔“

دوسری بات یہ کہ میں نے کہنے پر برادری سے باہر نکل کر کیوں نکاح کیا۔ اس سلسلے میں یہاں جو جو باتیں ہوئی ہیں وہاں سہارن پور میں برابر مجھ تک پہنچتی رہی ہیں۔ لیکن

میں یہاں آنے کے لئے گرمی کی تعطیلات کا انتظار کر رہا تھا آج کا موسم یہاں گزرنے کا ایک بہانہ ہے۔ ورنہ میں صرف اپنے نکتہ جیس عزیزوں کی خدمت میں ان کی چ میگوئیوں کا جواب دینے ہی حاضر ہوا ہوں۔ میں آج۔۔۔ اپنی اولاد سمیت۔۔۔ سہم کے روبرو صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کنبے برادری کا قائل نہیں۔ میری نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ ہر کسی کو مولانا ایک مٹی سے تخلیق کیا ہے۔ کوئی بڑا نہیں کوئی چھوٹا نہیں۔ آپ کی نہیں، میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ میرا خیالات محض زبانی متحرج نہیں بلکہ میں نے عملی طور پر ایسا کر دکھایا ہے اور اللہ کا شکر ہے، احسان ہے کہ مجھے کوئی ندامت بھی نہیں، پیچھتاوا بھی نہیں۔ بلکہ خوشی ہے کہ میں کسی بے سہارا خالق کو آسرا بن گیا ہوں۔ تین بیٹیم بچوں کا سہاویہ بن چکا ہوں۔ یہ صرف ہماری غلط سوچوں کا تختہ ہے کہ ہم کنبے برادری کا چکر نکال کر بیٹھ جاتے ہیں ورنہ خدا نے تو آسمانوں سے ہمیں الگ الگ کنبے اور ذاتوں میں تقسیم کر کے نہیں تخلیق کیا اور اس دنیا میں محض تعصب اور فساد برپا کرنے کے لئے بھیج دیا۔ لہذا میر نے ان تمام خرافات سے علیحدہ ہو کر یہ فیصلہ کیا اور بعد احترام و جنوشی آج سے تین ما قبل نامہ بیگم کو اپنے عقد میں لے آیا۔ یہاں میں اپنے بڑے بچوں کو یہ اطمینان دلا: چاہتا ہوں کہ وہ اس خوف میں مبتلا نہ ہوں کہ زمین جانکاد یا مال اسباب میں ان کی حق تلفی ہوگی یا خدا نخواستہ کل کو بنوارے ہوں گے۔۔۔ نہیں! سب کو تسلی رکھی چاہئے۔ حوصلہ بلند اور نظر وسیع رکھنی چاہئے۔ انشاء اللہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔۔۔ میں نے جو کچھ کہہ ہے، اپنے تئیں اور سوچ سمجھ کر بہتر کیا ہے۔ یوں بھی میں ذاتی طور پر خود مختار اور اپنا مرضی کا مالک ہوں اور کسی کو خلق حق نہیں پہنچتا کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہو۔ یوں نکتہ چینیوں کا، بات سے بات نکالنا یا محضوں بازی کرنا بھی ہر کسی کا ذاتی فعل ہے۔ جو مجھ کہنا تھا وہیں نہ کہہ دیا۔ کسی کی باتوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔

ایک آخری بات۔۔۔ جو میں ہر کسی سے کہنا چاہتا ہوں، یہ بات میں اپنی صفائی میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس لمحہ کی ایک کڑی ہے، اسی لئے بتا رہا ہوں اور وہ یہ کہ اتنے برسوں کے بعد کہ جب ماشاء اللہ میری اولاد بھی جوان ہو گئی ہے اور مجھے ان کی پرورش و دیکھ بھال کی بھی کوئی پریشانی نہیں ہے تو میں نے نکاح کیا کیوں کیا؟

اس بات کا جواب میں اس لئے بھی ضرور دینا چاہ رہا ہوں کہ میرے سابقہ کئی سسرالی عزیزوں نے اس بات کو خاصی شہرت دی ہے کہ خدا جنت الفردوس عطا فرمائے جب ان بچوں کی والدہ کا انتقال ہوا تو گل فقط چھ ماہ کا تھا۔۔۔ چنانچہ مجھے نکاح ثانی اس وقت کرنا چاہئے تھے تاکہ بچہ کو دوسری ماں کی گود نصیب ہو سکتی، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ خدا میری ہمیشہ کو نیکی دے گل کو انہوں نے ماں کی کمی کا احساس ہی نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ کیلئے لگائے رکھا اس لئے کبھی مجھے پورے طور پر آگاہی نہ ہو سکی کہ بچوں کے لئے دوسری ماں کا وجود ضروری ہے۔

دوسرا اہم سبب یہ کہ جیسا آپ سمجھی کو معلوم ہے کہ میں اپنی مازمت کی وجہ سے زیادہ تر سہارن پور میں رہا اس لئے بچوں کے سارے مسئلے مسائل یہیں والے حل کرتے رہے۔ اس طرح میں بے فکر رہا۔

اور اب۔۔۔ کچھ بات ایسی بنی کہ چند دوست احباب کی وساطت سے میرا موجودہ رشتے طے ہو گیا۔ میں اپنے باورچی خانے کے ہاتھوں لئے سیدھے کھانے کھاتے کھاتے قدرے ادب گیا تھا۔ مگر بحالت مجبوری سب جائز تھا۔ کیونکہ مرنو بی بی نے تو اپنی پرانی اقدار و اباؤ اجداد کا گڑبگڑ بھی عارضی طور پر چھوڑنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ کبھی رشتے داروں نے حوصلہ افزائی کی تھی۔ خیر۔۔۔ یہ سب تو گئی گزری باتیں ہو گئیں۔۔۔ کنبے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نکاح کی بات چلی تو میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

اور اب خدائے ذوالجلال کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ میں ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنی ساری زندگی میں کبھی اس درجہ آرام اور آسائش نصیب نہیں ہوئی جیسی اب ہے۔

بس مجھ کو اسی قدر کہنا تھا۔ آپ سب کا شکریہ، کہ سب نے میری باتیں توجہ اور خاموشی سے سنیں مجھے اجازت دیجئے۔“

اتنا کہہ کر ابامیاں تخت سے نیچے اترے۔ بیروں میں جوتے پہنے اور باوقار انداز میں چلتے ہوئے اندر پھلے گئے۔ یہاں سب گم صم بیٹھے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

بنیادی طور سے ابامیاں کا تعلق زمیندار طبقے سے تھا۔ اور ان کی ذاتی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی واحد نرینہ اولاد تھے۔ دینے کو تو قدرت نے چودہ بچے دیئے تھے مگر والدین کی قسمت کہ صرف دو زندہ سلامت رہے تھے۔ ابامیاں بڑے تھے اور فاطمہ ان سے کئی برس چھوٹی جنہیں ابامیاں کے بچوں نے۔۔۔ ”بچو بھی جان۔۔۔ بچو بھی جان۔۔۔“ کہہ کر پورے گاؤں کی بچو بھی جان بنا ڈالا تھا۔

یہ ایک وسیع و عریض گاؤں تھا۔ یہاں سب ایک ہی کنبے کے افراد رہتے تھے۔ اس طرح سے جوں جوں بچے جوان ہوتے جاتے ان کے شادی بیاہ آپس ہی میں رہ چکے جاتے اور یوں گھرانوں میں گھرانے چلتے جاتے۔ انسان بڑھتے جاتے اور آتے جاتے موسم دیکھتے کہ ایک پود کی جگہ دوسری پود لے رہی ہے۔

ابامیاں کی اکھوتی بہن فاطمہ کے ساتھ بھی قدرت نے عجب بے انصافی کی تھی۔ ایسی کہ دور و نزدیک کوئی مثال ملنی مشکل تھی۔

دیہات کے پرانے رسم و رواج کے مطابق وہ گاؤں میں ہی اپنے گھرے تیار نہ ہونے سے منسوب تھی اور کچھ یوں کہ بچپن کا نکاح تھا۔ جو بڑے بھائی کی شادی کے موقع پر بڑھوا دیا گیا تھا۔

ڈاٹ کام

جب فاطمہ بیانی ہو گئی تو تائی، تایا، نائی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھوائے رخصتی کی تیار بن گئیں۔ آئے۔ کچھ بزرگ اکٹھے ہو بیٹھے اور یوں بعد خوشی رخصتی کی تاریخ طے پا گئی۔ دونوں طرف اپنی اپنی حیثیت کے مطابق زور و شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں طرف کئی روز پہلے سے ڈھونڈ رکھ دی گئی۔ لڑکیاں بالیاں ادھر بھی گانے آجاتیں اور ادھر بھی جاتیں۔ رات رات گئے تک ہنسی مذاق کا سلسلہ چلتا۔ ایک دوسری سے پھینچر چھڑاؤر بلند بانگ مخصوص میں پوری پوری رات بیت جاتی۔ شادی کیا تھی، پورے گاؤں میں رونق اور گہما گہما کا عالم طاری تھا۔

رخصتی کی شہ گھڑی میں ایک دن باقی تھا۔ لگے دن ابامیاں کی دہلیز پر بارانی آنے کو تھے۔۔۔۔۔ وہ فاطمہ کے کنوارے پن کی آخری رات ہوتی۔۔۔ اگر سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو پاتا۔

رات کا وقت تھا۔ دیہات کے جھانک اور محنتی لوگ۔۔۔۔۔ دو لہا بھی دل میں ہزار ارمان اور مسرتوں کی مچھلیجیاں سمیٹے لگے دن کے مبارک سورج کا سنظر تھا۔ مگر ان تمام خوشیوں کے ساتھ ساتھ اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں اور کاموں سے جی نہ چراتھا۔

اس رات اتفاق سے دو لہا والوں کا پانی کا وارہ تھا۔ وہ حسب معمول رات کو ہاریوں کے کام کا جائزہ لینے نکلا۔ اور جب۔۔۔ وہ تاروں بھری رات۔۔۔۔۔ منحوس اور زہریلی رات بن گئی۔ ٹیل بھر میں معصوم اور اہلڑ فاطمہ کی مانگ اجڑ گئی اور پورے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔

جس پانی کے نالے سے کھیتوں کو باری کا پانی دیا جا رہا تھا، دو لہا وہیں کھڑا کمال چلاتے باری سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا اور چاروں طرف کا جائزہ بھی لے رہا تھا، کہ جانے کب اور کیسے۔۔۔۔۔ کسی جھڑی کی اوٹ سے رہنیتے ہوئے سانپ نے اس کے منحنے پر کاٹ لیا۔

سانپ اتنا زہریلا اور ظالم تھا کہ اس نے پوری طرح سورج بھی نہ ابھرنے دیا اور صبح صادق کے وقت فاطمہ کے دولہا نے باپ کے زانو پر سر رکھے رکھے عالم غنودگی میں دم توڑ دیا۔

چاروں اطراف اک کہرام مچ گیا اس کے جوان لاشے پر بنیں اور ماں باپ پچھڑیں کھارہے تھے۔ نالہ و شیون کی آوازوں سے گاؤں کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا۔ وہ مہمان جو دور دور سے شادی کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے شام ہونے سے پہلے پہلے اس کے جنازے میں شریک ہوئے۔ اس کی موت کی خبر کہیں بھی پہنچانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی تھی۔ سب پہلے ہی سے جمع ہو گئے تھے۔ مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کبھی دو لہاؤں کی بارائیں اس صورت۔۔۔ اور اس المناک انداز میں بھی جانی پڑتی ہیں۔ سہرے کے پھول، قبر کے مغموم ہاروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ایک رات قبل دیہاتی رسوم کے مطابق جو اس کے ہاتھوں میں مہندی رہ چائی گئی تھی اس کی توتا زوہ مہک، لہہ کی تاریکیوں میں جا بسی۔

اوریوں۔۔۔۔۔ فاطمہ سہاگن ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔ اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو گئی۔ سیاہ بالوں کی گھنگھوڑ گھٹاؤں میں چاندی کے تار جھلما اٹھے، مگر اس نے کسی سے گلہ نہ کیا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ہی تجھہ گزار ہو گئی۔ گھر کے ماحول میں نماز، روزے اور عبادت کی خوشبو آنکھ کھول کر رچی پائی تھی۔ سوا سی مدغم ہوتی چلی گئی۔ سرسرا میں نہ کوئی جھٹھ تھانہ دیا، جس کے لئے سرسرا والے دوبارہ جوع ہوتے، اس طرح وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ عبادت سے جو وقت فرصت کا ملتا وہ بڑے بھائی کے بچوں کی دیکھ بھال اور چاچو چچلوں میں گزر جاتا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا فاطمہ نے کبھی بھادت سے۔۔۔۔۔ "تو" "تیک نہ کی۔ بلکہ جب ابامیاں کی بیوی کا انتقال ہو گیا تو اس نے عباس، الیاس اور گل کی پرورش اتنی محبت اور حقیقی

تھی اور رات دن کا آنا جانا تھا۔

ان تمام مددِ جرز کے ساتھ ساتھ، ابامیاں وہیں کے وہیں تھے۔ گاؤں میں کئی انقلابات آئے۔ خود ان کی زندگی کئی خوشیوں اور کئی غموں کی زد پر آئی، مگر ان کے ذاتی معاملات میں کچھ فرق نہ آسکا۔ انہوں نے ان بچوں کی ماں اور اپنے والدین کی زندگی ہی میں اپنے لئے کچھ اصول اور قواعد وضع کر لئے تھے اور اسی پر کاربند ہو گئے تھے۔ وہی اپنی ملازمت پر سہارن پور میں رہنا۔ عید تہوار یا گرمی کی تعطیلات میں گاؤں آتے۔ یا کسی شادی بیاہ یا موت زندگی وغیرہ پر ہفتہ عشرہ رہتے اور پھر واپس سہارن پور چلے جاتے۔ دراصل گاؤں کی زندگی اور یہاں کے رہن کو وہ قبول کر ہی نہ سکے تھے۔ گاؤں بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل تھے۔ اور اپنی ذہانت اور قابلیت سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

یہاں زمینوں کی دیکھ بھال، فصلوں کے اتار چڑھاؤ اور آتے جاتے موسموں کے رد و بدل میں سیاہ و سفید کے مالک عباس اور الیاس تھے۔ مگر یہ ابامیاں کی خوش نصیبی ہی تھی کہ ان کی اولاد انتہا سے زیادہ فرمانبردار اور سعادت مند تھی اور وہ جتنے پانچ پوتے ہر سال پوری فصلوں کا حساب کتاب اور کھاتے کے کھاتے باپ کے سامنے رکھ دیا کرتے۔ سہارن پور میں ابامیاں جہاں کرائے کی دو منزلہ بلڈنگ میں اکیلے اپنے نوکروں کے ساتھ رہا کرتے تھے عباس اور الیاس کا تو ہاں بہت کم آتا جانا رہتا تھا، بس کبھی کبھار کسی کام سے شہر آتے تو باپ کی خدمت میں بھی سلام کرنے آگئے مگر گل زیادہ تر انہی کے پاس رہتے تھے۔

تین بیٹوں میں یہ باپ سے کافی نزدیکی بھی تھی اور ان کے چہیتے بھی۔ ابامیاں کو بھی اس بیٹے سے حد درجہ الفت و محبت تھی۔ شاید سب میں چھوٹے ہونے کی بنا پر وہ ان کے دل سے زیادہ قریب تھا۔ کچھ ابامیاں نے گل کی اس خوبی کو بھی پہچان لیا تھا کہ

انداز میں کی کہ ہر کوئی عیش عیش کر اٹھا۔ اس وقت گل کی عمر نوکل چھ ماہ تھی، رات کو جاگ کر اسے بہلانا، دودھ تیار کر کے دینا اور اس ننھے بچے کی خدمت فاطمہ کا نصب العین بن گیا۔ وقت اس طرح چپکا کہ احساس تک نہ ہوا۔

یوں تو فاطمہ کو الیاس اور عباس سے بھی بہت محبت تھی۔ مگر گل تو اس کی جان بن کر رہ گیا تھا۔ نام تو اس کا کچھ اور ہی تھا مگر فاطمہ نے پیار ہی پیار میں جو ”گل“ کہا تو پس چہار جانب ”گل“ کا ہی ڈنکا بجنے لگا۔ اور یوں اس کا صحیح نام کسی کو بھی یاد نہ رہا۔ یہ تینوں بچے پھوپھو کو عزیز از جان رکھتے تھے۔ پھوپھی کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی ان تینوں کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ان بچوں کو فاطمہ سے، محبت سے زیادہ عقیدت اور عقیدت سے زیادہ محبت تھی۔ لوگ باگ پھوپھی بھتیجیوں کی محبت اور خلوص پر رشک کرتے۔

وقت کا پیچھی اپنے بچوں میں لمحوں کی ڈور تھامے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ بچے جوان ہوتے گئے۔

معمول سے وقفے کے ساتھ ابامیاں اور فاطمہ کے والدین راضی ملک عدم ہو گئے۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ فاطمہ نے بڑے بھتیجیوں عباس اور الیاس کی شادیاں اپنی پسند اور سمجھ کے مطابق اپنے کنبے میں ہی کر لیں۔ دونوں بہوئیں اسی گاؤں میں ان کے اپنے نزدیکی رشتے دار بھی ہیں۔

الیاس اور عباس ابامیاں سمیت، کسی نے فاطمہ کی مخالفت کی نہ جت۔ انتہائی خوش اسلوبی اور راضی بہ رضا یہ شادیاں انجام پائیں۔ چند سالوں میں کئی پیارے پیارے بچوں کا اضافہ ہوا اور یوں ابامیاں کے صحن گلشن میں رونق اور گہما گہمی اتر آئی چہل پہل اور شور و غوغا ہونے لگا۔

گل کی مٹکی بھی فاطمہ نے اپنی حسبِ پسند کر لی تھی۔ گل کی مٹکیتر اسی گاؤں میں

وہ ہر عادت اور طور طریقے میں خود انہی کی مثال تھے۔

وہی دیہاتی رسم و رواج اور قاعدوں سے دور بھاگتا۔

طبیعت میں رچی بسی وہی نفاست، آزادوی اور صاف گوئی و حق پرستی، جو ابامیاں کے مزاج کا خاصہ تھی، گل کے اندر بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

بعض اوقات تو ابامیاں کہ وہ بالکل بھو بہو اپنا عکس معلوم ہوتے، تعلیم سے رغبت اور دلچسپی کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے گل کا ذہنی رجحان تعلیم کی طرف دیکھا تو پوری پوری اس کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ ہر ممکن طریقے سے ان کے اس رجحان اور شوق کو مزید لگن اور چمک بہم پہنچائی۔ گاؤں سے اپنے پاس لا کر رکھا۔ ان کی ضروریات اور ذمہ داری صحیح معنوں میں ایک باپ کی حیثیت سے بہت عمدہ اور احسن طریقے سے سرانجام پہنچاتے رہے ابتدائی جماعتوں سے ہی ٹیوٹر مہیا کیے اور بیٹے کی ذہانت اور قابلیت کو جلا بخشی۔

اور پھر وہی ہونہار اور لائق فائق گل تھے جو سہارن پور کے بہترین لاء کالج میں وکالت پڑھ رہے تھے، یہ ان کا پہلا سال تھا وکالت کا۔

تعلیم میں پوری طرح مستغرق و مہمک ہو جانے کی غرض سے ابامیاں نے انہیں کالج کے ہوٹل میں داخل کروا دیا تھا کہ کسی صورت بھی ان کی دل شکنی اور نہ تعلیمی حرج ہو سکے۔

تین ماہ قبل جب ایک دوست کی وساطت سے ابامیاں کا تہ نہ بیگم سے رشتہ طے ہوا، گل ہر کام میں پیش پیش تھے، انہوں نے ہر طرح سے باپ کا ساتھ دیا۔ اپنے ایک کلاس فیلو کی بہنوں کے ذریعے زنانہ چیزوں، لباسوں اور نکاح کے سامان وغیرہ کی خریداری کی اور خود بھاگ دوڑ کر کے زیورات بنوائے، نکاح میں بھی وہ برابر کے شریک رہے۔ اور بیٹے کے بجائے دوست اور مخلص ساتھی کی طرح ہر کام خوش اسلوبی

سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

بعد ازاں گاؤں میں اس نکاح کی اطلاع بھی انہی کی زبانی پہنچی۔ اس خبر سے یہاں جو شور و غلغلہ اٹھا جیسی جیسی چہ میگوئیاں اور بے بات کی افواہیں اڑائیں اس سے قطع نظر گل نے ذاتی طور پر اپنی زبان سے نہ بڑھا چڑھا کر یہ معاملہ پیش کیا اور نہ اچھائی برائی گزرائی۔ نہ ہی انہوں نے باپ کے اس نکاح کی مخالفت کی تھی۔ مخالفت تو عباس اور الہاس نے بھی نہیں کی تھی مگر چند ایک بار اپنی بیویوں کے آکسانے پر احتجاج ضرور کیا تھا، جو بعد کو ابامیاں نے حکمت عملی اور اپنی فطری بے باکی سے کام لے کر خود ہی دبا دیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں اپنے اصرار کی وضاحت کر دی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں سب کی زبان بند کر دی تھی۔



شام کو کالت تھا۔

بلکی بلکی مدھ بھری ہوا چل رہی تھی۔

لیٹوں کے بیڑ میں بہت ساری چڑیاں ایک ساتھ چچہا رہی تھیں۔

مہندی کے پودوں میں سے دھیمی دھیمی دالوز مہک چاروں طرف پھیلنے لگی۔

نامتہ بیگم آگن میں تخت پر اطمینان سے بیٹھی پان چہار ہی تھیں۔ پشت نرم نرم روی کے ٹکڑوں سے نکار کھی تھی۔ سامنے یہ بڑا ساقلمی دار سہارن پوری باندان کھلا رکھا تھا۔ تھالی ہرے ہرے تازہ پانوں سے بھری تھی۔ ان کی بڑی بیٹی مشکبار دوسرے چنگ پر دونوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ چھوٹا لالٹیکے پر سر رکھے بے خبر لیٹا سو رہا تھا۔

دوسرے تخت پر فاطمہ پھوپھو جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

نامتہ بیگم کے سامنے محنت سے قدرے اونچے چوترے پر دو چولے ساتھ ساتھ

بنے تھے۔ چکنی مٹی سے لپے پتے چولہے چھوٹی سی دیوار، برتن اور باورچی خانے کا سامان رکھنے کے طاق سب کے سب آئینے کی طرح چمک رہے تھے۔ چولہوں میں بڑی بڑی لکڑیاں جل رہی تھیں۔

ایک چولہے پر سیکہ بھابی مرغی کا گوشت پکانے کی تیاری کر رہی تھیں اور دوسرے پر ریسہ جلدی جلدی چاول بھجار رہی تھی۔ قریب ہی بڑی سی لگن میں آٹا گندھار کھاتا۔

گاؤں میں ابامیاں کے قیام کے دوران یوں تو ہمیشہ سے کھانے وغیرہ میں خاص اہتمام برتا جاتا تھا۔ ہر شام ایک دوسرے ضروری ذبح ہوتے اور پھر گل کے شکار کئے ہوئے شیر، تکیہ اور مرغائیاں الگ بھینٹیں، کیونکہ ابامیاں کی صورت دیکھتے ہی گل اپنی شکاری بندوق لے کر کیتوتوں، باغوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں انہیں ابامیاں کی پسند ناپسند کا بہت خیال رہتا تھا۔

مگر جب سے ابامیاں کے ساتھ نانہہ بیگم بھی شریف لائی تھیں گھر کی دونوں بہوئیں بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ گل کی زبانی ان کی نفاست اور سلیقہ مندی کے قصے سن سن کر دل میں مرعوب ہو گئی تھیں۔

اس وقت بھی سیکہ بھابی نے اپنے حسابوں بے حد نفاست اور شکھڑاپے سے گوشت کو خوب اچھی طرح دھویا۔ اور چولہے پر چڑھی دپیچی میں کڑکڑاتے ہوئے سگی کے اندر خوب بہت سی کٹی ہوئی پیاز بچھم سے ڈال دی۔ نانہہ بیگم یہ سب منظر بغور دیکھتی ہوئی مشاہدہ کر رہی تھیں۔

جیسے ہی سیکہ بھابی نے چاہا کہ گوشت بھی اس پیازہ میں ڈال دیں، غرارہ سنبھالتی ہوئی نانہہ بیگم تیل کی طرح جھپٹا مار کر ان کے سر پر جا پینچیں اور زور سے ڈانٹا۔

”ہائیں..... ہائیں..... یہ کیا کرتی ہو؟“

سیکہ بھابی کے ہاتھوں میں لگن لرزے لگی اور وہ گھبرا کر ان کی صورت دیکھنے لگیں۔ چاول بھجارتی ریسہ بھی حیران و پریشان ہو کر ادھر متوجہ ہو گئی۔

نانہہ بیگم کسی کی پروا کئے بغیر عجب دار لہجے میں بولیں۔ ”یہ مرغی بھکانے کا کیا طریقہ ہے؟ پیاز گلابی کی نہ گرم مصالحہ ڈالو اور بونیاں ہٹائیں میں ڈالنے چلی تھیں؟“ ”ہم تو سدا ہی اس طرح پکاتے ہیں۔“ سیکہ بھابی جواب قدرے سنبھل چکی تھیں، سادگی سے بولیں۔

”اسی لئے تو تمہارے ہاں سالن میں لذت نہیں ہے۔ جب تک بونیوں کی بساندھ نہ جائے گی، کھانے میں خاک لطف آئے گا!“

یہ کہتے کہتے انہوں نے پیچھے میز صحنی کر کے پیاز چھ سے نکال لی اور سگی کڑکا کر اس میں کھڑا گرم مصالحہ ڈال دیا اور سارا گوشت دھیمی سی آچ پر حل کر ایک صاف برتن میں دوبارہ نکال لیا اور باقی بچے ہوئے گرم سگی میں مہین پڑے ہوئے تمام مصالحے ڈال کر بھوننے لگیں۔

سیکہ بھابی بے چاری تھیں ہی ہو کر ایک طرف جا بیٹھی تھیں۔ تخت پر بیٹھی دیکھ تو فاطمہ پھوپھو سب کچھ رہی تھیں، مگر اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں بولیں۔

ر ریسہ بھی چپ چاپ گردن جھکائے چاول پکاتی رہی۔ اس روز کے بعد سے کھانا پکانے کی ذمہ داری خود بخود نانہہ نے اپنے سر لے لی۔ ادھر شام ہوئی اور وہ چان کھلے میں دابے۔ غرارہ سنبھالتی چولہے کے پاس پہنچیں۔

ان دنوں گل کی ذمہ داریوں میں ایک دم نئی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ خوش خوش ہر کام سر انجام دیتے۔ ان کا ایک حیرانہ تو دوسرا باہر، ابھی پھلکی کے شکار پر گئے ہیں تو شام کو پرندوں کا شکار ہو رہا ہے۔ باغوں سے آم اور چائین کے تازہ جھوے تڑا تڑا

’نر لارہے ہیں۔ گاؤں سے شہر تک کے پھیرے تو ہر دن بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہوتے۔ ہر روز تازہ بہ تازہ پان اور نانہ بیگم کی فرمائش چیزیں لانی ضروری ہوتیں کہ یہ نہ صرف نانہ بیگم کی فرمائش ہوتی بلکہ ان پھیروں میں امایاں کا حکم بھی شامل ہوتا ہے۔ مگر محل میاں کی پیشانی پر معمولی ترین بل تک نہ آتا۔ انتہائی خندہ پیشانی سے سہا کام کرتے۔ گرمی کی شدت تک کا احساس جا تا رہتا۔

ادھر سیکنہ بھابی اور ریسہ جو لہے چوکے سے توجہ دہی و ستبر دار ہو گئی تھیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کی جان دوسری نوعیت کے عذاب میں آگئی تھی۔ ہر طرح کے اپنے دل پسند کھانے تیار کرتے، پکانے اور بھجانے کی ذمہ داری تو واقعی از خود نانہ بیگم نے اپنے سر لے لی تھی، مگر ان دونوں کے ساتھ سلوک وہی شروع ہو گیا تھا جو بقول گل سہارن پور میں وہ اپنی بیٹی مشکبار سے کرتی تھیں۔ یعنی وہی اوپر کا سارا کام ان دونوں سے لینا اور پکانا ریند حنا خود۔

نت نئے مصالحے پیٹے پیٹے اور ہر کھانے کی علیحدہ تیاری کرتے کرتے سیکنہ بھابی اور ریسہ کا نام ہی دم آجاتا مگر امایاں کے ڈر سے ایک لفظ بول سکتیں۔ نہ نانہ بیگم کو جواب دے سکتی تھیں۔

باقی رہیں خود نانہ بیگم۔۔۔ تو انہیں بھلا کسی کے بگڑنے یا بوسرنے کی پرواہی کب تھی! وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ وہ فطری طور پر حاکمانہ مزاج لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ اپنی من مانی کرنا اور حکم مورتا ان کی سرشت میں شامل تھا، اس کو کیا کہا جاتا کہ ان کی فطرت ہی اس نوعیت کی تھی!

اس عادت کے علاوہ بھی ان میں کئی ایک عادات ایسی تھیں جو یہاں دیہات کے ماحول میں رہنے والوں کے لئے باعث حیرت بن جاتیں۔ مگر نانہ بیگم کبھی کسی کی حیرت اور فکر مندی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ وہی چوبیس گھنٹے سولہ سنگھار کئے رکھنا، ہونٹوں پر مسی اور پان کی دھڑی بھانے رکھنا، اچھے سے اچھے لباس زیب تن کرنا، گاؤں کی فضا، ان شہری لوازمات سے پاک ہونے کے باوجود اپنے لئے سازگار سمجھتی تھیں اور ہر روز نئی ساریاں باندھنا یہاں بھی ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ بالوں اور کلاؤں میں موتیاں گھمے جھکے رہتے۔ جس طرح وہ گھر کی عورتوں سے فری تھیں۔ اسی طرح آنے جانے والے رشتے دار مردوں سے بھی آزادانہ گھل کر ملتیں اور گھنٹوں باتیں کرتیں بلکہ دعوتیں تک کر ڈالتیں۔

گھر اور کنبے کی عورتیں آپس میں کسر پھر کر تیں مگر یہ سرگوشیاں نانہ بیگم قطعی طور پر نظر انداز کر دیتیں۔ کنبے کی چند عورتیں جہاں بھی مل بیٹھتیں، ان کا دل پسند موضوع گفتگو یہی ہوتیں۔ دیہاتوں میں یوں بھی کوئی ایک موضوع دونوں لوگوں کی ذہن دہان رہتا ہے۔ پھر یہاں تو خاصا انہی کے گھر کی بات تھی۔

ہو تا ہو ایسا ہوا کہ عورتوں کی کسی محفل میں کسی زیادہ ذہین خاتون یا لڑکی نے نانہ بیگم کو ”کھنڈوالی“ کا خطاب بھی دے ڈالا۔ اور یہ دلچسپ خطاب کچھ ایسا مقبول و ہر دلعزیز ہوا کہ عورتوں نے انہیں ”کھنڈوالی“ ہی کہنا شروع کر دیا۔ دیر سے دیر سے یہ نام عورتوں کے حلقے سے نکل کر مردوں تک پہنچا۔ اور پھر کچھ بزرگوں نے بھی یہ نام پسند کر لیا اور نانہ بیگم کو ”کھنڈوالی“ کہنے لگے۔ یوں یہ خطاب اس کنبے میں خاصا مقبول ہو گیا۔

حقیقت یہی ہے، نانہ بیگم اپنے فطری رجحان کے ہاتھوں بے بس تھیں۔ اچھا کھانے کے شوقین تو بہت ہوتے ہیں مگر اچھے سے اچھا کچر کچر کرنے کے شوقین قدرے کم ہی ہوتے ہیں۔ یہی عادت نانہ بیگم کی تھی۔ وہ کھانے میں کسی طرح کی

”گل.....!“ انہوں نے چھالیہ کترتے ہوئے حکمیہ انداز میں اعلان کیا۔ ”آج اور..... اسی وقت اپنے آرم آف جاسن کے سب سے بڑے باغ میں جھولے ڈھلاؤ۔ سائون کا مینہ شروع ہو چکا۔ ہم وہیں کڑا بھی چڑھوا گئیں اور جھولہ جھولیں

گھر کے اندر تاثر بیگم کی مصروفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے سب سے اول کام یہ کیا کہ بڑی کرہائی چوبے پر رکھوا دی اور دودھ دھانی دوپٹہ اوڑھ کر پاس آ بیٹھیں اور پھر جو برساتی کپکان کی میٹھی میٹھی خوشبو کرہائی سے نکل کر ہر طرف پھیلی

گے۔ سارا انتظام دوپہر سے پہلے پہلے کر وادو۔ ہمارے ساتھ اور بھی رشتے دار عورتیں لڑکیاں ہوں گی۔“

”جی!!“

گل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ ان کے فرشتوں کو بھی یقین نہ تھا کہ نامہ بیگم اس حد تک آزاد اور خود مختار اندہ رویہ اختیار کر لیں گی اور وہ بھی ان کے گاؤں جیسے پس ماندہ ماحول میں! یہاں کی عورتیں تو یوں کھلے بندوں باغ باغوں میں چاکر کھیل کود کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

انہوں نے پریشانی کے عالم میں پہلو بدلا اور ڈرتے ڈرتے پکلا کر کہنے لگے، ”ای جان..... باغ میں جھولا؟“

”اے ولاہ رے لوٹو اے!“ وہ دفعۂ تیز بدل کر اور بگڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”میں نے کوئی فاری بولی جو تمہاری سمجھ میں نہ آئی؟ باغ میں جھولے ڈولانے کو تو کہا ہے۔ تمہارے ہاں کے جانے کیا وادو نہ سیدھے دستور ہیں کہ سادون آگیا اور کسی کو خبر ہی نہیں ہے۔ اے کیا یہ موسم چپ کا موسم ہے جو ہر کسی کو سانپ سو گئے ہوئے ہے۔ اے ہاں! نہ کرٹھائیاں چڑھ رہی ہیں نہ سادون گائے جا رہے ہیں نہ لڑکیاں بالیاں چڑیاں رنگ رہی ہیں اب ایسی بھی کیا بے حسی!“

گل چپ چاپ گردن جھکائے ان کی لعن طعن سنتے رہے۔

وہ آج ایسے زور زور سے بول رہی تھیں کہ قاطعہ پھو پھو بھی اٹھ کر قریب آگئیں۔ رئیسہ اور بھابھی سیکند بھی اپنے اپنے کام ادھورے چھوڑ کر آکھڑی ہو گئیں۔

نامہ بیگم کے پر جلال لہجے نے سب کو دنگ کر دیا تھا۔

لیکن قاطعہ پھو پھو نے نہ رہا گیا۔ وہ نامہ بیگم کا یہ نیا مطالبہ اور ساری مفلکوں سن چکی تھیں دھیرے سے چنگ پر بیٹھ گئیں اور نامہ بیگم کا ہاتھ تمام کر ملاعت سے کہنے لگیں۔

”گاؤں اور شہر کے طور طریقے میں بڑا فرق ہوتا ہے، گل کی جھجک کی وجہ یہی ہے کہ یہاں کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ باغوں میں جھولے ڈالے جائیں، ہاں تم کو شوق ہے بو بسم اللہ۔ گھر میں یہ بڑی سی چھتیاور نیم کھڑی ہے۔ لو میں ابھی کسی مزارع سے کہہ کر جھولا ڈولائے دیتی ہوں۔ جتنا چاہے جھولو۔ سادون مناؤ۔ اور اس کے علاوہ جیسا بھی چاہو انتظام کر وادایا جائے گا۔۔۔۔۔“

نامہ بیگم جل جھن کر کھاتو ہو گئیں۔ یہ نئی جو بزن کران کی ایڑی سے لگی تو چوٹی تک پہنچی۔ غصے سے تھلا کر بولیں۔ ”نہیں چاہئے مجھے آپ کا کوئی بھی انتظام، گل! اپنے باوا کو اندر بھیجو۔ میں خود ان سے بات کروں گی۔ لو بھلا اندر ہو گیا۔ یعنی ہم سادون ہی نہ منائیں۔ بھٹاڑ میں گئیں یہاں کی ریتیں رسمیں..... ایسی کیا لوٹ پڑی ہے کہ چہار دیواری سے باہر نہ نکلے۔ بلاؤ ان کو میں ذرا پوچھوں کہ یہاں گاؤں میں کیوں لا ڈالا ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے سر دھتھائی میں پچھا اور مارے طیش کے ططناتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔



یہاں سب ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہ گئے۔

نامہ بیگم کے مزاج کا یہ پہلو آج سب نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

سب میں زیادہ تشویش قاطعہ پھو پھو کو تھی۔ وہ اک ذرا اس بات کہہ کر چور ہو گئی تھیں۔ اور اب بچھتا رہی تھیں کہ ناحق مجھڑ کے چھتے میں ہاتھ دیا۔

مگر ان کا کہنا بھی اپنے مقام پر بہتر تھا۔ وہ اس گھر کی بڑی تھیں۔ اس لئے ہر اچھی بری بات کو نگاہ میں رکھنا ان کا فرض تھا۔ چنانچہ یہی سوچ کر انہوں نے ابا میاں کو اندر بلوایا۔

تھوڑی دیر بعد ابا میاں کھڑکارتے آئے۔ نامہ بیگم اب تک اپنے کمرے میں

باغ میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے تلمن کے اس سامان کا جائزہ لیا جو ابامیاں نے ان کے آرڈر پر پہنچوایا تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ جھولوں کے پاس آئیں۔

فاطمہ پھوپھو چوکی پر گم گم بیٹھی رہ گئیں ان کے فرشتوں کو بھی اب سے پہلے لگان نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے اپنے بھائی میاں بھی اس طرح گاؤں کے ماحول کو نظر انداز

یالی فضاؤں کی قسمت جاگ تھی کہ آج یہاں کی ہواؤں میں نسوانی قہقہے، شوخ مسکرائیں اور الہزم معصوم جوانیاں ہنس کھیل رہی تھیں۔ اس باغ میں صرف قلمی و تھمی آموں اور بلند و بالا جامن کے بیڑوں کے سوا کہیں بس چند ایک چنکو کے درخت دکھائی دیتے تھے۔ گھاس کے شبنم آلود تختوں پر جگہ جگہ نیچے ہوئے پیلے پیلے آم اور جامن چھپے ہوئے تھے۔ چھوٹے بچوں کی آج عید ہو گئی تھی۔ پھلوں کے تعاقب میں، بارش کے خفاف قطروں سے بے نیاز ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے پھر رہے تھے۔

کچھ دیر تک مسلسل جھولنے رہنے کے بعد نامہ بیگم نے اپنے بے ساختہ قسم کے قہقہوں میں بریک اور گھاس پر اپنے نازک نازک پاؤں کا کرسمب کو مخاطب کیا۔

”چلو اب ساون بھی تو گواڑا۔ یا خانی خونی جھولے ہی جاؤ گی۔“

ساری عورتیں ایک دوسرے کی صورت نکلتے لگیں۔

ایسا نہ تھا کہ ان میں سے کسی سے گانا آتا ہو۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس حسین اجتماع میں بہت سی تو ایسی تھیں کہ جن کے دم قدم سے شادی بیاہ کی محفلیں جستی تھیں اور ایسی میٹھی و سلی آوازیں کہ بس سنا کیجئے۔

مگر آج تو گواڑے تو بے سب کو شرم آنے لگی۔

لیکن پھر نامہ بیگم کے اصرار پر چند زیادہ عمر کی خواتین نے اپنی طرز کے ساون نکالے۔ ایک ان کی سن رسیدہ آوازیں۔ دوسرے درمیان میں بار بار جھول کی وجہ سے تسلسل پر قرار نہ رہنے سے شوخ و شیرازیوں کی مخصوص بازی اور بلند بانگ قہقہے۔ جلد ہی یہ سلسلہ رگ گیا۔

نامہ بیگم کو بھی آ رہی تھی۔ تبھی بھائی کینہ نے انہیں مہو کا دیا۔

”آپ کچھ گاوڑیجئے نا! بڑا مزہ آئے گا۔“

جی تو ان کا بھی چل رہا تھا مگر اصرار کروا کے گانے لار محفل لوٹنے کی ہمیش سے

بھائی کینہ ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ جامن کے تین بڑے بڑے تاور اور گھنے درختوں سے مضبوط جھولے بندھے ہوئے تھے۔

جھولے کا آغاز سب سے پہلے نامہ بیگم نے ہی کیا اور کینہ بھائی نے پیٹنگیں بڑھانی شروع کیں۔ دوسری عورتیں پہلے پہل جھجکیں۔ کوئی بھی آگے بڑھ کر جھولے پر نہیں بیٹھ رہی تھی۔ مگر جب نامہ بیگم اپنے جھولے کی طرف متوجہ ہو گئیں اور کھل کھل کر ہنسنے ہوئے پیٹنگوں کا لطف اٹھانے لگیں تو ان کی دیکھا دیکھی دوسریوں کی بھی جھجک دور ہوئی ایک آدھ مچلی بڑھ کر جھولے پر بیٹھ گئی۔ کسی نے پیٹنگیں دینی شروع کر دیں اور یوں ڈرامی دریں میں ایک خوشگوار سا بنگامہ بچ گیا۔ ایک دوسری سے اونچا جھولنے کی حرص میں پیٹنگیں اونچی سے اونچی جانے لگیں۔ ہر ہر جھولے کی طرف سے ”اونچا۔ اور اونچا۔۔۔۔۔ اور زور سے۔۔۔۔۔“ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے نرم نرم قہقہے۔ شوخ قلمی باغ کی فضا میں آپ سے آپ گھٹناتے لگیں۔ ساون کی روم جھم میں یہ رنکھیں اور سنگین لمحات یادگار اور حسین ترین گھڑیاں بن گئیں۔ پیوار مسلسل برس رہی تھی۔ برساتی خوشگوار اور فرناک جھونکے جسم و جان سے ٹکرا ٹکرا کر نئی نئی ٹوٹائی کا احساس دلانے لگے۔ درختوں پر کوئلے لنگ ”کو کو“ کا شور مچا رکھا تھا۔ آج ابامیاں کے گاؤں میں اس دھوم اور اہتمام سے ساون منایا جا رہا تھا کہ آج تک یہ نہ منایا گیا ہو گا۔ روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر اس جدت اور بنگامے پر سبھی عورتوں کا دل باغ باغ ہو رہا تھا اور حسین روت کا لطف اٹھانے کے لئے سبھی ناتمہ بیگم کی ممنون تھیں۔

چکوانوں کی میٹھی میٹھی خوشبو، آموں کی مہک، موٹی موٹی کالی سیاہ جامنوں کو بو چھٹا اور نیا مپ رستی برسات کی ٹھنڈی ٹھارہ بوندوں کا جلتنگ۔۔۔ ابامیاں کے بڑے دوا کے ہاتھوں کا سیٹھا ہوا یہ برسوں پرانا طویل و عریض باغ۔ ایک مدت کے بعد ان :

عدی تھیں۔ مگر اس وقت اس فکر میں بھی مبتلا تھیں کہ اس وقت کی محفل اور ماحول کے مطابق ہی کوئی ساون اٹھائیں تاکہ ہر کسی کی سمجھ میں بھی آ سکے۔

یوں تو ان کو بیسیوں ساون یاد تھے۔ مگر باکیا ذہن تھیں۔ موقع محل کے لحاظ سے کوئی سوزوں اور جی کو لگنے والی چیز گانا چاہ رہی تھیں۔

چند منٹ سوچے اور یاد کرنے کے بعد انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر ان کی مہین اور سریلی آواز کو کل کے ساتھ سر ملائے گی۔

”کئی نیم کی نمکولی۔۔۔ ساون جب بھی آئے گا،

جئے میری ماں کا جلیا۔۔۔ ڈولی بھیجے گا۔“

جیتی پکارتی فصائیں نکلتی دم بخود ہو گئیں۔

شوخ و شریر لڑکیوں کے قہقہے آن واحد میں دم توڑ گئے۔

ایک ان کی سریلی آواز کا قدرتی سوز، گداز، جی کو چھو لینے والا لہجہ، موسم اور رزم برستی ہو چھا روں کا تقاضہ اور اوپر سے سادہ دیہاتی عورتوں کی محفل۔۔۔

کسی کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

کیکے بعد دیگرے بہت سی عورتوں نے اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

اور جب تک نائنہ بیگم نے اپنی پر سوز آواز میں اس دلسوز ساون کا آخری بند مکمل

کیا چند عورتوں نے چپکوں پہنکوں آنسو بہا ڈالے۔

ہر کوئی ان کی آواز اور آواز کے ساتھ شاعری کے الفاظ سے متاثر تھا۔

انہی۔۔۔ جذباتی لمحات میں۔۔۔

ان سب سے دور۔۔۔ جاسن کے ایک گھنے بیڑ کے نیچے بری بری گھاس پر بیٹھی

شکبار کی بڑی بڑی کوراسی آنکھیں آپ سے آپ بھر آتی تھیں۔

نضاد لٹاداس کی گود میں بیٹھا ایک آدم کی جھٹکی چوس رہا تھا۔

اس سے بڑا بھائی شمشاد بہت دیر تک کھیلنے کو دینے کے بعد اس کے نزدیک کی گھاس پر لیٹ کر سو گیا تھا۔

”جئے میری ماں کا جلیا۔۔۔ ڈولی بھیجے گا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کا دکھ بواول بھر آیا تھا۔

شمشاد اور دلشاد بھی اس کے ماں جاے تھے۔۔۔ مگر کس قطار شمار میں!

گو کہ ابھی وہ چھوٹی تھی۔ میکے اور سسرال کے فرق سے نا آشنا!!

مگر ماں کے گائے ہوئے ساون کے بولوں نے اس کے دل میں جیسے انگارے بھر

دیے۔ غمناک برساتی جھونکوں سے آگ کی پلٹیں سی اٹھنے لگیں۔ دل و دماغ کی ننھی

سی کائنات ایسے جھٹکے سے روشناس ہوئی کہ اس نے بے اختیار اپنے رخسار ننھے اور نا

کجھ بھائی کے گیلے گیلے رخساروں پر نکا دیئے اور بے اختیار رونے لگی۔

ابھی وہ دنیا اور دنیا کے نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوئی تھی۔ ساون

کی رزم جہم میں سیکے کی یاد، پھرنے، ملنے اور جدائیوں کے تضاد اور انقلابات سے نا آشنا

تھی۔۔۔ مگر باپ کے اچانک پھڑ جانے اور شفقت پدری کے ساتھ ماں کے حقیقی پیدا

اور متناک دگداز لمس کے کھو جانے نے اسے بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا اور اس ذرا سی

عمر میں ہی اسے سوچنے رہنے اور تارکیوں میں جھانکنے کا عادی بنا دیا تھا۔ دھیرے

دھیرے تنہائی اور دکھ کا شدید احساس اس کے رگ و پے میں زہری طرح سرایت کرتا

جا رہا تھا اور وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ خود کو دنیا میں اکلی سمجھنے لگی تھی۔

آج ان لمحات میں، جبکہ اس کی آنکھوں سے پلٹتے آنسو پونچھے والا کوئی نہ تھا، اس

کے سامنے پچھڑے ہوئے ماہِ سال آن کھڑے ہوئے۔

وہ معصوم اور یادگار لمحے۔۔۔ جب قدم قدم پر محبت کرنے اور چاہتیں اٹانے

والے باپ کا ساتھ میسر تھا۔ جس کے لئے انہی بچوں کی آنکھ سے نکلا ایک آنسو

بھی، جگر کا سوراخ بن چایا کر تھا۔ جس نے دنیا کی ہر نعمت مہیا کر رکھی تھی۔

”کاش! اے کاش! وہ سہانے دن واپس لوٹ آئیں!“

اس کے خشک ہونٹوں سے یہ آرزو ایک سسکی بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو گئی اور مشکبار بھائی کو گود میں سینے سینے، دیکھن کی خوشگوار اور امنٹ یادوں میں کھوئی کھوئی نیند کی واد یوں میں اتر گئی۔

کچھ دیر کے لئے دنیا اور دنیا کے انقلابات سے بے خبر ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو کوئی اسے مسلسل جیر کی شوکر سے جگائے جا رہا تھا۔

اس نے نیند کے غمار سے جو بھل اور بندہ آکھیں کھول کر بمشکل سمجھنے کی کوشش کی۔

نامہ بیگم غیظ و غضب میں پھنسا کر یں مارتی ہوئی اسے خشکیوں لگا ہوں سے گھوری تھیں۔ اور جانے کیا کیا کہے جا رہی تھیں۔

مشکبار نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے چاروں طرف عورتیں لڑکیاں حلقہ باندھے کھڑی تھیں۔ اور نامہ بیگم پوچھ رہی تھیں۔

”بول نکئی۔۔۔ خراف۔۔۔ شمشاد کو کہاں بھیج دیا۔ کدھر گیا وہ؟ اگر تو نے اسے کھود دیا تو آج تیری ہڈیاں پھیل چکیں گی۔“

اتنا کہتے کہتے انہوں نے اسے ہانوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور پیڑ سے سے ٹکل کر کھلے میں لا پٹھا۔

مشکبار کے سوتے سوتے ذہن میں اب تک معاملے کی نوعیت نہیں آئی تھی۔ اس نوچا کھسوٹی میں دلشاد اس کی گود سے پھسل کر گھاس پر جا گرا تھا اور اب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کوئی عورت اسے اٹھا کر خاموش کروانے اور چکارے لگتی۔

نامہ بیگم کمر پر دونوں ہاتھ رکھے تھنیداروں کی طرح کھڑی اور بلند آواز میں کہہ

رہی تھیں۔ ”خود تو مہارانی جی یہاں اینڈی رہیں آرام فرماتی رہیں اور میرے بچے کا کچھ دھیان ہی نہیں۔۔۔ کیا اس لئے میں تجھے ساتھ لائی تھی۔ کہ تو بچوں کا ڈھنگ سے خیال بھی نہ کر سکے! اتنے ہی تیرے زندگی پر بے حیا لڑکی! جسے اپنے بھائیوں کے کھو جانے اور گم جانے کا بھی قلق نہیں۔ جادور ہو جا میری نظروں سے۔“ انہوں نے ہکا بکا کھڑی مشکبار کو زور سے دھکا دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دھڑام سے گھاس میں جا گری۔

اتنی ہی دیر میں ماں نے اسے دھک کر رکھ دیا تھا۔ مگر غصہ اب تک نہیں اترتا تھا۔ آگے بڑھ کر پھر اسے جھکا دے کر کھڑا کر لیا اور بجلی کی طرح کڑکیں۔

”یاد رکھ نموس! میرے بچے کو نصب دشمنان کچھ ہو گیا ہونہ ملا تو تیری بوئیاں ضرور چیل کوڑں کو کھلا ڈالوں گی۔۔۔ بول! کہیں لڑکی! تو نے میرا بچہ چھپایا کہاں ہے؟ اسے بھی نگل گئی نا گن!“

اس کے رخساروں پر تراڑتہ تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے وہ جنون کے عالم میں بولے چلی جا رہی تھیں۔

سب عورتیں کستے کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کسی کو اتنا خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی کو ان کے چنگل سے رہائی دلائیں۔

دفعۃً باغ کے ایک گوشے سے گل بھگتے ہوئے نمودار ہوئے اور ماں بیٹی کے درمیان حائل ہو کر پھولی ہوئی ناسوں سے پوچھنے لگے۔

”کیا ہو گیا۔۔۔ کیا بات ہے اہی جان! مشکبار سے کیا خطا ہو گئی۔۔۔! کچھ مجھے بھی تو بتائیے! آخر قہر کیا ہے؟“

نامہ بیگم نے غصے سے جلتی ہوئی نگاہیں گل پر گاڑ دیں اور سرد آواز میں بولیں۔

”ہوتا کیا؟ پڑ کر دوپہر بھر اینڈی رہیں صاحبزادی اور شمشاد کو جانے کہاں کھو دیا۔ باغ کا

گوشہ گوشہ چھان مارا ہے، ہر کونے میں ڈھونڈ لی مگر میرا بچہ خبر نہیں کہا پہنچو ادیا اس ڈائن سے۔۔۔ الگ ہٹو گل! آج میں اس ناگن کی ہڈی پہلی ایک کر دوں گی، مفت کا کھا کھا کر بہت اترا آگئی ہے حرافہ۔“

انہوں نے ایک دفعہ پھر مشکبار کے لائے لائے بالوں کی چوٹی پر ہاتھ مارا۔
”ارے۔۔۔۔۔ رے۔۔۔۔۔ کمال کرتی ہیں ای جان آپ بھی۔“ گل نے دونوں ہاتھوں سے اسے ہچاتے ہوئے ہٹوا کر کہا۔
”شمشاد تو ابھی ابھی میرے ساتھ تھا۔ میں گھر گیا تو وہ بھی چلا گیا۔ کھانا کھا کر سو گیا ہے وہیں فاطمہ پھو پھو کے پاس۔“

نائدہ بیگم کے ہاتھ ہیرا چاک ڈھیلے پڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ہانپنے لگیں۔ لیکن خیال ہے کہ رویے میں اک ذرا سی بھی لچک اگر آئی ہو۔۔۔ نہ ان کے انداز میں پشیمانی تھی۔

جبکہ مشکبار کا شرمندگی اور خجالت سے برا حال تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ زمین چھٹے اور اس میں سما جائے۔ آج اتنے افراد کے درمیان اس کا جو حشر اپنی ہی ماں کے ہاتھوں ہوا تھا، اس کی کہیں دوسری جگہ مثال ملنی ممکن نہ تھی، وہ اب تک دونوں ہاتھوں سے اوڑھنی میں چہرہ چھپائے سہمی سہمی سی گھاس پراکڑوں بیٹھی تھی۔

دیکھتے اور محسوس کرنے والے ہمدرد دیکھتے اس کی بے بسی اور مظلومیت پر رکتے جا رہے تھے۔ جن میں گل کا تو برا حال تھا۔ ان کا رحم اور مروت سے لبریز سینہ مشکبار کی مظلومیت اور یتیمی پر شق ہوا جا رہا تھا۔ مگر ظاہر ہے کسی دوسرے کی اولاد کے لئے اس وقت تسلی و تشفی کے دوا بول بھی جانے کتنے شکوک و شبہات کو جنم دے سکتے تھے۔ اس لئے وہ بھی مبر و حقل کی تصویر بنے کھڑے تھے۔
خاصی گہری شام اتر آئی تھی۔

بزرے، درختوں کی بہتات، سادوں کی جھڑی اور بادلوں کی وجہ سے شام کے گہرے پن کا احساس زیادہ ہی گہرا تھا۔ سب لوگ واپس چلنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔
گل نے آنکھوں آنکھوں میں بڑی بھانج کو اشارہ کیا، وہ ایک گہرا سانس کھینچ کر سکڑی سمٹی مشکبار کی طرف بڑھ گئیں۔

خود بھابی کیلئے کادل بھی اس کی طرف سے بری طرح کٹ رہا تھا مگر سوائے اسے خاموش ہو جانے کا کہنے کے اور کیا کر سکتی تھیں۔ وہ گھاس پر بیٹھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں تاکہ اس کے بہتے اشک خشک کر سکیں، مگر۔۔۔۔۔ رو دی کب رہی تھی۔۔۔۔۔ مارے دہشت اور خجالت کے آنکھوں کے تو جیسے سوتے ہی خشک ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ سادوں کی جھڑی میں نظر نہ آنے والی آگ لگی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

وہ بہر حال عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی۔ جہاں تک پہنچ کر عزت، توہین، ایتھے برے، تمسخر، حق اور ناحق کا احساس جاگ پڑتا ہے۔ اور مشکبار۔۔۔۔۔ وہ تو بھلا فطری طور پر انتہائی غیور طبیعت کی مالک تھی۔

کچھ دیر بعد یہ قافلہ اس پرانے آم کے باغ میں سادوں کے یادگار لمحات گزار کر دوبارہ گاؤں کے رہائشی حصے کی طرف عازم سفر ہوا۔
واپسی کے سفر میں کیلئے بھابی نے مشکبار کو اپنے قریب چکار کر بٹھالیا تھا وہ چپ چاپ دلشاد کو گود میں سینے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

چہرے کے نقش میں غم اتنی دیر لگی نہ بڑے ہمارے تھے۔ اس نے اب تک کسی کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

غیرت اور شرمندگی کے شدید احساس کے تحت رنجت ابھی تک تپتی ہی ہو رہی تھی۔ سب کی موجودگی میں بالکل غیر متوقع طور پر پیٹ جانے سے جیسے ہوش و حواس ہی قابو میں نہیں رہے تھے اور اس پر نائدہ بیگم کی قبضی کی مانند کتر چلتی زبان

کے ذہریلے تیر و نشتر۔۔۔

جیسے روح کی گہرائیوں تک میں زخم ابھر آئے تھے۔ رستے ہوئے گہرے زخم۔
مگر۔۔۔ اس نے احتجاج میں ایک الفاظ بھی زبان سے نہیں نکالا تھا۔

اگلی صبح۔

اچانک ہی ناظم بیگم نے کوچ کا ہتھارہ بجا دیا۔

سب ہی اس اچانک فیصلے پر حیران رہ گئے۔ رسمی نو۔ سے کبھی نے مزید رکنے کا
اصرار کیا، مگر ان کی ”نا“، ”ہاں“ میں نہیں تبدیل ہو سکی۔

ان کا کہنا تھا کہ جی اٹھ گیا۔۔۔ سواٹھ گیا۔

لیکن ایک حرکت انہوں نے نہایت ہی عجیب و غریب کی اور وہ یہ کہ تینوں بچوں
کو وہ سینیں گاؤں میں چھوڑ کر جا رہی تھیں اور کہا یہ تھا کہ شہر میں تو آج کل بہت زیادہ
ہی گرمی ہو گی۔ یہاں کی کھلی کھلی فضاؤں میں بچے پہلے رہیں گے۔ گرمی کی شدت
ٹوٹے ہی وہ بچوں کو واپس بلوائیں گی۔

ابامیاں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا! انہوں نے بخوشی رضامندی دے دی۔ مگر
مشکار نے سنا تو حواس باختہ ہو گئی۔ وہ وحشی ہرنی کی طرح گھبرا گھبرا کر سب کی
صور تیں بچنے لگی۔

کل والی ساری رنجش اور پشیمانی اور شکایت پس پشت ڈال کر اس نے اپنے تمام تر
حوصلوں کو آواز دی اور ماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اماں..... ہم بھی جائیں گے آپ کے ساتھ..... یہاں کس کے سہارے چھوڑے جاتی ہیں ہمیں! ہم بھی گھر جائیں گے۔“

”نہیں! تم نہیں رہو اپنے بھائیوں کے ساتھ۔“

وہ ساری کا فال درست کرتی ہوئی فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ ”وہاں سہارن پور میں کارے (بیٹے) کی وبا عام ہو رہی ہے۔ گھر گھر بچے بیمار پڑے ہیں۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“

معلوم نہیں وہ کہاں تک درست کہہ رہی تھیں، مگر بچوں کو ساتھ لے جانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

مشکبار نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ”لیکن آپ کو اوپر کے کام کی بھی تکلیف ہو جائے گی۔ ہمیں ساتھ لے چلئے۔ ہم آپ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ آپ اکیلی کہاں تک سب کام نہ پایا کریں گی۔“

اب نانمہ بیگم اس کی معصوم سی چالاکی پر زیر لب مسکرا دیں مگر پولیس اسی بے لچک اور نفوس لیجے میں۔

”وہاں دونو کرائیوں کا انتظام ہو چکا ہے۔ تم اس فکر میں دلی مت ہو۔“

کوئی ترکیب کار گرنہ ہوتے دیکھ کر مشکبار رو دی۔ ”اللہ اماں! ہمیں ساتھ لے چلئے۔ ہمارا یہاں ہر گزرتی نہ لگے گا اور پھر دلشاد بھی تو آپ کو نہ پا کر رونے لگا۔ ہم کیسے بہلائیں گے۔“

”یہ سب فضولی اور من گھڑت باتیں ہیں۔ بے سراپا اور بیکار قسم کے بہانے۔“ نبوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”دلشاد بھتا تمہارے پاس خوش اور مطمئن رہتا ہے۔ ہمارے پاس بھی نہیں رہتا۔ وہ پوری طرح تمہارا عادی ہو چکا ہے۔ بھلا رات کو سو تا تک تو تم سے چمٹ کر ہے۔“

پھر دفعۃً تیور بدل کر بولیں۔ ”یہ تم فوسے کا ہے کو بہا رہی ہو، تمہیں تمہاری سرال میں نہیں چھوڑے چاہی جو تم رو کر دکھادی ہو۔ خرد دار جو اس بے ہودگی سے روئیں! یہاں تمہیں کوئے خطرے اور اندیشے ہیں! کرمی نکلتے ہی واہیں بلوائی جاؤ گی۔“

اماں کے جھوٹے اور پھٹکارے سے زیادہ ان کی زبان سے جھڑنے والے زہریلے الفاظ کی تندی سے گھبرا کر مشکبار نے اپنی ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ لفظ ”سسرال“ سن کر آنسو پلکوں کی منڈیوں پر ہی ٹھٹھک کر منجمد ہو گئے تھے۔

پھر ان کے چلے جانے تک مشکبار نے ایک آنسو تک نہ بہنے دیا حالانکہ اس بے پروائی اور بے اعتنائی پر اس کے سبے ہوئے دل میں سینکڑوں ٹکڑ ٹوٹ گئے تھے۔

نانمہ بیگم کی سواری جب گاؤں سے روانہ ہوئی تو بارہو لوں سے پہلے سے ہی برسا چھوڑ دیا۔ جگہ جگہ سے گہرا ایلا خفاف آسمان جھانکنے لگا تھا۔ کھلی کھلی فضا میں، دھلا دھلا موسم، خوشگوار رات سب نے کرا کر انہیں الوداع کہا تھا۔ موسم پر جانا پہچانا سا نکھار آگیا تھا۔ درخت پھول، پودے، پیڑ، پتے پتے پر ساون ٹار ہو چکا تھا۔

نانمہ بیگم نے اپنے جانے سے پہلے آٹھ نوکرے قلمی آدموں اور جامنوں کے سہارن پور بھجوا دیے تھے۔ اپنے اڑوس پڑوس میں باٹنے کے لئے۔ اور اس سوغات کو پہنچانے کے لئے گل گئے تھے۔ جو کئی پہلے روانہ ہو چکے تھے۔

نانمہ بیگم اور اماں ان کے جانے کے بعد گھر کے کیے میں اسٹیشن روانہ ہوئے۔



نانمہ بیگم کے چلے جانے کے بعد ایک دم ہی گھر کے اندرونی حصے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ مشکبار کالہ بار بار بھرا چلا آ رہا تھا۔ گاؤں میں تمہارہ جانے سے زیادہ اسے ماں کے نکسور پن اور سنگدلی پر رنج تھا۔ دلی دل میں سو خیال آ رہے تھے، جو سارے تھے۔ اسی

نگلیں۔ کھانا سب نے بمشکل کھایا اور ”گہری گرمی، گرمی“ کرتے ہوئے اٹھ گئے۔

عشاء کی نماز پڑھ کر فاطمہ پھوپھو، چوکی سے فوراً ہی اٹھ گئیں اور پکھا جھلتے ہوئے بڑی بہو کو مخاطب کیا۔

”سکینہ! اگر تو آج جاں لئے لے رہی ہے۔ میرا خیال ہے سب کے لئے بڑے والاں میں پٹنگ پچھوالو۔ برآمدے میں تو بیچ پوری رات چین لیں گے نہ لینے دیں گے۔“

”ہاں پچھوپھو یہ رائے ٹھیک ہے۔“ ریسہ نے برتن دھوتے ہوئے کہا۔ ”بابر تھوڑی سی تری تو ہو گی۔“

چنانچہ مولیٰ خانے اور برآمدے کے درمیان جو بڑا سا کشادہ والاں تھا، اس میں یہاں سے وہاں تک پٹنگ پچھا کر بسر کر دیئے گئے۔

یہاں برآمدے کی نسبت قدرے خنڈک کا احساس ہو رہا تھا، گو کسی درخت کا ایک ہی تنک ہلکا نظر نہ آ رہا تھا مگر ٹھن میں کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے بہت کمی تھی۔

فاطمہ پچھوپھو نے مشکبار کے برابر میں اپنا پٹنگ ڈال دیا تھا۔ مشکبار، دلشاد کو لئے چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی دوسری چارپائی پر شمشاد، ریسہ کے بڑے لڑکے کے ساتھ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ دونوں بیچے ساتھ ہی سو تے تھے۔

بہت دیر تک یہ تینوں بڑی عورتیں اپنے اپنے پٹنگ پر لیٹی باتیں کرتیں اور بچے جنہی رہیں پھر جلدی ان پر نیند طاری ہو گئی کھیلنے شور مچاتے بیچے ایک ایک کر کے سو گئے۔ مگر مشکبار کی آنکھوں سے نیند کی پری کو سوس دور تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کے دونوں پہلو بھل اٹھے، مگر نند بارانی کو اس پر مہربان ہونا تھا نہ ہوئی۔

بیزار ہو کر وہ کھلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

آسمان اب تک بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ چاند ستاروں کا وجود تاریکی کی چادر اوڑھے اوجھ رہا تھا اور ہوا بھی ناپید تھی۔ گرمی کی وجہ سے طبیعت اور بھی الجھ رہی تھی۔

کھولا باندھی میں شام ہو گئی۔۔۔ شام ڈھل کر رات میں بدل گئی مگر اس کی بے قرار کو قرار نصیب نہ ہوا۔ بلکہ جوں جوں وقت گزر رہا تھا بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ایسا نہ تھا کہ خدا نخواستہ اس گھر کی چار دیواری میں اس کو کسی طرح کا خوف و ختہا، بلکہ یہاں تو سب کا رویہ بھی اس کے اور دلشاد و شمشاد کے ساتھ بہت مناسب اور بہتر تھا۔ حالانکہ سو تیار رشتہ تھا اور یہاں کے لوگوں سے اس کا کوئی خونی تعلق قائم نہ تھا، تاہم سکینہ بھائی، ریسہ ان کے بچوں اور فاطمہ پچھوپھو سمیت اس گزرنے والے ڈیڑ ماہ کے دوران کسی نے ان تینوں بہن بھائیوں کو ماتھے پر ہل ڈال کر بھی نہیں دیکھا تھا اور اصل اس گھر آنے کے ماحول میں شروع ہی سے خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت و عبادت اور نماز و روزے کی آمیزش رچی اور بسی ہوئی تھی۔ ہر دل میں خوف و جاگزیں تھا۔ چنانچہ ان چھوٹے چھوٹے خیم بچوں سے وہ کیوں پر خاش رکھتے!

بلکہ ماں کا ان کے ساتھ خود غرضی و بے انتہائی کا عجیب و غریب رویہ دیکھ کر چھوٹے بڑے کو ان بچوں سے غایت درجے کی ہمدردی اور انس ہو چکا تھا۔

مگر مشکبار تو اپنے ہی دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اسے بھی یہاں کسی سے گلہ شک تھا۔ اس کا دل تو اپنی ماں سے بھی زیادہ اپنے بچے کے وقت اور مخالف حالات کے خلاف شکایت سے لبریز تھا۔ جن سب نے مل کر اسے بھائیوں سمیت ٹھکانے سے ٹھکانے اور در بدر کر دیا تھا، سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے جن کے لاڈ بھیرے۔۔۔ ان کے ذمہ گھنیرے

رات گہری ہوتی ہی ہوا ایک دم بند ہو گئی۔

کہاں تو ساون برس رہا تھا اور برساتی ہوا کے جھموکے سرسراہے تھے۔ پتے میں جان پڑی ہوئی تھی اور کہاں گرمی کی شدت سے دم گھٹنے لگا۔

فضائیں ایک دم ہی جس آلود ہو گئیں۔ ایزی سے چوٹی تک پسینے کی دھاریر

سب لوگ گری گری اور جس سے بے خبر پڑے سو رہے تھے۔

مشکبار ایک دفعہ پھر لیٹے ہی لیٹے بچپن کی سہانی، دل فریب، نغزنی پگڈنڈیوں کا دکھ درد دیکھنے اور سننے کے واسطے واپس دنیا میں نہیں آتے۔ خواہ کوئی کسی کے لئے کتنا ترپ کتنا ہی ترسے کیوں نا، جانے والوں کو، پیچھے رہ جانے والوں پر رحم آتا ہے نہ ترس!

جب ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔۔۔

صبر و برداشت کی ڈور ہاتھ سے چھٹ گئی۔۔۔

تو وہ یقین پختی سرے سے بچ کر بلک بلک کر رو پڑی۔ ترپ ترپ کر آہ وزاری کرنے لگی۔ ایسی رقت اور بے جاہلی و بے قراری کے ساتھ کہ دیکھنے سننے والے کے کلیجے کٹ کٹ جائیں۔

”ابا۔۔۔ ابا۔۔۔ آپ کہاں چلے گئے۔۔۔ ہمیں اس ظالم دنیا میں بھٹکنے کو چھوڑ گئے۔ ابا! آپ تو کبھی ایسے بے رحم نہیں تھے۔۔۔ آپ کو کیا ہو گیا۔۔۔ ذرا آکر ہمارا حال تو دیکھئے! آپ نے کیا منہ موڑا، دنیا کے ہر سکون نے کنارہ کر لیا ہے، اماں بھی ہم سے بدل گئیں۔۔۔ وہ سخت گیر تو سدا کی ہیں مگر آپ کے سامنے تو ایسی نہ تھیں۔ اب تو وہ ہمیں بہت ہی حقیر اور اذنی سمجھنے لگی ہیں۔۔۔ ہائے اللہ! اب کو کیا ہو گیا ہے، اوقت کبھی ایسے ستم ڈھائے گا، ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا۔۔۔ یہ سب آپ کے بچھڑنے سے ستم ٹوٹنے ہیں ابا! ورنہ ہم سے کون سے قصور سرزد ہوئے ہیں۔۔۔ ایک آپ نے کیا ساتھ چھوڑا، ہر بعد روئے آنکھ بھیر لی ہے۔ ہم کہاں جائیں ابا! آپ کو کہاں ڈبوئیں۔۔۔ آپ کا سراغ کہاں سے ملے ابا۔۔۔ ہائے ابا۔۔۔ میرے پیارے ابا!“

وہ رات کے ان بوجھل اور بے چین لمحات میں جی کھول کر رو رہی تھی اور باپ کے سایہ عاطفت کو یاد کر رہی تھی، پکار رہی تھی۔

دل تو کل سے ہی بھر آ رہا تھا۔ آج مرے پر سو درے نا ندم جیسم کے چلے جانے نے

اس نے پلنگ سے اتر کر چپل بیروں میں ڈالی اور دبے قدموں سے چلتی ہوئی بیٹھ پپ کے قریب بیٹھ گئی اور پانی سے خوب اچھی طرح منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ بیٹھ پپ سے نکلے والا پانی بھی نیم گرم ہی تھا مگر ان جینٹوں سے چلتی ہوئی آنکھوں کا قدرے سکون کا احساس ہوا۔

کچی منڈیر پر بیٹھی وہ خاصی دیر خالی الذہنی کے عالم میں کچھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی، موشی خانے کی طرف سے کسی کسی وقت بھیڑوں کے میانے کی آوازیں آتے کے سکوت میں ابھرتی اور مدغم ہو جاتی۔

آنکھ میں کھڑی بلند وبالا نیم الفردگی سے سر جھکا کر کھڑی تھی۔ یوں پیسے نقد میں بڑھ جانے والی گھٹن سے وہ بھی ٹھاٹھو۔

لیموں کے چٹوں سے کوئی سر سر ہٹ سنائی دے رہی تھی نہ مہندی کی بازو سے پروا کے الہر جھونکے چھپڑ چھڑا کر رہے تھے۔ گھٹن اور جنس نے سب کو چپ کی چاد اوڑھا ڈالی تھی۔

مشکبار جانے کتنی دیر بے خبری کے عالم میں وہی بیٹھی رہتی کہ دفعۃً نیم کی اخذ میں چپے بھرا لینے والے کسی پرندے نے گری سے گھبرا کر زور زور سے اپنے پکا بلایے۔۔۔ رات کے بوجھل سناٹے میں یہ آواز دور دور تک پھیل گئی۔

مشکبار چونک کر جیسے بیدار ہو گئی۔

اپنے ارد گرد کا تاریک اور خاموش منظر دیکھ کر وہ خائف سی ہو گئی۔ دور کہیں کیتورا کی طرف سے کسی آواز کو کتے یا گیدڑ کی آواز جیسے پکار بن کر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چپل کھینچتی پلنگ پر آئینی اور معصوم بھائی کو کلیجے سے چٹا لیا۔



لگا ڈالے تھے۔ اس کا ننھا سادل جیسے ہر طرف سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا، رہ رہ کر نگاہوں میں باپ کی صورت گھومتی جا رہی تھی۔

نیکھت اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہو۔۔۔ اور اپنی نرم نرم انگلیوں سے اس کے اچھے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنے لگا ہو۔۔۔ کُردن اٹھا کر دیکھا۔

اس کے ابا سر ہانے کی طرف کھڑے ہوئے اسے ٹکڑ ٹکڑ دیکھے بارہ تھے۔ حسرت ویاس کی تصویر بنے ہوئے۔

آنکھوں میں بے بسی ولا چاری کے عجیب سے تاثرات گندم ہو رہے تھے۔

”ابا۔۔۔ میرے ابا۔۔۔!“

وہ بے قرار ہو کر ان کی جانب لپکی۔۔۔ اور چاہا کہ بڑھ کر باپ کو چھو لے۔۔۔ ان کے پر شفقت سینے سے لپٹ جائے۔۔۔ اور بے شمار شکوے کر ڈالے۔۔۔ مگر اس سے پہلے وہ انہیں محسوس کر لینے میں کامیاب ہو جاتی وہ شکار کی پہنچ سے کہیں دور کھینچے تھے۔

بس ایک لمحے کے لئے آتے تھے، اور اپنی صورت دکھلا کر روپوش ہو گئے۔۔۔ وہ دیوانوں کی طرح گھور گھور کر ہر طرف دیکھتی رہ جاتی۔۔۔ اور وہ چاہتے تھے۔

چند لمحوں بعد جانے کیوں بے تاب دل و دماغ کو ٹھہراؤ سا محسوس ہونے لگا اور وہ دوبارہ تھک ہار کر لیٹ گئی۔ رخسار اب تک آنسوؤں کے گیلے تھے۔۔۔ اور صبح دم جب وہ کونسل کی کونوں سے بیدار ہوئی تو اس کا کلیہ آنسوؤں سے پیگ ہوا تھا۔



شکار نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اور اب تک کی عمر گزاری تھی، وہ ایک پڑھا لکھا اور معزز گھرانہ تھا۔ اس کے والد اسرار احمد اس وقت کے ایک سرکاری جگہ میں

لازم تھے۔

گھر میں خوش حالی اور قاریغ اہلی کا دور دورہ تھا۔ بے فکری اور آسودگی تھی۔

دراصل دنیا میں اسرار احمد کے ایک چھوٹے بھائی کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی شاعر احمد کو فطری طور پر کھیتی اور باغبانی وغیرہ سے انسیت تھی۔ اور اس کا لگاؤ کی بنا پر انہوں نے مکھنوں سے نزدیک ہی اچھا اور مناسب موقع محل دیکھ کر بہت سی زمینیں خرید ڈالی تھیں۔ جہاں انہوں نے کھیت اور باغ اپنی محنت اور مرضی سے اگائے تھے۔ چند برسوں کے اندر ان کی بے پناہ محنت اور ریاضت کا پھل زمین کی کوکھ بھاڑ کر بہہ نکلا۔ ہر طرف سے ان پر بہن برس پڑا۔ غلہ، کئی اقسام کی اجناس، پھل پھلاری سبزی ترکاری ان کی زمین سے اٹل پڑی اور اللہ کی رحمت کی ریل پیل ہو گئی۔ خدائے بزرگ و برتر نے محنت و مشقت کے ثمر سے ان کی جھولی بھر ڈالی تھی۔

قدرت نے بیوی بھی ان کو سادہ لوح اور حکم کی بندی بخشی تھی۔ جسے ”ہاں جی“ کے سوا دوسرا لفظ نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب شاعر احمد نے شہر چھوڑ کر ایک غیر آباد اور دیہاتی علاقے کی رہائش اختیار کی تو بیوی نے مخالفت تو کیا، اف تک منہ سے نہ نکالا۔ وہ اپنا سب کچھ مجازی خدا پر چھوڑ چکی تھیں۔

کرم پر کرم۔۔۔ نوازش پر نوازش یہ ہوئی کہ اللہ نے اسے اوپر چار بیٹے بھی نواز ڈالے۔ بیٹی کوئی سر سے سے ہوئی نہیں۔۔۔

اوجھر اسرار احمد بے چاروں کے ساتھ سب کچھ برعکس ہوا۔ گو وہ شاعر احمد سے دو برس بڑے تھے مگر تقدیر میں ان سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

فطری طور سے بہت نرم خو، کم سخن اور قدرے دبو قسم کے واقع ہوئے تھے جنہیں نامہ بیگم کی ایک لکھار نے ہی ہمیشہ کے لئے دبا ڈالا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے سکون پسند اور صلح جو مزاج کی وجہ سے کوئی جھگڑا مول لینے سے ساری زندگی کتراتے

رہے۔۔۔ بس جو بیوی نے کہا، ہو گیا۔۔۔ جو انہوں نے کیا کر دیا۔ وہ عورت کے قابل احترام سمجھتے تھے۔ عورت ان کے نزدیک بڑی اور اچھے سلوک کی مستحق تھی۔۔۔ لیکن اس نرمی نرمی اور مردت ہی مردت میں ہوا یہ کہ نائمہ بیگم ان کو ہر طرف سے دباؤ پٹی چلی گئیں اور یہ دبتے چلے گئے۔ ہر چیز کا تادھر تادھر نائمہ بیگم ہی رہیں۔۔۔ اسرار احمد کی شخصیت پہن منظر میں چلی گئی۔

در حقیقت۔۔۔ نائمہ بیگم اپنے امیر کبر والدین کی اہل قوت بیٹی تھیں۔ یوں ایک بھائی بھی تھے۔ مگر ان کی ناز برداری اور لڑ زیادہ ہوئے تھے۔ اس زمانے کے رسم و رواج کے خلاف، ان کے والد نے ان کی شادی بھی بہت تاخیر سے کی تھی اور یہاں یہ امر و ملحوظی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ نائمہ بیگم عمر میں بھی اسرار احمد سے بڑی تھیں۔

وجہ یہ تھی کہ ان کے والد بے حد متحدر اور دور اندیش قسم کے انسان تھے۔ صاحبزادی کے بچا لڑا اٹھا کر اور ناز برداریاں کر کر کے اسے لڑکوں کا سامراج، حاکمانہ انداز اور من مانی کرنا تو سکھا دیتا تھا۔ مگر پھر جوں جوں وہ بڑھتی گئی یہ فکر میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یوں اس کی عمر بڑھتی گئی اور انہیں حسب پسند کوئی لڑکا نظر نہ آ سکا۔

خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی بیٹی اب بھرے پرے خاندان میں بھٹا کرنے کے لائق تو رہی نہ تھی۔ ساس، سسر، ننندوں، دیور، جیٹھے، ہر کسی کا منہ رکھنا اور اب لحاظ کرنا اس کے لئے کہاں ممکن رہا تھا۔ ضد اور ہٹ دھرمی تو اس کے مزاج میں لہو کی مانند رچ بس گئی تھی۔ جبکہ ان کے والد چاہتے تھے کہ کوئی ایسا بر ملے کہ ان کی بیٹی کی ناز برداریاں اسی طرح ہوں اور وہ سیکے کی طرح سسرال میں بھی من مانی کر سکے۔ تاکہ اس کا دل میلان نہ ہو۔ اور ویسے بھی باؤں گھوڑا قسم کی ازدواجی زندگی اور اس کے کچھیزے دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ شادی ہوتی بھی جو ایسی ہے۔ اس آجائے تو جنت ورنہ جہنم۔۔۔

چنانچہ اسی تلاش تلاش میں، جبکہ نائمہ کی عمر اس وقت کے لحاظ سے نکلی جا رہی تھی، ان کے والد سے کہیں اسرار احمد نکرا گئے۔

اندھا کیا چاہے۔۔۔ دو آنکھیں۔۔۔ والد بزرگوار کی باچھیں کھل گئیں۔ اسرار احمد انہیں دل و جان سے پسند آ گئے۔ یہ بران کی توقع سے بھی کہیں زیادہ موزوں اور مناسب تھا۔

اسرار احمد بے چارے انہیں پسند کیوں نہ آتے۔ بھری پری دنیا میں ایک چھوٹے بھائی کے سوا کوئی تھا ہی نہیں۔ اور وہ بھی اپنی دنیا علیحدہ ہی بسائے ہوئے اور خود اسرار احمد میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جن کی تلاش ان کے ہونے والے سر کو تھی۔ وہ ایک ہی کائنات۔۔۔ انہوں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی پیسے والے آدمی تھے۔ جمیز کی تیاریاں ہاتھوں ہاتھ کر ڈالیں۔ پیسے کے زور پر مبینوں کا کام دنوں میں کر لیا۔ ادھر اسرار احمد بھی کھاتے پیتے انسان تھے۔ چنانچہ ایک ماہ کے اندر اندر ان کی اور نائمہ بیگم کی خوب دھوم دھام سے شادی ہو گئی اور نائمہ کے والد نے سکھ کا سانس لیا۔

اور پھر بہت جلد ان کے سارے منصوبے پورے ہو گئے۔ نائمہ کی شادی کے بعد ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کی بیٹی شادی کے بعد بھی ان کے پاس ہی رہے۔

لیکن اسرار احمد بے حد غیور اور ناک والے مرد تھے۔ وہ گھر و اماں رہنے پر تو تازہ نگاہی بھی تیار نہ ہوتے۔ اس لئے ان کے سسر نے کھل کر تو انہیں گھر و اماں بنانے کا اظہار نہیں کیا مگر پیکری کچھ ایسی چلائی کہ شادی کے تین ماہ کے اندر ہی اسرار احمد بیوی سمیت سسرال کے قریب آن رہے۔ سسر کو اتنا ہی کافی تھا۔ جانتے تھے کہ اماں ایک خود راہ شخص ہے۔ اس لئے چلنے خاص سسرال کے گھر میں رہائش اختیار نہ کی تو کم از کم

اسی محلے میں تو گھر لے لیا تھا۔

شادی کے کئی برس تک تو ان کے ہاں اولاد ہی نہ ہوئی۔ اسی دور ان نانہ بیگم کے والد کا انتقال ہو گیا مگر اسرار احمد نے اپنی رہائش تبدیل نہ کی۔ گھر بدل کر انہیں کیا لینا تھا۔ وہ سلیبی ہوئی طبیعت کے امن پسند انسان تھے۔ سرسالی عزیزوں سے کبھی ان کی ان بن ہوئی نہیں تھی۔ وہ تو نانہ بیگم جیسے جھل کے کانٹے کے ساتھ بھی نہایت خوبی کے ساتھ نباہ کر رہے تھے۔ یہاں سے ان کا دفتر بھی قریب پڑتا تھا۔ اس لئے انہوں نے کبھی رہائش بدلنے کی بابت سوچا تک نہیں۔

سرسالی عزیزوں سے ان کا تو کیا جھگڑا ہوتا، نانہ بیگم ہی ہر کسی سے لڑا تیں اور جلد ہی دوبارہ شیر و شکر بھی ہو جاتیں۔

یہاں سب ان کے اپنے ہی خونری رشتے تھے۔ ہاں باپ کا آبائی گھر، اسی میں ان کے بھائی بھی اپنے کنبہ سمیت رہتے تھے۔ کئی ایک خالہ زاد بہنیں بھی اسی محلے میں بیاہی تھیں۔ اس لئے ہر وقت ہی شور و غل، رونق، آنا جانا اور جہل جہل رہتی تھی۔ نانہ بیگم سرسالی اور سرسالی رشتوں سے نا آشنا ہی ہیں۔ وہ اپنی خالہ زاد بہنوں کے ساتھ مل کر ہر جگہ کا آنا جانا۔ من مانی کرنا۔۔۔ جو جی میں آیا کیا۔۔۔ جیسا چاہا پکایا۔۔۔ وہ ہر بندش اور رکاوٹ سے آزاد رہتی تھیں۔ اسرار احمد ہر طرح ان کے کنٹرول میں تھے۔ لیکن اک اولاد کے نہ ہونے نے دونوں کے غم کو غم مشترک بنا رکھا تھا۔ جلد ہی علاج اور دوا دوا کر کا آغاز ہو گیا۔ جس نے جو بتایا انہوں نے کر ڈالا۔ مگر گوہری ہونے کے آثار پیدا نہ ہوئے۔

یہ کسی نانہ بیگم کے لئے بہت بڑا تازیانہ تھی۔ اس محرومی نے ان کو معلوم نہیں کہاں کہاں کی خاک چھنوا دی۔ دعا تعویذ سے دوا علاج تک مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ بالآخر کسی کے کہنے پر اسرار احمد نہ جانے کیسے بیوی کو لے کر اجیر شریف جا پہنچے۔

دونوں نے گڑگڑا کر منت مان لی اور قدرت نے ان کی یوں سنی کہ اسی برس ان کے ہاں مشکبار نے جنم لیا۔ جسے سوا مینے نہاتے ہی یہ دونوں انتہائی احترام اور عقیدت کے ساتھ نہلا دھلا کر اجیر شریف لے کر گئے۔ زیارت کرائی اور جتنا ہو سکا وہاں لنگر پکوا کر تقسیم کیا فقراء میں حیثیت کے مطابق خیرات دی۔

اس طرح بیٹا منت مرادوں کے ساتھ اور دعاؤں کے بعد مشکبار نے اس گھرانے میں قدم رکھا۔ اس کے بعد قدرت ایسی مہربان ہوئی کہ یکے بعد دیگرے دو بیٹوں سے بھی نوازا۔۔۔ گو مشکبار اور شمشاد کے درمیان خاصا لمبا عرصہ حائل تھا مگر قدرت نے اسرار احمد کی انکساری کو انعام دے ڈالے تھے۔

مشکبار کی اس کے اپنے گھر میں جو آؤ بھگت تھی وہ تو تھی ہی، لیکن چچا ثار احمد کے ہاں تو ہر طرف اسی کاراج تھا چچا کے چار بیٹے ہی بیٹے تھے۔ ان کا بھرا بھرا آگن بیٹی کا وجود نہ ہونے سے تنہا تھا لگتا تھا اور اس کی کو مشکبار کے بیکے سبکے وجود نے پر کر دیا تھا۔ چاروں لڑکوں سمیت، چچا چچی کو اس شریری لڑکی سے والہانہ محبت تھی اگر چچا کا بس چلتا تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے ہاں سے نہ جانے دیتے۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ مشکبار بھائی کے ہاں بھی اکلوتی بچی تھی۔ تاہم وہ بیٹھے شری سے ایک دوسرے بعض بھتیجی کی وجہ سے ہی بھائی کے ہاں ضرور چکر لگا آتے۔ گو نانہ بیگم نے شروع سے ہی دیور کو رد کر ڈالا تھا۔ اور جانے اپنے کن تعصب پسند خیالات کے تحت پسند نہیں کرتی تھیں۔ دیورانی اور بھتیجیوں کو تو انہوں نے کبھی منہ لگانا پسند ہی نہیں کیا تھا۔ مشکبار کا بار بار چچا کے ہاں جانا بھی انہیں ناگوار خاطر گزر تا تھا مگر ان دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ چھٹی کے دن اسرار احمد ان کی پروا کے بغیر ننھی مشکبار کی انگلی تھامے صبح صبح بھائی کے گھر جا پہنچتے۔ یہ ان کا برسوں کا معمول تھا۔

مشکبار کا بچپن اتنا سنا اور یادگار گزارا تھا کہ خوش نصیب بچوں کا ہی گزر تا ہو گا۔

”ارے چوہیا اپنا داؤں چلا گئی۔۔۔ پورا مرد بھی تو نہیں کھاتی یہ چوہیا۔“

”ارے بھئی! میری مشابہت کونسا کہیں غیروں میں آتی جاتی ہے۔ سب اپنے ہی ہیں۔ کس کی نیت گڈے گی اٹھے سے زبور۔۔۔“

وہ پیاد میں ”چو بہا“ ہی کہا کرتے تھے۔ شام کو آکر چچا کا ان ایشیے تو وہ ہنس ہنس کر چچی کے پیچھے چھپنے لگتی۔

گوکہ دونوں بھائیوں نے بھی اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال نہیں کیا تھا مگر ثار احمد کے دل میں ہمیشہ یہی خواہش جاگزیں رہتی تھی کہ بڑے ہونے پر وہ اپنے کسی بھی بیٹے کے لئے بھائی سے مشکبار کو مانگ لیں گے۔

یوں تو اسرار احمد کو شمشاد اور دلشاد بھی جان سے زیادہ عزیز تھے مگر بیٹی ان کی سانس بنی ہوئی تھی۔ حد یہ تھی کہ ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہونے کے باوجود بھی کہیں نمائش یا میلے لگتا تو مشکبار کی فرمائش پر وہ سب سے پہلے اسے لے کر جاتے اور اس خیال سے کہ بچی تھک نہ جائے، سارا میلہ اسے اپنے کندھے پر سوار کئے کئے دکھلاتے۔ دیکھنے والے ہنستے بھی اور رشک بھی کرتے۔

مگر --- نانہہ بیگم ان چاؤ جو نچلوں پر جل جل کر نہ کہو جاتیں اور سوسو باتیں سناتیں لیکن اس سلسلے میں اسرار احمد نے ان کی کبھی نہیں سنی تھی۔

باپ کی شریر شکبار بھی ماں کو خاطر میں نہ لاتی، کاش! اسے معلوم ہو تا کہ یہ وقت خنصر ہے؟ تو شاید وہ باپ سے کبھی اتنے لاڈلی نہ اٹھواتی۔

ماں کی اسے سب میں بری عادت یہ لگتی تھی کہ اس کے اچھے اچھے کپڑے اور چیزیاں بھی اٹھا کر بڑی فراخ دلی سے اپنے بھائی کی لڑکیوں اور خالہ زاد بہنوں کے بچوں میں بانٹ دیتی تھیں۔ ان کے رشتے دار بہنوں کے مالی حالات اچھے نہ تھے اور ادھر نانہہ کی سی شادول اور کنبہ پرور بہن --- اسرار احمد کے لئے ہوئے فروٹ، مٹھائیاں، بچوں کے کھلونے، چیزیں، کپڑے ہر چیز اٹھاتی اور ان کے بچوں میں تقسیم کر دی۔ مشکبار کو ان کے لینے دینے پر امتراض نہیں ہوتا تھا مگر جہاں نانہہ بیگم نے اس کا کوئی دوپٹا یا کپڑا اٹھایا اور اس نے ہنگامہ نہ کیا۔ مشکبار اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کے بہنوں

کے بچے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور ہر وقت اسے پہنے اوڑھے دیکھ کر سب لڑکیاں عینیں اور حسد کرتیں ہیں مگر نانہہ بیگم کو ان باتوں کی کہاں پروا تھی۔

بہر حال --- مشکبار کا بچپنا انہی لیل و نہار میں گزرا۔ اس کی آنکھ کا ایک آنسو باپ کے دل کا سوراخ بن جاتا تھا۔۔۔ چچا چچی کے آنکھوں کا قہار تھی۔ اتنے سارے محبت کرنے والے تھے اور پھر وہ کیوں نہ اتراتی۔

مگر وہ یادگار دن بہت جلد ہی بیت گئے۔ ایک ایسی آفت اس پر ٹوٹی کہ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور پھر دھیرے دھیرے ہر سہارا چھوٹ گیا۔

مشکبار کو وہ پر آزمائش دن اچھی طرح یاد تھے۔ جب اچانک ہی اسرار احمد بیمار ہو گئے تھے۔ دور و نزدیک ہر حکیم وید نے جواب دے دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسرار احمد کے سرکاری محلے کے انگریز ڈاکٹر نے بھی گھر میں آرام کرنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا تھا۔ تب ہار کر ثار احمد کے گاؤں کا ایک پرانا حکیم علاج کے لئے لایا گیا۔ صبح کا وقت تھا حکیم جی نے تالاب پر جی ہوئی کاٹی لانے کو کہا۔ قریب کٹری مشکبار تیر کی طرح بھاگی۔ حالانکہ اسے کافی گھن آتی تھی تاہم وہ ہری ہری کاٹی کا غد میں سینے دروازے میں بھاگتی ہوئی داخل ہوئی ہی تھی کہ --- دفعۃً نانہہ بیگم ہری اور سرخ گانچ کی پونڈیاں اس کے قدموں میں آگریں اور بہت سارے ننھے ننھے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئیں۔

”بھائی جان کیا ہو گیا؟ کیا ہو گیا بھائی جان!“ وہ بری طرح اس کی باتوں سے لپٹ گئی۔

اسے قریب دیکھ کر شفیق کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ مگر وہ اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا اور اس کی کمزوری گرفت سے آزاد ہو کر آگے بڑھ گیا۔

مشکار کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ کمرے کے اندر جائے۔ اماں کے عین کرنے کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

”ابا..... میزے پیارے ابا.....!“

اس نے انتہائی نیکی سے بولے بسے کے عالم میں وحشت برساتے درود پوار کی طرف دیکھا۔

گھر کا ہر گوشہ، ہر کونہ، ہر ذرہ اور ہر شے نوحہ کناں لگی۔

”آؤ! کیا وقت آن پڑا تھا زرا سی عمر میں! باپ جیسی مشفق و مہربان ہستی.....

”نہیں..... ایسا کیسے ممکن ہے.....!!“

اس کے پاؤں میں اک دم چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور وہ کمرے کے اندر گرتے گرتے بچی۔

یہاں کا منظر ہی بدل چکا تھا۔

اماں زمین پر بچھاؤں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔

عکیم جی سر جھکائے پٹنگ کے قریب کھڑے تھے۔

اسرار احمد کی دونوں آنکھیں بند اور گردن ایک طرف کوڑھلکی ہوئی تھی۔ ہر دم

تکلف اور مسکراتارنے والا چہرہ موت کے زرد ہاتھوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

پاکستانی کی طرف کھڑے ثار احمد زار و قطار روئے جا رہے تھے۔

فضائیں دم بخود تھیں۔

کاچ کی جھل جھل مل جھل مل کرتی ہوئی چوڑیاں۔۔۔۔۔

جو سہاگ کی اول نشانی ہوتی ہیں۔۔۔ وہ مشرقی عورت کے احساسات میں سر

خوشی اور سرمستی کے پھول لگاتی ہیں۔۔۔۔۔ نئے نولے اور روپیلے خوابوں کو چمکاتی ہیں۔

کاچ کی وہی کھٹکھٹاتی ہوئی چوڑیاں مشکار کے قدموں میں ریزہ ریزہ پڑی ہوئی تھیں۔ ہر

ریزہ ہلک ہلک کر اسے آنے والی منحوس اور تاریک گھڑی کا سندیسہ دے رہا تھا۔ اس کا

نھاسا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔۔۔۔۔ یوں جیسے پہلیاں پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

رسم و رواج کے پابند گھرانے کی ایک مشرقی لڑکی ہونے کے ناتے اس کا احساس

دل کسی اندوہناک سانچے کے خیال سے بیٹھنے لگا۔

وہ اچھی طرح پہچان گئی تھی کہ یہ سنہری کام والی چمکتی ہوئی نئی چوڑیاں اماں کے سوا

کسی کی بھی نہیں تھیں۔۔۔۔۔ ابھی چند دن پہلے تو منہاری ان کی کٹائیوں میں سجا کر گئی تھی!

اس کے پیروں میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ وحشی ہرنی کی مانند قلا تچیں بھرتی

کمرے کی طرف بھاگی۔

سب سے پہلے اس کی نگاہ شاربچا کے بڑے لڑکے شفیق پر پڑی جو دونوں آنکھوں

سے آنسو پونچھتا ہوا اسرار احمد کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

ماحول سو گوار تھا۔

مشکبار بالکل ہی حواس باختہ ہو کر ہانگوں کی طرح ایک ایک کی صورت بن گئے تھے۔

یہ ذرا دیر میں کیا سے کیا ہو گیا تھا؟

وہ تو چند ثانیے قبل جو بڑے کاٹی لینے لگی تھی۔

اسے صرف اتنا علم تھا کہ اس کے جان سے پیارے ابا بہت دنوں سے بیمار تھے۔ ہر

طرف کا علاج کروا کر وہاں سب مایوس ہو چکے تھے۔ مگر اتفاقاً نہ ہو تا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ کچھلے کئی روز سے اسرار احمد کا پیشاب بھی بند ہو گیا تھا۔ آخری

علاج کے طور پر گناؤں کے حکیم جی نے جو بڑ پر جمی رہنے والی کاٹی منگوائی تھی جو بطور دوا

ان کی ناف پر رکھی جاتی۔

مگر ظالم اور غفک موت کے جبروں نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔

آخری وقت میں انہوں نے مشکبار کو بار بار پکارا تھا۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہ

تھی۔ وقت بہت کم تھا۔۔۔ انتظار کے لمحے بے حد طویل لگے۔۔۔ انہوں نے چھوٹے

بھائی کا ہاتھ تھامے تھے اور دلشاد و شمشاد کی طرف تھکنکی لگائے لگائے دو دفعہ زیر

لب کلمہ طیبہ کا درود کیا، ہر طرف حسرت زدہ نگاہیں دوڑائیں اور پھر ہمیشہ کے لئے ہر

احساس سے غافل ہو گئے۔

آخری پلکی نے آگے بڑھ کر انہیں ہر کسی سے چھین لیا۔

مشکبار کے ہاتھوں سے وہ کانغہ کی پڑیا، جس میں کاٹی لپٹی ہوئی تھی، چھوٹ کر

کمرے کے کچے فرش پر بکھر گئی اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر چھوٹ چھوٹ کر

رونے لگی۔

لمحات ایسے جابر اور سخت تھے کہ کسی نے اس کے رونے پر دھیان بھی نہیں دیا۔

نہ اس کے آنسو پونچھے۔ سب کو اپنا ہنار شدہ عزیز تھا۔

وہ اکیلی ہی روتی رہی۔ اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ کسی صورت باپ کے

زردیک پہنچ جاتی اور ان کو موت کی آغوش میں سوئے ہوئے قریب سے دیکھ لیتی۔

سب سے پہلے چچا غلام احمد کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

انہوں نے دوڑ کر اسے کیلچے سے چٹا لیا اور اسے خاموش کروانے کے بجائے خود

بھی زار و قطار رو رہے۔ چچا سمجھتی کادکھ مشترک تھا۔ دونوں کا درد ایک جیسا تھا۔

مرنے والی ہستی اگر مشکبار کی باپ تھی، تو غلام احمد بھی ان گھڑیوں میں اپنے اپنے آپ کو بن

باپ کا ایک یتیم بچہ تصور کر رہے تھے۔

اسرار احمد نے ہمیشہ ان کے ساتھ ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ دروازا کھا تھا کہ ان کو

بڑے بھائی کی موجودگی میں کبھی ماں باپ سے محرومی کا خیال نہ آیا تھا۔ گو کہ اسرار احمد

شادی کے بعد سے اپنی سسرال میں رہے تھے اور نانہہ بیگم کے کنٹرول اور میکے ہی

میں رہنے کے زعم میں دب کر یہ خاصا ممکن تھا کہ وہ جھوٹے بھائی سے بالکل ہی غافل

ہو جاتے مگر وہ حقیقت ایسا نہیں تھا۔ دونوں بھائیوں کے دل ہمیشہ آپس میں شیر و

شکر کر رہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسرار احمد کے انتقال کے بعد ان کا گھر پہلے کی نسبت زیادہ

دیران اور سنسان نظر آتا۔ کیونکہ اس گھر میں ان کے تین بچوں کے علاوہ صرف نانہہ

بیگم ہی کے دم قدم سے روتی تھی لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ ان کے انتقال کے بعد سے

ایک گہما گہما اور شور و غل کا سماں ساندھ گیا۔

ایک آ رہا ہے تو دوسرا جا رہا ہے۔ ایک طرف درجنوں بچوں نے شور مچا رکھا ہے۔

دوسری جانب عورتوں کی بکھر بکھر جارہی ہے۔ پان پر پان چلے آ رہے ہیں۔ مردانے میں

چائے کے خوان چل رہے ہیں۔ پانوں کے بیڑے پر بیڑے بن بن کر جا رہے ہیں۔

علاوہ وہی ”گڑوڑی روٹی“ کے بعد سے گھر میں برابر چو لہا جلتے لگا تھا۔ ملازم کے

ساتھ چند ایک ہاتھ جیر ہلانے والی خواتین لگ جاتیں اور صاحب! ابھی ناشتے کی طشتریاں بھی ہیں تو ایک بجے تک دوپہر کا ترانا ہوا کھانا بھی تیار ہے جس کے فوراً بعد ہی رات کے کھانے کی تیاری بھی شروع ہو جاتی۔

اور یہ سب نانہہ بیگم کی چھوٹ اور تجاہل عارفانہ کا نتیجہ تھا۔

وہ سب کچھ کھلی آنکھوں دیکھ رہی تھیں۔ مگر دونوں ہاتھوں سے لٹا بھی رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے ارد گرد جمع ہونے والے سب انہی کے سینے والے تھے۔ بھائی بھابھ، ان کے بچے۔۔۔ خالہ زاد بھینس اور ان کے ڈھیروں بچے۔

اسرار احمد کا سوئم ہو گیا اور پھر دسواں۔۔۔ بیسواں۔۔۔ اور بالآخر چالیسواں بھی ہو گیا۔ دن خوشی کے ہوں یا غم کے۔۔۔ بہر حال بیت ہی جاتے ہیں۔ کون سی گھڑی؛ ساعت تھی رہ جاتی ہے۔ نانہہ بیگم نے چالیسواں بھی دل کھول کر کیا تھا۔ خاصی دور دور سے عزیز واقارب اور ان کے دوست احباب مدعو کئے گئے تھے۔ ایک نہ تھے؟ اسرار احمد نہ تھے!

نانہہ بیگم کا دکھ کاٹنے نہ لگتا تھا۔ اپنی سوئی کھانوں کی طرف دیکھتے دیکھتے رقت طاری ہو جاتی اور وہ بین کر کر کے دھاڑیں مارنے لگتیں۔ ان کو اس بات کا شہد احساس اور رنج تھا کہ ان کے دلپسند رنگوں کے خوشنما اور دیدہ زیب کپڑوں اور ریشم جھلملاتی ساریوں سے بکس بھرے کے بھرے رکھے تھے اور وہ کسی کپڑے کو ہاتھ لگا۔ کی مجاز نہ رہی تھیں۔ وہ جوہر آٹھویں دسویں نئی چوڑیاں پہننا اور ہاتھوں پیروں میں مہندی رچانا فرض سمجھتی تھیں۔ بیوگی کا۔۔۔ بے رنگ دوپٹہ اوڑھنے پر مجبور ہو گا تھیں۔ وہ اس اچانک آپڑنے والی افتاد پر بلبلہ! انھیں اور ایسی حواس باختہ ہوئی تھیں کہ اپنے تئیں بچوں تک کو بھول چکی تھیں۔

سارا سارا دن انہیں مشکبار، دلشاد اور ششاد کا خیال نہ آتا۔ انہوں نے کیا کھایا؟

کیا کر رہے ہیں اور کہاں ہیں، وہ بے خبر و لاعلم رہتیں جبکہ کیفیت یہ تھی کہ ہمہ وقت مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے دلشاد اور ششاد سب سے اور خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ اکثر مہمانوں کے لاڈلے اور منہ چڑھے بچے انہیں پکڑ کر پیٹ ڈالنے اور کوئی چھڑانے والا بھی نہ ہوتا۔۔۔ عجیب حال سے بے خبر ہو رہے تھے۔ کبھی کسی رشتے کی خالہ نانی کو ترس لگیا تو پکڑ کر منہ دھلا دیا نہلا کر کپڑے بدلوا دیئے ورنہ سارا سارا دن اسی گندنی سندی حالت میں گھومتے رہتے۔

باقی بچی مشکبار۔۔۔ تو اسے صحیح معنوں میں اپنے آپ کا ہوش نہ تھا۔ اس کے ہونٹ تو جیسے ہمیشہ کے لئے مسکرا نہ بھول گئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں کے کنوروں میں مستقل طور پر ایک ایسی دل کو چیر ڈالنے والی کیفیت کے پڑاؤ نظر آتے تھے کہ اس کی محرومی اور مایوسی پر جی کٹنے لگتا۔ نانہہ بیگم وقفے وقفے سے بین کر تھیں، سینہ کوبی کر تھیں، اپنی ماں بہنوں سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مارتی رہتیں، مگر مشکبار کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ بہتا۔ یوں لگتا جیسے اس پر ایک مجبور طاری ہو گیا ہے۔

ہاں۔۔۔ بس جس روز بھی اس کی چچی گاؤں سے آجائیں تو وہ گھنٹوں ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہتی پھر ان کی مستابھری گود میں منہ چھپا کر پڑ جتی اور سب کی آنکھوں سے چھپ کر جانے لگتے بیٹھا آنسو بہا دلاتی۔

اسرار احمد کا چالیسواں ہو گیا تھا لیکن آنے جانے والوں کا تانا معمولی سی کمی کے ساتھ اسی طرح لگا رہتا۔

اس صورت حال پر سب سے زیادہ تشویش نثار احمد کو تھی۔

وہ کھلی آنکھوں یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ مگر وقت اس درجہ نازک اور حالات ایسے دردناک تھے کہ ان کا دھڑل دینا مناسب نہ تھا۔ خود وہ بھی بڑے بھائی کے بول جھجھ جانے سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ اس اچانک جدائی نے ان کے جگر میں ناسور

کر ڈالے تھے۔ روح کو گھاسل کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ان کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اس لئے سے مہینوں بلکہ تمام عمر دل و دماغ خالی نہ کر پائیں گے کہ یہ صدمہ --- ایسا ہی کڑا صدمہ تھا۔
 ننھے ننھے قیمتی بیجیے بیجیے کے منہ دیکھتے تو طبیعت پر اور بھی زیادہ وحشت اور گھبراہٹ غالب آنے لگتی اور وہ گھبرا کر بھائی کے گھر سے نکلنے کو جانے کہاں کہاں کی خاک چھان آتے۔ یا پھر اگر اپنے گاؤں چلے جاتے تو کئی کئی دن کے لئے اپنی بیٹھک میں محصور ہو جاتے اور گھنٹوں اپنے اور بڑے بھائی کے بیچپن سے اب تک کے سارے زمانے کو دہراتے رہتے۔

سوئم، دوسویں، بیسویں اور چالیسویں میں وہ باقاعدہ اپنے تمام بچوں سمیت شریک ہوئے تھے۔ ہر روز قبرستان جا کر خوانی اور کلام پاک کی تلاوت بھی ان کے معمولات میں شامل ہو گئی تھی۔

مرحوم بھائی کے گھر کے حالات ان کی آنکھوں سے مخفی نہیں تھے۔ وہ دل ہی دل میں بھواج کے اہتمام روئے اور کم عقلی پر کڑھتے رہتے۔ مگر پاس ادب سے ٹوکتے نہیں تھے۔ ان کی تجربہ کار نگاہوں نے ایک زمانہ دیکھ رکھا تھا وہ نائے بیگم کے گرد جمع رہنے والے خوشامدیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانتے تھے کہ یہ سب اس وقت تک ان کی خوشامد درآمد میں لگے رہیں گے جب تک کہ ان کے پاس چار پیسے ہیں۔ وقت پڑنے پر۔ گانوں بھی نظر پھیر جائے گا۔

اس کے علاوہ اسرار احمد اس وقت کے ایک سرکاری محکمے کے ملازم تھے۔ سب جانتے تھے کہ ان کی بیوہ کو ایک اچھی خاصی رقم ان کے محکمے سے ملتی۔ چنانچہ نائے بیگم حریص اور لالچی رشتے داروں کے لئے ترو تازہ مال تھیں۔ ہر کوئی ہر وقت ان کی دلجوئی اور ہمدردی بنورنے کی فکر میں رہتا۔

جب چالیسویں کی نیاز بھی ہو چکی، لیکن نائے بیگم کے اور گرد سے بھیڑ کم نہ ہوئی

تو بھلائی مجبوری نثار احمد نے بھواج سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے سامنے اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

فطرۃ نثار احمد غصے کے تیز تھے۔ بے قاعدگی اور بے اصول پن ان کے مزاج میں برہمی اور چڑچڑاہٹ کا دینا تھا۔ اب تک انہیں ایک موبوم سی امید تھی کہ شاید چالیسویں تک جب بھائی صاحب کا غم تدرے کم ہو جائے گا تو وہ سنبھل جائیں گی اور اپنے نہیں تو کم از کم اپنے قیمتی بچوں کے غیر محفوظ مستقبل کے پیش نظر ان روز روز کی مہمانداریوں سے محتاط ہو جائیں گی۔

لیکن چالیسویں ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ گزر گیا مگر نائے بیگم کی آنکھوں پر پڑا غفلت کا پردہ نہ اٹھا۔
 نثار احمد چڑھ گئے۔

چنانچہ ایک دن ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ اپنی زمینوں کا چکر لگانے نکلے تو وہیں سے بھائی کے گھر کی طرف ہوئے۔

نائے بیگم نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ کسٹمندی سے بستر میں لیٹی کر وٹیں بدل رہی تھیں۔ جب ملازمہ آکر آگاہ کیا۔

”بیگم صاحبہ! چھوٹے میاں صاحب آئے ہیں۔ بیٹھک میں بٹھا کر آئی ہوں۔ بنے کیا کام ہے آپ کو بلوار ہے ہیں۔“

نائے بیگم کو سخت تعجب ہوا نثار احمد! اور ان کی بلائیں!! انہوں نے تو کبھی اشد ضرورت کے علاوہ ان سے کبھی کام ہی نہیں کیا تھا۔۔۔!!

الٹی خیر۔۔۔ ان کا ہاتھ ٹوٹا۔ ضرورت حال میں کچھ کالا ہے۔ ورنہ نثار احمد کو ان سے کیا کام پڑا تھا۔ اب تو فاتحہ درود بھی سبج ہو چکا تھا۔“

دفعتاً انہیں خیال گزرا۔

کہیں پنشن کے سلسلے میں تو کوئی بات کرنے نہیں آئے؟

انہوں نے خود بخود بدگمان ہو کر گہری سانس کھینچی۔ چہرے پر نفرت و حقارت کے سائے لہرائے۔ دیور کی طرف سے دل میں جی ہوئی کدورت آنکھوں میں غصہ بن کر سمٹ آئی اور وہ خود سے مخاطب ہو کر فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

”ٹھیک ہے میاں! تم جی اپنی سی کرلو۔ دانتوں پسنے نہ چوادیے تو میں بھی شمشیر علی خاں کی بیٹی نہیں۔۔۔ تم اس لئے اترارہے ہو گے کہ مرنے والے کے حقیقی بھائی ہونے کے ناطے سرکار سے پنشن وصول کرنے میں مجھے فوراً اتہار ایسی سہارا لینا پڑے گا۔ مگر یاد رکھنا۔۔۔ بندی بھی اس وقت تک ہی نرم رہے گی جب تک کہ پیسہ نہیں مل جاتا۔۔۔“ وہ جی ہی جی میں خوب پکی ہو کر پٹنگ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

نثار احمد بیٹھک میں ایک آرام کر سی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔
ناعمہ بیگم غرارے کے پانچ سنبھالی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو انہوں نے ادب سے سلام کیا اور حقے کی ایک طرف کھسکا کر خاموش بیٹھ گئے۔

چند منٹ سکوت طاری رہا۔

ناعمہ بیگم دیور کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں اور وہ کسی سوچ میں ڈوبے رہے۔
چھپے آواز گھنگو کے لئے موزوں الفاظ کا انتخاب کر رہے ہوں۔

ناعمہ بیگم نے ملازمہ کو بلا کر ناشتہ لانے کو کہا تو وہ چونکے اور سنبھل کر بولے۔

”نہیں..... نہیں بھابی صاحبہ۔ ناشتے وغیرہ کا تکلف مت کیجئے۔ میں گھر سے ناشتہ کر کے چلا تھا۔“ لیکن اگر آپ بعد میں تو صرف ایک پیالہ چائے منگوا لیجئے۔“

”آپ کی مرضی!“ انہوں نے قدرے بے نیازی سے کہہ کر ملازمہ کو چائے لانے

کا اشارہ کیا۔

پھر پہلو بدل کر بے چینی سے دریافت کر ہی بیٹھیں۔

”کیسے آنا ہوا؟ کوئی خاص کام تھا؟“

”کام کیا۔۔۔ بس یونہی ذرا چند معاملات پر آپ سے اظہار خیال کی نیت سے آگیا۔“

”اچھا..... وہ کیا معاملات ہیں ذرا میں بھی سنوں۔“

ناعمہ بیگم سخت الجھن میں مبتلا تھیں کہ قصہ کیا ہے!

اب نثار احمد نے بھی تاخیر مناسب نہ سمجھی۔ بلا تہمید کہنے لگے۔

”قصہ یہ ہے بھابی صاحبہ کہ بھیا کے انتقال کو دو ماہ سے زیادہ ہونے کو ہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ہاں سے مہمانوں کا جم غفیر چھٹنے کا نام نہیں لے رہا۔ دو جاتے ہیں تو چار آ جاتے ہیں۔ خدا خواست ایسی بات نہیں ہے کہ میں مہمان نوازی کے خلاف ہوں۔ یا کسی کا آنا جانا پسند نہ کرتا ہوں۔ نہیں بخدا ایسی کوئی بات نہیں۔ دنیا میں ہر انسان اپنے مقدر کا رزق کھاتا ہے اور قدرت نے دانے دانے پر مہر رکھی ہوئی ہے۔ لیکن۔۔۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حد سے تجاوز کر جانے والا ہر امر بھی غلط ہوتا ہے۔۔۔“

دنیا میں شادی بیاہ ہوتے ہیں۔ خوشیوں کے تقارے بنتے ہیں، مگر وقت کے ساتھ ساتھ چاہے کیسی ہی عظیم خوشی ہو، ضرور ماند پڑ جاتی ہے۔ اثر کم ہو جاتا ہے اور بالآخر ہر کوئی اپنے معمول پر آ جاتا ہے۔۔۔ جبکہ۔۔۔ بھیا کی بے وقت موت تو ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اپنے اپنے رشتے ناتے کے لحاظ سے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اس سانحہ عظیم پر دنگ رہ گیا ہے صدمہ سمجی کو ہوا ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا بھابی صاحب! غم منانے کا یہ کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے۔ بھیا کے انتقال سے صحیح معنوں میں سب سے زیادہ نقصان تو آپ کا ہوا ہے۔ ہمارا ہوا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے نقصانے تین بچوں کا ہوا ہے۔ جو اتنی ذرا سی عمر میں تیشی کا داغ کھائے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اب ان کے بہتر مستقبل کے لئے سوچنا بھی تو ہی کو ہے۔ مگر۔۔۔ صد افسوس! کہ کسی کو اس انداز میں

نامہ نیگم ایک جہاں دید و خاتون تھیں۔ اس وقت انہیں دیور کا عندیہ بھی معلوم ہو گیا تھا اور یہ طینتان بھی ک فند کی رقم دہی وصول کریں گی۔ گوکہ انہیں شہر احمد کی یہ حقیقت پسندانہ گفتگو پسند نہیں آئی جو وہ صاف صاف ان کے میکے والوں کے لئے کر رہے تھے مگر اس وقت، وقت اور حالات کی نزاکت کے تحت نرمی اور حلیمی برتنے پر

نثار احمد کے دل پر بھی چوٹ لگی۔ رنجیدہ ہو کر بولے۔ ”معافی چاہتا ہوں بھائی صاحب! مجرا مقصد آپ کا دل دکھانا ہرگز نہ تھا۔ میں تو بر صورت میں آپ کی بھلائی کا خواہاں ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کہیں خدا خواستہ مروت ہی مروت میں آپ ان بے با قسم کی مہمان داریوں میں گھر کر کہیں مقروض وغیرہ نہ ہو جائیں۔ آخر بھیسے جاروں

مجبور تھیں۔ جانتی تھیں کہ فنڈ کی رقم کے لئے دوڑ دوڑ کر بھی ٹاراجہ ہی کریں گے اور مرحوم کے حقیقی بھائی ہونے کے رشتے سے ان ہی کی کوشش اور بھردری..... بار آور ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے جھٹ سے اپنے انداز بدل لئے۔ پیشانی سے تیوریوں کے بل سیدھے کئے۔ چہرے پر بھولا پن اور خلوص طاری کیا اور بڑی بے جا رنگی کے عالم میں گویا ہوئیں۔

”--- اس سلسلے میں خود بڑی پریشان ہوں بھیا مگر کیا کر سکتی ہوں۔ گھر آئے ہوؤں کو کیسے منہ پھوڑ کر کہہ دوں کہ چلے جاؤ۔۔۔ یا مت آیا کرو۔۔۔ کچھ نہ چاہئے کے باوجود جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے اور پھر کوئی عین کھانے کے وقت آن وارد ہوتا ہے کوئی ناشتے پر آ موجود ہوتا ہے۔ ایسے میں جھوٹوں منہ بھی کہہ دو تو جھٹ سے دسترخوان پر جم جاتے ہیں۔ میں خود کئی روز سے فکر مند ہوں کہ کس طرح جان چھڑاؤں۔ اگر عدت کا زمانہ نہ ہو تا تو کچھ عرصے کے لئے آپ کے ہاں جا پڑتی۔“



ٹاراجہ پرانے ٹائپ کے سادہ لوح انسان تھے۔ بھادرج کے منہ سے اپنے ہاں آنے کی سن کر خوشی اور حیرت سے اچھل پڑے۔۔۔ نانہہ بیگم۔۔۔ اور۔۔۔ ٹاراجہ کے ہاں آنے کی ہائی بھرس!! ان کے تو کبھی دیور دیورانی کی طرف سے پیشانی کے بل نہ کھٹے تھے۔۔۔ کیا کہ اس درجہ عنایت!

ٹاراجہ کو یہی گمان گزرا کہ بے وقت شوہر کی جدائی اور انتقال نے بھادرج کا دل بالآخر ان کی طرف سے بھی نرم اور صاف کر دی دیا۔

انہوں نے اطمینان اور سکون کا سکھ بھرا سانس لیا اور بڑی سچائی سے بولے۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ سچ کہتی ہیں۔ کسی کو آنے جانے پر منہ کھول کر کہہ دینا بھی مناسب نہیں

معلوم ہوتا۔ یہ تو مزید معیوب بات ہوگی۔ ویسے میرا گھر ہر وقت آپ کے لئے اور بچوں کے لئے حاضر ہے۔ عدت کا زمانہ ساتھ خیریت کے گزر جائے تو ادھر ہی آ جائے گا۔ شاید کچھ جی بھل جائے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ان بچوں کو ابھی ان کی چچی کے پاس بھیج دیجئے یہاں آپ کو زیادہ پریشان کرتے ہوں گے اور آپ کی طبیعت ویسے ہی پریشان ہے۔“

نانہہ بیگم کو ان کی یہ سیدھی سادی پیشکش بھی ناگوار گزری۔ خود ان کا اپنا دل کدورت سے بھرا ہوا تھا اس لئے گمان گزرا کہ وہ ان کی بچوں کی طرف سے بے پروائی اور لافلتی پر طنز کر رہے ہیں۔

مگر بروقت سنجیدگی اور اپنے اصل تاثرات چھپا کر بناوٹ سے جواب دیا۔ ”اے نہیں۔۔۔ اب وہاں ان تینوں آنٹوں کہ کہاں بھیجتی پھروں گی۔ بھابی بے چاری پریشان ہوں گی پھر بچوں کے بغیر ٹھوڑا مایوس اور دل بھی نہ لگے گا۔ انہی کے دم سے وقت کاٹ رہی ہوں۔ بس آج کل تو اس فکر سے دہلی جا رہی ہوں کہ یہ ہر روز کے آنے جانے والے مہمانوں سے کس صورت سے جان چھڑاؤں۔۔۔ سچ کہتی ہوں ٹاراجہ کہ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ گھر آئے کو اچھا کھانے کو نہ پوچھو تب بھی رسوائی۔۔۔ منع کرو۔۔۔ تب جگ بھنائی۔۔۔ میں تو سخت کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہوں۔ ہر روز نوٹ پر نوٹ بھنارہی ہوں۔“

ٹاراجہ کڑھ کر رہ گئے۔ اسی بات کا صدمہ تو ان کو بھی تھا۔ تاہم بھادرج کی تسلی کو کھلے دل سے بولے۔ ”ایسی کوئی مالی پریشانی ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔ خدا نخواستہ یہ نہ ہو کہ میری لاعلمی میں آپ لوگ کسی مالی پریشانی میں مبتلا رہیں اور مجھے معلوم ہی نہ ہو۔ ورنہ پھر حشر کے روز بھیا کو کیا منہ دکھائوں گا۔ میری عاقبت نہ بگاڑنا بھابی۔“

مالی ادا کا سن کر نانہہ بیگم کی چابھیں کھل گئیں۔ دیور کو وہ جو جتنا چاہا رہی تھیں،

بالآخر کامیاب ہو گئی تھیں۔

سو کھاسا منہ بنا کر بولیں۔ ”نہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ ویسے تو خدا کا لاکھ شکر ہے۔ ویسے۔ بڑا بول بھی نہیں بولتی۔۔۔ خدا نخواستہ۔۔۔ دشمنوں کے کان بہرے۔ برا وقت پڑا تو تمہارے در پر تہ جاؤں گی تو پھر کہاں جاؤں گی! آخر کو یہ معصوم بچے تمہارا ہی خون ہیں۔“

نثار احمد بے حد متاثر ہو کر بولے۔ ”میں اور میری چاروں اولادیں جان و دل سے حاضر رہیں گے آپ بے فکر رہیں۔“
نامہ بیگم ذرا ہی نہ کر بولیں۔ ”اے بھیا! ذرا کوئی ترکیب ہی بتاؤ ان آفت مارے مہمانوں سے جان چھڑانے کی۔ میں تو بیزار بیٹھی ہوں۔“

نثار احمد نے ایک خانے غور کیا پھر قدرے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ترکیب کیا ہو سکتی ہے! بس یہی کیجئے کہ ذرا حتی الامکان سب سے رکھائی سے پیش آئیے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کے آگے بچھے جائیے۔ آپ کی طبیعت یوں بھی بھیا کے بعد سے درست نہیں رہتی۔ کسی سے بھی زیادہ بولنے مت۔ جب زیادہ قابل توجہ نہیں جائیں گی تو خود بخود بھی بیزار ہو جائیں گے اور کو فٹ محسوس کرنے لگیں گے۔ دوسری ایک اہم بات یہ کہ از خود کسی کو کھانے پاناشے پر بھی روکنے ہی مت۔ اگر بہت ہی ضروری ہے تو چائے پائیاں شربت سے قواضع کر دیجئے۔ اگر یہ ہوتا ہے کہ عین کھانے پاناشے کے وقت آمو جو ہوتا ہے تو جو کچھ دسترخوان پر میسر ہے۔ اسی میں شامل کر لیجئے بطور خاص کچھ اہتمام کیجئے ہی مت۔ بس آپ کا رویہ خود بخود راستہ صاف کر رہتا ہے گا۔“

نثار احمد نے انہیں بھادو ج سمجھ کر چند سیدھی سی باتیں انہیں ذہن نشین کروائیں۔ مگر وہ دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

”کس قدر چالاک اور نقتے ہیں یہ نثار احمد۔۔۔ میرے رشتے داروں کی طرف سے ان کے دل میں کتنی کدورت اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ خیر۔۔۔ ذرا میرا کام نکل جائے پھر ان کا کانٹا بھی عمر بھر کے لئے نکالنا ہی پڑے گا۔ ان کا توڑ مجھ ہی کو کرنا پڑے گا۔“
مگر منہ میں گڑ بھر کر ملامت سے بولیں۔

”ہاں تم نے سچ کہا۔ اب ذرا سب سے بے رخی برت کر دیکھوں گی۔ اس طرح سے تو یہ لوگ باز آنے والوں میں سے نظر آتے نہیں۔“
نثار احمد چائے کا پیالہ خالی کر چکے تھے۔ نامہ بیگم نے اپنا بھاری بھر کم پاندان وہیں منگوا کر بطور خاص اپنے ہاتھ سے انہیں پان بنا کر پیش کیا۔

نثار احمد نے قاعدے کے مطابق سلام کر کے گوری کھٹے میں دہالی۔
اس لچھے دار گفتگو کے بعد نامہ بیگم نے انتہائی ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ اپنا پندیدہ اور ضروری ترین موضوع چھیڑ دیا۔

یعنی اسرار احمد کے فنڈ کی جمع شدہ رقم کی وصولیائی اور اس سلسلے میں حائل شدہ جو دشواری تھی، دیور سے اس پر اطمینان بخش گفتگو کی۔ اور بار بار اپنی موجودہ پریشانی اور مسائل کا حوالہ دے دے کر ان کا دم موم کرتی رہیں تاکہ وہ اس سلسلے میں جلد از جلد بھاگ دوڑ شروع کر دیں۔

نثار احمد ان کے ہاں سے رخصت ہوئے تو دل و دماغ پر ایک گونہ اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا۔



جس دن سے اسرار احمد کا انتقال ہوا تھا انہیں ایک ہی قرار نہ تھا۔ بھائی سے مستقل جدائی کا صدمہ تو اپنے مقام پر اٹل تھا ہی، مگر اپنی بھانج کے مزاج کو جانتے ہوئے انہیں ہر وقت یہ کھٹک ستاتی رہتی تھی کہ اب کیا ہو گا؟ انہیں پختہ یقین تھا کہ نامہ بیگم

ہر صورت میں مشکبار، دلاشاد اور شمشاد کو ان سے چھڑوا کر دم لیس گی۔ ان کی چھٹی جس ان کو بار بار تنبیہ کرتی تھی کہ غار! یاد رکھو! بھائی کے ساتھ بھیجتے بھی چھوٹ گئے۔۔۔ اور تم جو مشکبار کو بوہانے کے خواب دیکھا کرتے تھے تو اس کی تعبیر اب اسرار احمد کے ہاتھوں سے نکل کر، فقط نامہ بیگم کی ”ہاں“، ”نا“ تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

مگر ہوا یہ کہ رب تعالیٰ نے نہایت آسانی سے ان کے مسائل حل کر ڈالے تھے اور نامہ بیگم کا دل ان کی طرف سے انہیں آئینے کی طرف شفاف نظر آیا تھا۔
آج بھادرج سے رو برو بات چیت کرنے کے بعد ان کے دل و دماغ میں ریختے والے سارے اندیشے از خود بے بنیاد ہو گئے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اپنی زمینوں کی طرف جانے والے راستے نکلا آگئے اور پرسکون سوچوں میں غلغلاست قدموں سے ایک ہری بھری پلڈنڈی پہ چلنے لگے۔

آج بہت سارے چلتے بھلتے دنوں کے بعد یہ قدرے آسودہ سی گھڑیاں ان کے ارگند آن کھڑی ہوئی تھیں اور وہ ان کے پل پل سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ بار بار خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ آج ان کی روح میں گڑا کا ناگل گیا تھا۔ اور جتنی جتنیوں کا طرف سے قدرے سکون نصیب ہوا تھا اور نہ وہ اب تک جانے کیا کیا سوچا کرتے تھے۔ گھر بیٹھے بیٹھے بالآخر وہ پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ اب وہ کل سے اسرار احمد کی رائے کے لئے دوڑ دو سو شروع کر دیں گے اور پوری دیانت داری کے ساتھ بیوہ بھادرج ساتھ دیں گے۔

پھر یہی ہوا بھی۔۔۔

نثار احمد نے اگلے روز سے ہی فنڈ کی رقم کے لئے کوشش شروع کر دی۔

وقت دھمے دھمے ست رفتاری سے گزرنا لگا۔

اچانک ایک زبردست دھماکا ہوا۔

دھماکا بھی ایسا کہ جس کسی نے بھی حیرانہ لگی سے دانتوں تلے انگلیاں داب کر رہ گیا۔ بہت سوں کو تو یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

جس نے بھی سنا، بے ساختہ کہا ”کمال کر دیا نامہ بیگم نے۔۔۔۔۔“

”غضب ہو گیا۔۔۔۔۔ ایسا تو کیسے دیکھنا سنا۔۔۔۔۔“

مگر خود نامہ بیگم کے کانوں پر جوں بھی نہ ریختی۔ انہوں نے انتہائی بے پروائی سے ایک کان سے سننا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ انہیں بھلا کس کی پروا تھی! اگر پروا ہوتی تو عقلمند اور سمجھ دار ہوتے ہوئے ایسی اندھی اور غیر واجب حرکت ہی کیوں کر کرتیں!!
لیکن۔۔۔۔۔ درحقیقت یہ بھی نامہ بیگم کی سیاسی فطرت کا ایک معمولی سا کرشمہ تھا۔ اور وہ ظاہر ہے کہ اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔

انہیں خرچ کی یوں بھی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ اسرار احمد اپنے وقت کے ایک آسودہ حال شخص تھے مگر میں ہر طرح خوشحالی تھی، انہیں کچھ ایسی الجھن ہی رہتی تھی کہ سال سال بھر کا تاج، غلہ، دالیں اور دھان وغیرہ اپنے بھائی سے ہر فصل پر خرید کر

گھر میں جمع کر دیتے ان کا اسٹور ہر وقت ضرورت کی ہر شے سے بھر رہا ہوتا۔

ماہانہ آمدنی کے علاوہ انہوں نے نثار احمد کے اصرار پر دو آموں کے باغ بھی ایک دف خرید ڈالے تھے۔ ان کی سالانہ آمدنی بھی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔

خود نائمہ بیگم کے پاس تو عمدہ عمدہ کپڑے لتوں کے علاوہ کئی تولے سونے کے زیورات اور چاندی تو شاید سیروں کے حساب سے تھی کیونکہ یہ زیورات انہیں شادی کے موقع پر سیکے اور سسرال دونوں اطراف سے چڑھے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ مشکبہار تک کو اسرار احمد نے کئی بیماری بھاری زیور بنا کر دے رکھے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے مالی حالات بہت مستحکم اور مضبوط تھے اچھا وقت تھا اور سستا زمانہ۔۔۔ نائمہ بیگم اگر گھٹراپے سے چلتیں اور کچھ دور اندیشی سے کام لیتیں تو یقیناً ان کی ساکھ بھی نہ جھڑکتی اور بچے بھی آرام سے پرورش پا جاتے۔۔۔

لیکن اگر عورت فطری طور سے ہی ناعاقبت اندیش ہو تو کیا کیا جائے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ نائمہ بیگم انتہائی شوقین مزاج، ملندار اور گھونے پھرنے کی رسیا تھیں۔ اسرار احمد کی زندگی سے ہی ان کا معمول تھا کہ اپنی چند خاص قسم کی سہیلیوں کے ساتھ اوپر اوپر گھومنا نمائش اور میلوں ٹیلیوں کی سیر کرنا ان کا سب سے بڑا شوق تھا، بزرگوں کے عرس میں شریک ہونا، قوالیاں سننا اور سر دھننا ان کا اہم ترین مشغول تھا۔ کھڑک کو کئی عرس ان کی شمولیت سے خالی نہ رہتا تھا۔

چونکہ شادی کے بعد سسرال وغیرہ میں رہنا اور وہاں کی بندشوں یا اصولوں کی پابندی کرنا ان کے حصے میں نہیں آتی تھی، اوپر سے اسرار احمد کا نرم اور ملائم رویہ۔ چنانچہ ان کی عادت میں شامل فطری آزادی، ضد اور من مانی کا جذبہ جوں کا توں موجود تھا۔ میکے کا ساتھ چھوٹا نہیں تھا میکے کی سہیلیاں کیسے چھوٹی تھیں! حسن اتفاق سے اکثریت ان کی تھی، جو ان کے ارد گرد اسی محلے میں آباد تھیں۔ خالہ زاد بھولی نہیں بھی انہی کی

ہم مذاق اور ہم نوالہ وہم بیالہ تھیں۔ نیز یہ ٹھہریں سہیلی باز اور کھلے دل کی مالک، اگر کبھی کسی سہیلی کے پاس چیسوں وغیرہ کی کمی دیکھی تو بلا تکلف پوری کر دی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

اس طرح یہ چھ سات ہم سن، ہم مذاق، ہم مزاج اور ہم شغل سہیلیاں ہر میلے ٹھیلے اور عرس میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتیں۔ کاجل، مسمی، کپڑے لٹے اور زیور پہنے خوب بن ٹھن کر جاتیں۔

نائمہ بیگم قوالی سننے کی بہت زیادہ شوقین تھیں۔ قوالی سننے سننے ان پر ”حال“ طاری ہو جاتا تو دنیا دانیہا سے بے خبر ہو جاتیں ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی سخاوت قوالوں پر سکون اور لوٹوں کی بارش کو راتی رہتی۔ جب کبھی کسی ایسی محفل میں جانا ہوتا تو ان کی والدہ کے اشارے پر ان کا ہونہ کچھ خالی رکھا جاتا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ ان کے خاندان میں بہت مشہور ہوا تھا اور دیکھنے سننے والے دنگ رہ گئے تھے۔

ہوایا کہ ایک دفعہ خاص ان کی خالہ کے ہاں محفل قوالی کا اہتمام ہوا۔ نائمہ بیگم کا ذوق و شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حالانکہ یہ محفل رات کی تھی۔ مگر انہیں سر شام ہی سے بے چینی اور بے تابلی نے آن گھیرا تھا۔ اس شام انہوں نے بہت پہلے کھانا وغیرہ تیار کر لیا، بچوں کو نیند! حلا کر صاف سترہ کیا اور میاں کا انتظار کئے بغیر ہی کہ وہ کب دیوٹی سے لوٹیں خود سولہ گھنٹہ کر کے بڑے اہتمام سے اپنی اماں کے ہاں پہنچ گئیں۔

یہاں بھی سب خالہ بی کے ہاں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں جن کا بڑا سا گھرا سی محلے کے کھڑ پر تھا۔

رات گئے اس محفل کا آغاز ہوا۔

قوال بہت مشہور و معروف تھے۔ یہ ان کی شہرت ہی کا نتیجہ تھا کہ خالہ کا کشادہ

آگنِ قوٰلی سننے والے شائقین سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا جن کے بچوں بیچ قوالوں کے لئے سفید براق چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں۔

اتنے ریش کو دیکھتے ہوئے گھر کے مردوں نے خواتین اور بچیوں کے لئے عین سامنے والے کمروں کی چھت پر انتظام کر دیئے تھے۔ اس لئے کہ خواتین کا پردہ بھی قائم رہے اور وہ باقاعدہ قوالی دیکھ اور سن بھی سکیں، انہوں نے چھت پر قدرے پیچھے کوسر کا سر کا کر چار پائیں کھڑی کر دی تھیں جن کی آڑے نیچے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

نیچے تو خیر روشنیوں کا انتظام تھا ہی، مگر چھت کا منظر اور بھی زیادہ اجلا اور دلنریب لگ رہا تھا۔ درمیان تاریکوں کا چاندنیچ آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا جس کے ارد گرد لاکھوں ستاروں کے رو پہلے کھڑے جنگ جگمگ کر رہے تھے۔ رات کو چلنے والے ہوا کے جھوکے سرشاری اور سرمستی کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اجلی اجلی شفاف چاندنی کی لہروں میں نت نئے کپڑے پہنے رنگ برنگے دوپٹے ڈالے لڑکیاں اور بڑی عمر کی خواتین خوب جج رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں، لڑکیوں کو زور سے جوتے اور ٹھٹھا لگانے پر بار بار تنبیہ کر رہی تھیں۔

انہی سب میں نامہ نگار بھی خوب عمدہ ساری باندھے، خوب بنی ٹھنی، بالوں او کھانیوں میں موتیا کے گھرے سجائے ایک طرف کو بیٹھی نیچے جھانک رہی تھیں۔

وہ پہلی قوالی پر ہی جھوم اٹھیں ویسے بھی وہ واقعی پائے کے قوال تھے۔ رات ساٹھ بجے ان کے ہار مومیم وغیرہ کی مدھم مدھم لگنے لگی۔ اور پروکار لگنے لفظ، ادائیگی اور الفاظ کی موسیقیت سے جی سنواری پر سوز آواز۔ سننے والے حقیقت چھٹی سانس لینا بھول گئے تھے۔

نیچر دوسری ہی قوالی پر نامہ نگار پر مدھم کی کسی کیفیت طاری ہو گئی۔

— یہ قوالی ابھی درمیانے بند تک پہنچی تھی کہ انہوں نے بے ساختہ — ”وہ

واہ..... سبحان اللہ“ کے نعرے کے ساتھ گریبان میں ہاتھ ڈالا اور پورے کا پورا بڑھ نکال کر بغیر سوچے سمجھے نیچے پھینک دیا۔

جب تک کہ ان کے برابر بیٹھنے والی چوک کر انہیں منع کرتیں، اچھا خاصا خونریز بڑھ ”دھپ“ کی آواز کے ساتھ سب سے آگے بیٹھے ہوئے قوال کے سامنے گرا۔ وہ چوک کر سامنے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے دیکھنے اور چوکنے پر بہت سی لڑکیاں اس کی نظروں کا تعاقب کرنے لگیں۔ کچھ لوگ حیرت اور تعجب سے سفید چاندنی پر پڑے ہوئے کو گھورنے لگے۔ لیکن قوالی برابر جاری رہی۔

اوپر نامہ نگار بیگم ہوش و حواس سے ریگانی ہوئی جاری تھیں۔ قوالی ختم ہونے تک انہوں نے ارد گرد کی کئی جانے والیوں سے احوار رو پے لے لے کر نیچے پھینک ڈالے۔ نیچے مردوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور اوپر خواتین میں بھی دھیمی دھیمی سرگوشیاں اور کھسک پھسک شروع ہو گئی تھی۔ بڑی بوڑھیوں نے اندر ہی اندر نامہ نگار کو سرزنش کرنا چاہتی۔ مگر وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھیں۔

بالآخر ان کی ایک جہانمیدہ چچی نے سب خواتین کو پچکے پچکے منع کر دیا کہ اس سر بھری کو کوئی بطور قرض ایک پیسہ بھی نہ دے۔ تاکہ نہ ہوں اور نہ یہ نیچے پھینک سکیں۔ چند منٹ سکون رہا۔

رات کافی بھیک چکی تھی۔ آسمانوں سے شبنم گرنے لگی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جوں جوں رات بھیک رہی تھی قوالوں کا جوش و خروش بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک سے ایک ٹاپ کی اور عمدہ سے عمدہ قوالیاں نکال رہے تھے۔ سب دم بخود بیٹھے تھے۔ نامہ نگار کے پاس اب پیسے تھے نہ کوئی دے رہا تھا۔ اس لئے وہ بھی ہاتھ روکے خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی چچی بھی اپنی ترکیب سے مطمئن ہو کر نیچے متوجہ ہو گئیں۔

اچانک قوالوں نے ایک مشہور معروف قوال شروع کی۔

اس قوال پر خود نام نہ بیگم بھی غار تھیں۔ جس کسی محفل میں بھی انہیں موقوف ملتا..... وہ سب سے پہلے یہی قوال اٹھاتی تھیں۔ خود بھی بہت خوش گو تھیں۔ یہ قوال شروع ہوئی تو وہ سچ اپنے آپ میں نہ رہیں۔ مگر قوالوں کو نذرانہ پیش کرنے کے لئے اب کچھ نہ تھا۔

انہوں نے بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر لگا دیں دوڑائیں۔ منہی مشکباران کے قریب ہی لیٹی بچپن کی منہی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ گلے سے اس کا سرخ بھلا لچکے والا دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔

انہوں نے آؤ دیکھنا تاؤ۔ اس کی گدن سے دوپٹہ نوچ، گول مول کر کے یہ پچھلے۔

قوال اس وقت بہترین موڈ میں تھی۔ ساز اور آواز کے ساتھ ساتھ شاعر کا اصل مفہوم عروج کو چھو چکا تھا۔ نام نہ بیگم پر طاری جنوں کی سی کیفیت تھی عروج کا پہنچ گئی۔ وہ کہاں ہیں، اور کیا کر رہی ہیں؟ سب سوال مٹ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ اک وجد کے سے عالم میں سچ جھپٹ پر بکھر گئیں۔۔۔ بھرا انھیں۔۔۔ ہال بکھریا چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔۔۔ ان کی چچی سب کو سمجھا رہی تھیں۔

”ارے حال اچھا نمی کو۔۔۔ حال بھیل رہی ہے۔۔۔“

اور وہ بے چارے قوالی چھوڑ کر ”اماں ہائیں..... اماں ہائیں..... اماں ہائیں“ چلاتے ہوئے نشست چھوڑ کر اٹھ بھاگے۔

تھوڑی دیر کے لئے ایک پر شور بنگامہ ساچ گیا۔

اس اچانک افتاد اور افراقی میں ساری محفل ہی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ نام نہ بیگم کو تو کسی نہ کسی صورت گھر پہنچا دیا گیا مگر قوال میاں کو بمشکل تمام خالہ بی

بڑے لڑکوں نے رام کیا..... وہ بار بار پیشانی کا پسینہ پونٹھتے اور یہی کہتے۔۔۔ اماں ہم سبھی کسی چیز میں یا جھتی نے ہم پر بھلا چھ لگا دی ہے۔“

وہی نام نہ بیگم جو ہمیشہ سے اپنی من مانی کرنے کی عادی تھیں، اب جبکہ شوہر کا سایہ بھی سر سے اٹھ چکا تھا، جو کچھ نہ کر گزرتیں کم تھا۔

لکھنؤ کا مشہور معروف عرس بھرا۔

وہ ہر سال بے حد پابندی اور ذوق و شوق سے ان بزرگ کے عرس میں ضرور شریک ہوتی تھیں۔ بھلا اس برس کیوں نہ ہوتیں۔

عرس کے دنوں میں تو ان کی بوٹی بوٹی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ انہوں نے چپ چاپ اپنی عدت توڑ دی۔

جس جس نے سنا، تعجب کی شدت سے دانتوں میں انگلی داب کر رہ گیا۔ ان کی اماں نے بچا سوں صلواتیں سنا کر رکھ دیں، چچی، تائیوں، خالہ نے خوب خوب لعن طعن کی۔ برا بھلا کہا، وہ سب کی سنا لیں۔ مگر کیا وہی جو من میں سہا چکی تھی۔ لیکن جب وہ عرس میں پہنچنے کی تیاریوں میں مصروف تھیں تو برقعہ اوڑھے ان کی ضعیف والدہ گھر آ پہنچیں اور برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ انہیں کوٹنے دیئے لگیں۔

”اماں! آپ بیکار ہمیں برا بھلا کہہ رہیں ہیں اور اپنا خون الگ جلا رہی ہیں۔ سوچئے بھلا ہم کسی برے کام میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ ذرا بابا صاحب کے عرس ہی میں تو جا رہے ہیں۔ یہ تو اور بھی ثواب کا کام ہے۔“



باوجود باقاعدہ پنے رنج و افسوس کا اظہار کیا۔ ثار احمد کے ساتھ بعدزدی اور خلوص سے پیش آیا۔ سارے کاغذات خود چیتھ کر چیک کئے۔ مکمل کروائے اور ایک کاغذ پر دستخط کر کے ثار احمد کے حوالے کیا اور کہا،

”آج کے بعد پرسوں کی تاریخ میں آئیے۔ دن کے دس بجے آپ کو اسرار احمد کے فنڈ کی رقم یکشت ادا کر دی جائے گی، مگر۔۔۔ یہ رقم اسرار احمد کی بیوہ وصول کر سکے گی۔ اسے ساتھ لے کر آئیے۔“

ثار احمد کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔

غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

آج مرحوم بھائی کی محنت و مشقت کا صلہ ایک کاغذ کی صورت میں ان کی منہی میں دبا تھا۔

ایک طرف بڑی بھادج سے کئے ہوئے وعدے کو ایفا کرنے کی خوشی تھی تو دوسری جانب محبوب بھائی سے جدائی کا غم ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ اجاگر ہو گیا تھا۔ وہ اسی عالم میں سر جھکائے ہوئے مرحوم بھائی کے گھر کی طرف ہوئے۔ تاکہ بھادج کو سب بتا کر پرسوں صبح تیار رہنے کا کہہ آئیں۔

گھر سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا باغچہ تھا۔ یہاں پر بہت سے پھلدار درخت اور خوبصورت پھولوں کے پودے لگے تھے۔ کئی درختوں پر اونچے اونچے جمولے پڑے تھے۔ اس باغیچے میں شام کے وقت آس پاس کے بچوں کا اڑدھام ہوتا تھا کوئی جمبولا جمول رہا ہے۔ کوئی کھیل رہا ہے کوئی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کوئی پھل کھا رہا ہے۔ بہت سے بچوں کی پسندیدہ چیزیں فروخت کرنے والے بھی آج جمع ہوئے۔ مگر اس وقت دوپہر کا سناٹا ہونے کی وجہ سے یہ باغیچہ سنسان نظر آ رہا تھا۔ ہر جمبولا خالی پڑا تھا۔

ساون کے ہریالے دن تھے۔۔۔ سارا سارا دن بادل چھائے رہتے۔ کوئی کالی سیاہ نکڑی آتی اور دھواں دھار برستی ہوئی گزر جاتی۔

ہر طرف ہریالی ہی ہریالی، سبز وہی سبز وہ کھائی پڑتا تھا۔

ثار احمد اس روز بھی اسرار احمد کے دفتر گئے ہوئے تھے۔ آج ہی بالکل خلاف توقع اور اچانک کام بن گیا۔

اسرار احمد کے فنڈ کی رقم جس کے لئے چکر پر چکر لگا کر وہ تھک چکے تھے اور تقریباً بالواسطہ ہو گئے تھے، غیر متوقع طور پر مسئلہ حل ہو گیا۔ اس گھمے کا بڑا چیفہ اچانک دورے پر آ نکلا۔۔۔ ثار احمد جو ہر روز کی بھاگ دوڑ سے عاجز آچکے تھے اور آہ چڑ کر دل ہی دل میں طے کر چکے تھے کہ آج کام ہو گیا تو تھمک، ورنہ بھائی کو اب صاف جواب دے دیں گے۔ سیدہ اس آنے والے افسر کے سامنے حاضر ہوئے اور تمام کاغذات سمیت سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر ڈالا۔

اتفاق سے یہ یہ افسر اسرار احمد کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور ان کے اچھے اخلاق، بہتر کام اور دیانتداری کا بہت معترف تھا اور ان کی ذاتی صلاحیتوں کو بہت سزا جتا رہا تھا۔ اسرار احمد کے انتقال کی خبر سے اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے اپنی بڑائی

کی طرف انگلی کر کر کے روئے جا رہا تھا اور سبک سبک کر پکار رہا تھا۔ ”ابا۔۔۔ ابا۔۔۔“
 مبلے ابا میاں۔۔۔۔۔“

دلشاد بڑا ششاد گھاس پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

”مشکبار۔۔۔ میری مظلوم بچی۔۔۔!“

بچا کے منہ سے بھتیجی کا نام جی جن بن کر نکلا۔۔۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے لپکے اور جلدی سے تینوں یتیم بچوں کو اپنے کچھلے سے چنایا۔
 مشکبار جو چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی، بچا کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور
 دلشاد ایک دم خند چھوڑ کر سہم سا گیا اور ان کے ساتھ لپٹ گیا۔

نثار احمد کا دل اس وقت قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ رنج و تاسف کی شدت سے قوی
 لرز لرز جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر قبل انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان تینوں کو سہرا
 روٹے جلتے ہوئے پائیں گے وہ بھی اتنی دوپہر کو۔۔۔۔۔ سنان مقام پر۔۔۔۔۔! انہیں رورہ
 کر نامہ بیگم کی غفلت اور بے پروائی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آئے جا رہا تھا کہ
 انہوں نے بچوں کو اس وقت آخر گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا!

مشکبار نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی میاں! یہ دلشاد ہم کو چین نہیں لینے دیتا۔
 ہر وقت کہتا ہے، ہیس ابا میاں کے پاس لے کر چلو۔ آج تو اس نے بہت ضد کی۔“

نثار احمد کے دل پر چوٹ سی گئی۔ ضبط کر کے بولے ”تو اپنی اماں کو دے دیتیں۔ وہ
 خود ہی بہلا لیتیں۔ بچے خند کر جاتے ہیں۔“

مشکبار دھیرے سے بولی ”نہیں بچا! یہ تو ہر روز ضد کرتا ہے۔ جھگڑا کر اماں کہہ
 دیتی ہیں کہ جاب۔ باہر لے جا کر بہلا لاؤ۔“



گو کہ یہ برسات کی دوپہر تھی۔ دھوپ اور گرمی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لیکن بچے
 شاید اپنی ماؤں کے ڈر و خوف سے گھر میں قید یا سورہے تھے، یا پھر شام ہونے کا انتظار کر
 رہے تھے۔ بچوں سے خالی خالی باغیچہ اس وقت اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بس آم کے بیڑ
 میں چھپی کوئی پوری قوت سے ”کو کے“ جا رہی تھی۔

نثار احمد سر جھکائے، اپنی سوچوں میں ’مستغرق‘ دھیرے دھیرے پلے آرہے تھے۔
 دفعتاً ایک ہلکی سی سسکی سن کر ان کے قدم آپ ہی آپ ختم گئے اور وہ چونکے ہو کر
 چاروں طرف دیکھنے لگے۔

ابھی وہ ہر طرف غور غور سے دیکھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ وہی دنگدازی
 آواز پھر سنائی دی۔ کوئی لڑکی دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ضد نہیں کرتے بھیا! دیکھو میں اتنی دوپہر میں تمہیں لے کر باہر آئی
 ہوں۔ اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میری بات مان لو۔ انہیں آئیں گے،
 نہیں آئیں گے۔ وہ ہم سب کو چھوڑ کر بہت دور چلے گئے ہیں۔ اماں کہتی ہیں وہاں سے
 کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ دیکھو ششاد بھی تو چپ ہے!“

نثار احمد کے بدن میں جیسے برق کو نہ گئی۔

حساس دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔

گھائل روح میں جیسے ایک ساتھ سینکڑوں پھید ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے لئے تو جیسے کسی نے ان کی چٹائی ہی چھین لی۔ ناگئیں مظلوم ہو گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اندھوں و خندوں کی طرح سامنے کی طرف لپکے۔

اپنی معصوم اور یتیم بھتیجی کی آواز تو وہ ہزاروں کے مبلے میں پہچان لیتے۔

یہاں ہر گلد کے ایک بلند و بالا درخت کے نیچے ہری ہری گھاس پر مشکبار ننھے
 دلشاد کو کا نہ دھسے لگائے تھپک تھپک کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو راستے

چچا کو دیکھ کر شمشاد بھی ہنسا رہا تھا جلدی سے تھلا کر بولا ”چچا میاں! ہم لو زائد (روزانہ) نہیں پر آ کے اپنے ابا میاں کا راستہ دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لئے اچھی اچھی چیزیں لایا کرتے تھے۔ مجھے اور بھیا کو گود میں اٹھا لیتے تھے اور کھلونے دیتے تھے۔ آپا کیلئے بھی بہت ساری چیزیں لاتے تھے مگر اب پتہ نہیں کیوں نہیں آتے؟ ہم اب بھی آپا کے ساتھ آکر روز راستہ دیکھتے ہیں۔ چچا میاں..... چچا میاں..... اماں ہیں نا اماں! وہ کہتی ہیں کہ تمہارے ابا میاں تم سے خفا ہو کر..... مر گئے ہیں.....“

مشکار نے ایک ہلکی سی چیخ مار کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

نثار احمد غم غصے کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

ایک طرف بیٹھے کی معصوم معصوم باتوں سے جگر پھٹا جاتا تھا، دوسری طرف بھادوچ کی بے حسی پر غصہ آئے جا رہا تھا۔

انہوں نے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے شمشاد کی انگلی پکڑی اور گھر کی طرف مڑتے ہوئے بھرائی بھرائی سی آواز میں بولے۔ ”اچھا چلو اب گھر چلتے ہیں میں یہ قصہ ہی ختم کر دوں گا۔ ابھی بھابی سے چل کر بات کرتا ہوں۔۔۔۔۔ تم کو اپنے ساتھ گاؤں ہی لے جاؤں گا۔“

ان کے کڑے کڑے تیوروں اور سخت لہجے سے مشکار سہم سی گئی تھی۔ وہ ان کو کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن بتاتے ہوئے ذوق بھی تھی۔

مگر جب چلتے چلتے وہ گلی کی کڑتیک آگئے تو چھبکتی ہوئی کہہ ہی گزری۔ ”وہ۔۔۔۔۔ چچ میاں..... اماں گھر میں نہیں ہیں۔“

نثار احمد پلٹ کر رگ گئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔ ”گھر پر نہیں ہیں اکیوں!! کہاں گئیں؟“

مشکار جواب دینے کے بجائے غٹکین سی سر جھکائے کھڑی رہی۔

نثار احمد نے اس کا جھکا ہوا سر ہلا کر بے چینی کے عالم میں دریافت کیا۔ ”کیوں بیٹا بولتی کیوں نہیں۔ کہاں گئیں تمہاری اماں! مانی کے گھر گئی ہیں کیا؟“

اس نے بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ مانی کے گھر تو نہیں۔ وہ تو کھنڈوالے بابا کے عرس میں گئی ہیں۔“

”عرس میں!“ نثار احمد کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے۔ ہلکا سا جھنجھکی کی صورت بننے لگے۔

مشکار بچروں کی طرح گردن ڈالے کھڑی تھی۔

اچانک کسی خیال سے چونک کر نثار احمد نے جھر جھری لی اور مشکار و شمشاد کی طرف دیکھ بغیر تیز قدموں سے نائے بیگم کے میکے کی طرف چل دیئے۔

دونوں بچے بھی ان کے پیچھے لپکے۔

یہاں نائے بیگم کے میکے میں بھی یہی موضوع چھڑا ہوا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل نائے بیگم اپنی مخصوص بھولیوں کے ساتھ عرس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئی تھیں۔ ان کا یکہ رخصت ہوتے ہی چند مزے لینے والی محلے پڑوس کی بیبیاں ان کی اماں کے ہاں جمع ہو کر اپنے اپنے انداز میں اظہار کر رہی تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی کی بیوی سب کے درمیان میٹھی ایک ایک کی صورت دیکھ رہی تھی۔

اماں سب سے الگ تھلگ برآمدے کے تخت پر منہ پٹینے لپٹی تھیں۔ وہ پرانے زمانے اور خالص پرانے خیالات کی انسان تھیں۔ انتہائی بردبار، دور اندیش اور سمجھ دار۔۔۔۔۔ اپنی بیٹی سے قطعی مختلف اور علیحدہ خیالات کی مالک۔ ان کی اکثر رشتے دار خواتین تو بر ملا کہا کرتی تھیں کہ نائے تو کسی طرف سے بھی بانو بیگم کے پیٹ کی پیدا نظر نہیں آتیں۔ ویسے اس حقیقت سے کبھی آگاہ تھے کہ نائے بیگم کو بچاڑنے میں ان کے والد کا ہاتھ تھا، جو بیٹی کو حد سے زیادہ چاہتے تھے اور اپنی زندگی میں کبھی بیوی کو نیز ہی آنکھ سے بھی بیٹی کو دیکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ بانو بیگم ان کی بے جا حمایت پر دل ہی دل

میں کڑھ کڑھ کر وہ جاتیں مگر میاں کے سامنے بول بھی نہ سکتی تھیں۔ چپ چاپ لڑکی کو گھڑتے ہوئے دیکھتی رہیں اور بالآخر..... ایک وقت ایسا آیا کہ نامہ بیگم ناک پر کبھی کا بیٹھنا بھی گوارا نہ کر پاتی تھیں یہی وہ وقت تھا جب بار بار پریشان ہو ہو کر بانو بیگم نے اکیلے میں سوچا کہ اے کاش! اب اس حرافہ کے باوا زندہ ہوتے تو صاحبزادی کے کر توت دیکھ دیکھ کر سر پر ہاتھ رکھ کے روتے۔ شادی کرتی ہی گور میں جاسوئے۔

نثار احمد تیزی سے چلتے ہوئے سیدھے برآمدے میں ر کے اور دلشاد کو جو ان کے شانے سے گئے گئے سو گیا تھا۔ تخت پر لٹاتے ہوئے زور سے بولے۔

”چیٹی لایہ میں کیا سن رہا ہوں! کیا واقعی نامہ بھائی عرس دیکھنے گئی ہیں؟“

بانو بیگم ان کی آواز سن کر ہڑبوا کر اٹھ بیٹھیں اور آنکھیں ملنے لگیں۔

نثار احمد کو دیکھ کر آنگن میں بیٹھی پڑوسنیں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ بہو بیگم اٹھ کر برآمدہ میں آگئیں۔

بانو بیگم نے ابھی تک نثار احمد کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ پاندان کھولی کر پان بنانے لگی تھیں۔ چہرے کی رگمت جھپکی پڑی ہوئی تھی۔

پان بنا کر انہوں نے خود کھایا دوسرا نثار احمد کو دیا۔ پھر سوئے ہوئے دلشاد کو تھپکنے ہوئے بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

”تم نے جو کچھ نثار سمجھا ہی سنا ہے۔ حقیقت میں نامہ نے عدت توڑ دی ہے اور عرس میں گئی ہے۔ بھئی وہ ہمیشہ کی باغی ہے۔“

نثار احمد شانے میں آگئے۔

وہ سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے بچی کے سننے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ مگر اب بانو بیگم کی زبانی، عدت توڑ ڈالنے کا سن کر دنگ رہ گئے۔ حیرت اور پشیمانی سے ان کی پیشا عرق آلود ہو گئی۔ گردن آپ ہی آپ جھک گئی۔

آگے کچھ دریافت کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی! بھائی کی بیوی قسمت اور بھادوچ کی سنگدل دیوے سی پران کے احساسات جیسے یکجہت مردہ ہو کر رہ گئے۔ جس عورت نے ایک ہر دل عزیز شوہر کے انتقال پر عدت کا نانا بھی گوارا نہ کی ہو، اس سے آئندہ کے لئے کوئی توقعات وابستہ رکھی جاسکتی تھیں۔

ان کا دل ایک دم ہی نامہ بیگم کی طرف سے پھٹ گیا تھا اور اب وہ ان کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ رہے تھے۔ ان کی طرف سے سارے خیالات اور احساسات پر آئندہ ہو چکے تھے۔ جتنا وہ انہیں قابل احترام اور ہمدردی و غمگساری کے لائق سمجھتے تھے، اتنے ہی وہ ان سے چڑاٹھے۔ طبیعت میں ایک دم ایسا ہال آیا کہ ان سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ بھلا تین بچوں کی اماں ہو کر بھی اپنی طبیعت اور شوق پر پہرہ نہ بٹھا سکیں۔ یہ تک نہ سوچا کہ دنیا اس کھلے ہندوں آزادی پر کیا کہے گی! عزیز واقارب کتنی باتیں بایں گئے، کون کسی کا منہ بند کر سکتا ہے!

بہت دیر تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور کسی سے نظر ملائے بغیر دھیسے اور دکھی لہجے میں بولے۔

”اچھا چیٹی بی! اب میں چتا ہوں۔ بھائی صاحبہ کو یہ بتانے آیا تھا کہ پرسوں ان کے نذری رقم ملنے کو ہے میں نے سب کا نقدات وغیرہ مکمل کر والے ہیں۔ چیٹی بی! آیا تو میں آپ کی طرف اس مقصد کے لئے تھا کہ عدت کے دن تو جی پورے ہوئے نہیں ہیں، بھائی کو دفتر تک کس طرح لے جا کر حاضر کرایا جائے۔ سوچا تھا آپ لوگوں سے اس سلسلے میں مشورہ لوں گا۔ مگر اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا اور انہوں نے از خود عدت توڑ دی ہے۔ لہذا آپ انہیں بتا دیجئے گا کہ پرسوں تیار رہیں۔ میں دس بجے سے پہلے انہیں لینے آؤں گا تاکہ اپنا وعدہ پورا کر سکوں۔“

وہ بولتے بولتے رک گئے پھر ایک مہرا سانس لے کر کہنے لگے۔۔۔

اف تک نہ نکلی۔ وہ خود بہت شرمسار اور قائل ہو رہی تھیں۔

مگر نامہ بیگم کی بھانج، نثار احمد کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ذہن نشین کرتی جا رہی تھیں۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد نثار احمد کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر تیز قدموں سے چلے ہوئے گھر کے کچلے دروازے سے باہر نکل گئے۔ نہ کسی نے انہیں روکا نہ انہوں نے مزید رکنا گوارا کیا۔



شام خوب گہری ہو چکی تھی۔

ساوان کے جھونکے صبح کے مقابلے میں زیادہ بوجھل اور سنساک ہو رہے تھے۔ کالی کالی گھنگھور گھٹاؤں سے آسمان یہاں سے وہاں تک اٹ چکا تھا، تب نامہ بیگم اپنی بھویوں کے ساتھ عرس سے واپس لوٹیں۔

ایک انہوں نے اپنی والدہ کے بجائے۔ اپنے گھر کے دروازے پر روکیا اور چم چم پازیب بجاتی ہوئی اندر داخل ہو گئیں۔

ملازمہ نے روشنیاں جلا دی تھیں اور کھانا تیار کر کے انہی کا انتظار کر رہی تھی۔ باقی سارے گھر پر اداسی اور سناٹا طاری تھا۔ کسی بچے کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ معاف سنالے میں سارے دن کے بعد نامہ بیگم کو بچوں کی یاد نے آستیا۔

’اے یہ سب کدھر کو نکل گئے۔ شام تو خاصی گہری ہو چکی۔‘

انہوں نے قدرے بلبل کر دل ہی دل میں سوچا۔

بس یقیناً ہی ان کی سوچ الفاظ بن کر سوال میں ڈھل گئی، انہوں نے ملازمہ

سے پوچھا۔

’کیوں ری چھپا! یہ تیوں آفت کے پرکالے کدھر کو نکل گئے؟ تو نے خیال بھی نہیں کیا۔ اکیلی اکیلی بیٹھی کیا گھوم رہی ہے؟‘

’دوسری بات جو مجھے آپ کے گوش گزار کرنی ہے وہ یہ کہ میں ان بچوں کو یوں لاوارثوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ تیوں میرے مرحوم بھائی کی نشانیاں ہیں۔ اس وقت بھی یہ لوگ مجھے باغیچے میں روتے بھٹکتے لے ہیں کیا بھیا کی زندگی میں کبھی ایسا ہوا ہے۔ ذرا ان کی صورتیں اور چلنے دیکھئے! بھیکاریوں سے بھی بدتر ہو رہے ہیں۔ یہ سب کم از میری قوت برداشت سے باہر ہیں۔ میں یہ سمجھوں کہ باپ کی موت کے بعد بچے اماں کو بھاری ہو گئے ہیں اور وہ ان کو سنبھالنے اور پرورش کرنے سے قاصر ہیں! بھائی صاحبہ کا جو کچھ بھی جواب ہے وہ آپ مجھے ان سے معلوم کر کے بتائیے پھر میں چار آدمیوں کو اکٹھا کر کے فیصلہ کراؤں گا اور اپنے بھتیجے بھتیجی کا اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ کیونکہ میں ابھی زندہ ہوں میرے لڑکے زندہ ہیں۔ مگر اپنے خون، اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کو یوں تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ بہت دنوں سے بھائی صاحبہ کی بے حسی اور بے پروائی دیکھ رہا ہوں۔ بچوں سے اس قدر غفلت کہاں کا انصاف ہے؟ اور تو اور ایک شریف النفس اور خاندانی شخص کی بیوہ ہو کر ہوئے عدت کا عرصہ نہ گزار سکیں! ان کی اس حرکت سے ہم تو سر اٹھانے کے لائق نہیں رہے۔ ہمارے بھائی نے اپنی زندگی میں ان کے ساتھ کوئی زیادتی یا بے انصافی آتی تھی کہ بعد مرنے کے ان کی لاج بھی نہ رکھ سکیں! یہ ایک فوت شدہ شخص کی۔ حرمی نہیں تو اور کیا ہے؟ کہیں دنیا میں ایسا اندھیر دیکھنا سنا ہے؟

نثار احمد کو غصہ آیا تو آئے چلا گیا۔۔۔

وہ بولے تو بولے چلے گئے۔۔۔

شدید قسم کے غم و غصے میں انہیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ وہ اپنے سے بڑی چچی بی کو باقی سارے ہیں۔۔۔

چچی بی بے چاری تو کیا بولیں۔ سر جھکا کے چپ چاپ سنتی رہیں۔۔۔ زبان۔

چھینانے ادب سے جواب دیا۔

”جی وہ تو اپنی نانی اماں کے گھر ہیں سارا دن ہو گیا۔ دوپہر کو میں کھانے کے لئے جانا بھی گئی تھی مگر بڑی بیوی بیٹی نے کہہ دیا کہ تم جاؤ۔ ان تینوں کو ہمیں رہنے دو۔“
نانہ بیگم نے اس کی بات کچھ سنی کچھ ان سنی کر دی۔ کپڑے تبدیل کرنا ہوئے بولیں۔

”اچھا زیادہ بک بک نہ کرو۔ جلدی سے جا کر بچوں کو لے آ۔ پھر کھانا گرم کر کے۔ بھوک بڑے زوروں کی لگ آئی ہے۔“
و اس وقت بڑے موڈ میں تھیں۔ اور کچھ گنگنا تے ہوئے کپڑے تبدیل کئے چارہ تھیں۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر ایک ہاتھ سے بال سنواری ہوئی تخت پر آ بیٹھیں۔
اس وقت وہ خود بخود ترنگ میں آ رہی تھیں۔

دراصل کافی عرصے کے بعد گھر سے باہر نکل کر اپنے موڈ میں آئی تھیں۔ ۲
سے اسرار احمد کا انتقال ہوا تھا، گھر کے اندر سوائے رونے دھونے اور ہر لمحہ آ
بھرنے کے دوسرا کام نہ تھا۔ اگر وہ کسی وقت اپنے ذہن سے اس مہلک حادثے
سانچے کو نکالنا چاہتیں بھی تو دوسرے لوگ مرنے والے کی باتیں کر کر کے ان کا م
سکون غارت کرتے رہتے تھے۔ لیکن آج بہت سارے دنوں کے بعد انہیں آز
نصیب ہوئی تھی اور انہوں نے بھی کسی کے کہنے سننے کی پروا کے بغیر پورا پورا لطف
تھا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ عرس میں خوب خوب سیر پائے کئے تھے۔

ذرا دیر کے بعد باہر کا دروازہ کھلا۔ آگے آگے ان کی بھابی، مشکبار اور شمشا
انگلیاں پکڑے اور پیچھے چھمپا دلشاد کو گود میں سنبھالے داخل ہو گئیں۔

غیر متوقع طور پر بھادو کو دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھکا مگر بظاہر مسکرا کر بول
”اوہو..... آج تو شہزادی شاد، نو تقریف لائی ہیں۔ آئیے۔ آئیے۔۔۔ زہے نصیب

بھی۔ کیوں کہ آنا ہو گیا۔“

جواب شاد بانو بھی مسکرائی اور ان کے قریب بیٹھنے ہوئے اٹھلا کر بولی۔ ”اے لو.....
مذاق بھی خوب سوچتا ہے آپ۔ اور کچھ نہیں تو مجھ بے چاری کو پکڑ کے شہزادی ہی
بناؤ والا۔۔۔ واہ۔۔۔ چپدی۔۔۔ چپدی کا شور بہ۔“

”اور کہلات..... کہنا کوئی تم سے سیکھے۔“ نانہ بیگم اب بھی مذاق کے موڈ میں
تھیں۔

شاہ بانو شاید کچھ اور بھی بولتی مگر اسی اثناء میں چھینا نے دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا
اور نانہ بیگم نے ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے برابر بٹھالیا۔ سمجھ گئی تھیں کہ ساون کی اس
چراغی رات میں وہ کچھ کہنے ہی آئی تھی۔ ورنہ بچوں کو تو کبھی چھینا بھی لے آتی۔

ادھر کی کچھڑی پر نانہ بیگم دل و جان سے غذا تھیں اور اس وقت ادھر کی وال کی
کچھڑی، چٹنی، اچار اور خوشبوداریتے اصلی گھی کی لذت نے کھانے کا لطف دو بالا کر ڈالا اور
ادھر ادھر کی باتوں میں کھانا جاری رہا۔

چھینا کو ادھر کی کچھڑی کے سوا کچھ پکانا بھی نہ آتا تھا۔ ویسے سارے کام خوشی اسلوبی
سے کر لیتی۔ کھانا نانہ بیگم خود ہی پکایا کرتی تھیں۔

کھانے کے بعد شمشاد اور مشکبار چپ چاپ اپنے اپنے بستے پر چلے گئے اور یہ دونوں
نندہ بھانج تخت پر آئے سانسے مستعجل کر بیٹھ گئیں۔ نانہ بیگم نے پاندان سنبھال لیا۔

دو ایک پان چبانے کے بعد شاہ بانو نے..... دوپہر کو نثار احمد کے آنے، ان کے
نفسے ہونے اور بانو بیگم سے دو ٹوک بات کرنے کی تفصیل اصل سے بھی زیادہ خوب
نکس مرق لگا لگا کر بڑی مند کے کانوں میں اتار دی۔

حسب توقع نانہ بیگم ایک دم بھڑک اٹھیں۔ بل بھر میں آپے سے باہر ہو گئیں۔
انہوں نے زور سے پاندان کاڑھلکا بند کیا اور زہر خند ہو کر بولیں۔

”نثار احمد کو کیا حق پہنچتا ہے مجھ پر کتہ چینی کرنے کا وہ کون ہوتے ہیں میرے رویے پر چہ مگوئیاں اور بحث کرنے والے۔ تم نے ان سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا کہ ان سے میرا جو رشتہ ناتہ تھا وہ سب مرنے والے کے ساتھ ہی بیخود زمین ہو چکا۔ اب کوئی ناتہ اور تعلق باقی نہیں رہا۔ میں ان کی کچھ نہیں گنتی۔ ان کے بھائی مر گئے اور میں آزاد ہو گئی۔ اب بیکار کی دھونس بتانے کی کوشش نہ کریں میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔ چاہے عدت کروں یا نہ کروں اپنے اعمال مجھی کو دیکھنے ہیں۔ وہ دھونس ہمائیں جا کر ان یہ، جو ان کی اپنی ہوں۔ میرے قول و فعل سے ان کو کوئی سردکار نہیں ہوتا چاہئے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ بولینے و ڈور اصرار۔ ساری نوابی ناک کے راستے نکال ڈالوں گی۔ اور وہ میرے بچوں کو لے جانے والے کون ہوتے ہیں! کیا سرکار و دربار کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ایسا پھری میں گھسیٹوں گی اور اپیل کروں گی کہ دن دھارے سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں گے۔ مجھے سمجھ کیا رکھا ہے انہوں نے۔ امار کچھ بھول نہ پائی ہوں گی اور بھی شریہ ہو گئے ہوں گے۔ ہوئی تا میں ایسے وقت۔۔۔ کے جھاڑ کر رکھ دیتی۔ چلے ہیں میرے بچوں کو چھینے۔۔۔ ہاں جانتے ہیں ان کی سارا محبت اور الفت۔۔۔ مفت کے تین تین نوکر بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کو پرورش کے بجائے ہمارے آسموں کے باغ اور پیشن کار و پیہ ہضم کرنے کے چکر میں ہیں۔ میں ان کی پیالا کیوں اور مکار یوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ مگر میرا نام بھی آئندہ ہے۔۔۔ دماغ درست کر ڈالوں گی۔۔۔“

وہ بہت دیر تک غیظ و غضب میں مغمی رہی ہوئی پھنکارتی ہیں اور جانے کیا کیا بیکار رہیں۔ انہیں منع کرنے والا کون تھا!

شاہ بانو بے حد مطمئن انداز میں بیٹھی پان چباتی رہی۔

آسمان پر سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے جمع ہو گئے تھے۔ نناک ہوائیں بارش

پیغام دینے لگی تھیں ایسے میں نائندہ بیگم کا گرمی کھایا ہوا دماغ آسمان پر چڑھا ہوا تھا۔ اور جو منہ میں آ رہا تھا ایک فرارے کے ساتھ کہے جا رہی تھیں۔

کوئی دم جاتا تھا کہ بارش شروع ہونے والی تھی۔

شاہ بانو نے باہر جھانکتے ہوئے ایک دم ہول کر کہا۔ ”ارے آپا چھوڑیے۔۔۔ باقی باتیں کل سویرے ہو جائیں گی۔ اب میں تو گھر جاؤں گی۔ چل چھپا مجھے چھوڑ کر آ۔ بارش شروع ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ اور آپ کے بھیا بھی گھر آچکے ہوں گے پھر مجھ پر ٹھانوں گے۔“

نائندہ بیگم کوئی جواب دینا چاہتی تھیں کہ ایک دم بڑی بڑی بوندیں ٹپٹپ برس پڑیں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے مینہ نے زور پکڑ لیا اور دھواں دھار برسنے لگا، آسمان سے زمین کی طرف ایک تار سا بندھ گیا۔

شاہ بانو مجبوراً دوبارہ مینہ لگی اور بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگی۔

میں اسی وقت کسی نے باہر کے دروازے پر ہاتھ مارا ساتھ ہی کسی نے پکار کر کہا۔ ”ارے آپا جان جلدی سے دروازہ کھولئے۔ بیگم گیا میں تو سارے کا سارا۔“ شاہ بانو نند کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

نائندہ بیگم، بھائی کی آواز پہچان کر جلدی سے تخت پر کھڑی ہو گئیں اور چار کر بولیں۔ ”اے چھپیا مر دار آگ لگے تیری جوانی کو۔۔۔ سر شام سے ہی خند پھٹ پڑی کیا؟“ حایا میں بھر اور ایندہ گئیں۔ اے میں کبھی ہوں جلدی سے اٹھ بھاگ کر جا۔۔۔ دروازہ کھول بیگم گیا میرا میرن۔۔۔“



ان کی صلوٰتیں سنتے سنتے چھیا مردار آنکھیں ملتی ہوئی دوڑ کر کواڑ کھول چکی تھی۔ بارش کے پانی میں چھپاک چھپاک کرتے ہوئے ان کے بھائی ڈاکر حسین برآمدے تک آئے اور بیوی کو مخاطب کر کے بولے۔ ”جہاں بیٹھتی ہو جم کر رہ جاتی ہو۔ باتوں میں موقع محل بھی یاد نہیں رہتا۔ وہاں سے نئے نئے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ بمشکل اماں کے پاس سلا کر محترمہ کی سواری لینے خود حاضر ہوا ہوں۔ کچھ ہوش بھی ہے!“



شاہ بانو تو ہنس کر چپ رہی۔ لیکن نائے بیگم نزاک سے بول پڑیں۔ ”اے بیٹے نہ سلام نہ دعا۔ آتے ہی بیوی پر برس پڑے۔ صدر رحمت ہو تم پر بھی ڈاکر میاں۔۔۔ اے میرے پاس ہی تو بیٹھی ہیں شاہ بانو۔ کہیں خدا خواستہ گلی کو پے میں تو کھڑی نہیں۔۔۔“ ڈاکر حسین وہیں چارپائی پر بیٹھ گئے اور اپنے ہتھکے ہوئے کپڑوں پر اگلے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے قدرے مسکرا کر بولے۔ ”آپ اپنی سناپے آپا جان! آج کہاں کہاں کی میر کر آئیں۔ سناپے عرس میں گئی تھیں۔ اور یہ کیا غضب کیا آپ نے عدت توڑ ڈالی؟“

نائے بیگم براسامند بنا کر بولیں۔ ”میں نہیں مانتی یہ سب دنیا کی ڈھکوسلے بازگو ہے۔ اب کیا چارون کی زندگی میں دوسروں کی خاطر خود بھی مردہ بن جاؤ۔ ایک! ویسے ہی برسوں کا ساتھ جھوٹ جانے کا غم۔۔۔ جان لینے کو تو یہ ایک ہی صدمہ بہم ہے۔ اوپر سے گھر کے اندر قید ہو کر اور بھی جیتے جی گور کے اندر لٹ جاؤ یہ کہاں! دستور ہے بھلا۔“

ڈاکر حسین نے ہنس کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مزید جلتی پر تیل چھڑکا۔ ”نا سناپہ وہ آپ کے دیور صاحب بھی آج ہی تشریف لائے تھے چار آدمیوں کو جمع

کے فیصلے کی دھمکی دے کر گئے ہیں۔“

”اونہہ..... ایک دفعہ چھوڑ ہزار دفعہ آیا کریں۔“ انہوں نے بے پروائی اور بے نیازی سے جواب دیا۔ ”ان کی گیدڑ بھیکوں سے ڈرنا تو کان ہے۔ ذرا میرے سامنے تو آئیں۔۔۔ سارے کس ملن نکال ڈالے تو نام بدل دینا۔“ ڈاکر کو پھر ہنسی آگئی۔

وہ اپنی ہمیشہ سے کئی حصے چھوٹے ہونے کے باوجود بہت بے تکلف تھے۔ ان سے ہر طرح کی گفتگو کر لیتے تھے۔ نائے بیگم بھی بھائی سے بے اندازہ محبت کرتی تھیں۔ چپکے چپکے ہمیشہ پیہ کوڑی سے ان کی مٹھی گرم رکھتی تھیں۔

اس وقت بھی ڈاکر ان کو مسکے لگانے آئے تھے۔ بیوی کی زبانی انہیں بھی دن والے واقعہ کا علم ہو چکا تھا۔ اور جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ پرسوں نائے بیگم کو میاں کا چھوڑا ہوا فٹل ملے کہ وہ مزید چونکتے ہو گئے تھے اور بہن کو مکمل طور پر اپنے اختیار میں لینے کے پکر میں تھے۔ وہ دہلی طور پر یہی چاہ رہے تھے کہ کسی صورت نثار احمد کا کاٹنا ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹ جائے تو وہ بھی اچھی طرح بہتے دریا میں ہاتھ دھو سکیں۔

یہی سب سوچ کر دونوں میاں بیوی آپس میں سازش کر کے آگے پیچھے ان کے کان بھرنے کے لئے ان کے ہاں آتے تھے۔

شاہ بانو جو کافی پریر سے خاموش بیٹھی بہن بھائی کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی بڑی بناوٹ کے ساتھ ذرا چونکتے ہوئے اچانک بولی۔ ”ارے سنا آپ نے آپا۔۔۔ میں سب تو قوف تو آپ کو بتانا بھول گئی حالانکہ یہ ہم اطوار تو آتے ہی بتا دیتی چاہئے تھی۔ برسوں آپ کو بھائی صاحب کے فذ کی رقم مل جائے گی۔“

نائے بیگم بھونچکی سی رہ گئیں۔ سرد و دان کے ہاتھ سے گر گیا۔ تیزی سے پوچھا۔ ”اے جھوٹا بیچ؟ تم سے کس نے کہی یہ بات؟“

شاہ بانو نے قدرے اتر اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”کچھ لیجئے اپنے بھائی سے۔“
 ذاکر حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہاں یہ اطلاع غلط نہیں ہے آپا۔ ٹھیک
 خود اپنی زبان سے اقرار کر کے گئے ہیں۔ آپ کو پرسوں ساتھ لے کر جائیں گے۔“
 کہاں تو نامزد بیگم مارے غصے کے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں اور کہاں نیکی ان آ
 باچھی کھل اٹھیں۔ ٹھیک مارے غصے سے کہ وہ اب تک برداشت ہی فنڈ کی رقم کی وجہ سے کر رہ
 تھیں۔ ان کے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ انہیں رقم وصول ہو جانے کے بعد دو
 کی کمی کی طرح نکال پھینکا جاتا۔

اس لئے انہیں اس حسین اطلاع پر دلی مسرت ہوئی۔

وہ بے حد خوش ہوتی ہوئی ذرا فکر مندی سے بولیں۔۔

”اے خدا کرے خدا کا رسول ﷺ کرے یہ خبر درست ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو ٹھیک؟“

کسی وجہ سے جھوٹ بول گئے ہوں۔“

”نہیں..... میرا خیال ہے وہ غلط نہیں کہہ گئے۔“ ذاکر حسین کچھ سوچتے ہوئے
 سنجیدگی سے بولے۔۔۔

”لیکن۔۔۔ ایک بات ہے آپا! جب تک رقم مکمل طور پر آپ کے ہاتھ میں نہ
 آجاتی، ذرا اپنے دو صاحب کی طرف سے چوکنی رہنے لگا۔ مجھے تو ان کی نیت درم
 نہیں معلوم ہوتی۔ ان کی اس درجہ بھاگ دوڑ اور رقم کی وصولیابی کی خبر کے س
 ساتھ ہی بچوں کو لے جانے کی دھمکی دے جانا معمولی بات نہیں ہے۔“

شاہ بانو جلدی سے اپنی موٹی آنکھیں پھیلا کر بولیں۔ ”ہائے اللہ۔۔۔ مجھ
 سب چار سو بیس معلوم ہوتی ہے۔ اے خدا آخوست کہیں ایسا نہ ہو کہ پرسوں آپا جا
 وہ رقم وصول کرنے کے لئے بھائی صاحب کے دفتر لے جائیں اور پھر دھوکے سے
 چھین لیں!!“

ذاکر حسین ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”ارے
 یہ تو فضول باتیں ہیں سب۔۔۔ نہ آپ شور مچائیں گی اور نہ ہی مجھے صحیح طور سے معلوم ہوتا
 ہے کہ درحقیقت ان کی نیت میں ہے کیا؟ اور رقم کی وصولیابی کے وقت ان کا طریقہ
 کار کیا ہوگا! ایک تو مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ٹھیک مارے غصے کی موجودگی ضروری ہوگی۔ اس
 لئے اگر ہم کچھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔۔۔“

پھر ایک لمحہ رک کر کچھ سوچتے رہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بہن کو دہلی کی طرف سے
 بدظن اور بدگمان کر دینا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی کم نفرت نہ کرتی تھیں ان
 سے۔ اب کڑوا کر بلا مزید نیم چڑھا ہوا تھا۔

کچھ دیر غور کرنے کے بعد ذاکر حسین نے قدرے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”ویسے تو خیر ہم خود خود چکے رہیں گے۔ ایسی کچھ فکر مندی کی بات نہیں ہے۔
 جب آپ ان کے ساتھ جائیں گے تو میں سائیکل پر آپ دونوں کے تعاقب میں
 رہوں گا۔ وہاں آفس میں بھی قریب ہی رہنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو
 آپ فوراً اشارہ کر دیجئے گا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ میری وہاں کچھ واقفیت بھی
 ہے۔ یہ شناسائی کسی وقت بھی کام آسکتی ہے۔۔۔ یہ تو میری میرے ذمے داری۔ مگر
 درحقیقت اصل کام آپ ہی کو کرنا ہے۔ یہ بہترین موقع ہے ٹھیک مارے غصے سے ہمیشہ کے
 لئے چھپا چھپانے کا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔۔۔ اور ذرا
 ادھر آئیے قریب۔۔۔ غور سے میری بات سنئے۔!“

پھر۔۔۔ بہت دیر تک دونوں بہن بھائی میں چپکے چپکے کوئی سازش طے پاتی رہی۔
 نامزد بیگم خوب جوش و خروش کے ساتھ سر بلاتی جا رہی تھیں۔ شاہ بانو شوہر اور ندی
 باں میں ہاں ملاری تھی۔

باہر بارش اب چپ چپ کر برسنے لگی تھی۔ گلی کوچوں اور بڑی بڑی سڑکوں پر

تیزی کے ساتھ پانی بھرنے لگا تھا۔ نیز بارش کی وجہ سے بازاروں کی چہل پہل اور کاروبار زندگی ایک دم ہی معطل ہو گیا تھا۔ کانیں دھڑا دھڑا بند ہونے لگی تھیں۔ ادھر ادھر آوارہ گھومنے والے کتے اور بلیاں دوکانوں کے شیلڈ اور چھجوں کے نیچے پناہ لینے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔

فٹ پاتھ، بے گھر وہ در انسانوں سے خالی ہونے لگے۔

موسم برسات کی یہ پہلی بارش ہی بڑے زوردار انداز میں شروع ہوئی تھی۔

مگر نائنہ بیگم اور ان کے بھائی بھانوج ہر سرد و گرم سے بے نیاز ایک ایسی پلاننگ میں مصروف تھے، جس کے متعلق ٹارا احمد بے چاروں کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کس جرم کی پاداش میں گھڑی جاری تھی۔ ان لوگوں نے از خود ہی ایک داستان امیر حمزہ تیار کی تھی اور خود ہی اپنی خود ساختہ کہانی کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے ایک جامع سازش مکمل کر رہے تھے۔

دلشاد اور شمشاد، دونوں بھائی گہری اور میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ گھر کی ملازمہ چھپیا پر بھی غفلت طاری ہو چکی تھی۔ صرف قسمت کی ماری حساس اور حرام نصیب مشکبار تھی، جو ان لوگوں سے کافی دور برآمدے کے آخری گوشے میں اپنے بستر پر بے قراری کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔

سادن کی وہ کالی سیاہ رات بچتی۔۔۔ صبح ہوئی۔

سارا دن وقفہ وقفہ سے بارش ہوتی رہی۔ بادل اسی طرح تھے کھڑے تھے۔ برساتی ہوا فرائے بھرتی رہی، چیل پودوں، پھل پھول کے کھڑے رہے۔



دھلتے رہے، اور نامہ بیگم سارا دن اپنے دل میں کھولا باندھی میں مصروف رہیں۔ اپنی عادت کے خلاف آج انہوں نے سادان کی جھڑی کو بھی نظر انداز کر ڈالا تھا۔ ورنہ وہ۔۔۔ اور سادان کڑھائی نہ چڑھائیں۔

اگلا دن طلوع ہوا تو حسب وعدہ نثار احمد دس بجے سے پہلے یکے لے کر بھائی کے دروازے آن پہنچے۔ ہر سازش اور مکاری سے بے خبر۔ نامہ بیگم پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں۔ فوراً یکے میں جانتی تھیں۔

راستے بھر دونوں دیور بھاونج میں کوئی زبانی بات چیت نہ ہوئی۔ ہر دو اپنی جگہ اپنی اپنی سوچ کے گرداب میں غوطہ زن رہے۔

آفس کی انتظار گاہ میں انہیں بٹھا کر نثار احمد کاغذات لے کر مختلف کمروں کے چکر لگانے کے بعد دوبارہ ان کے پاس آنے اور انہیں لے کر اس کمرے میں پہنچے، جہاں اسرار احمد کی پیشین گوئی کے لیے توقع تھی۔

چہرہ اسی نے ان دونوں کو اندر جانے دیا۔

نثار احمد دروازے کے قریب رک گئے اور نامہ بیگم بوہ کر میز کے اس طرف کھڑی ہو گئیں۔

سامنے کرسی پر ایک بارعب شخصیت کا آفیسر بیٹھا تھا کسی فاسل سے الجھ رہا تھا۔ کچھ دیر کی درق گردانی کے بعد اس نے نامہ بیگم سے تعذیق کرائی کہ وہ حقیقتاً اسرار احمد مرحوم کی بیوہ ہیں اور بذات خود ان کی تنخواہ میں سے کئی ہوئی رقم وصول کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے دودوسرے آفیسروں کی موجودگی میں ان سے کئی سوالات کئے۔ نامہ بیگم بڑی معقولیت سے ٹھیک ٹھیک جواب دیتی رہیں۔

پھر اس نے ایک جھٹیم سے رجسٹر پر کئی جگہ ان سے دستخط کرنے کو کہا۔ نامہ بیگم پڑھی لکھی تو تھی نہیں۔ چنانچہ ان سے اٹھوٹھے کے نشانات گلو لے گئے۔

اس رسم کی کارروائی کے بعد اس نے آہنی الماری کا تالا کھول کر ایک چربی بیگ پر آم کیلہ اور انہیں دو آفیسروں کے سامنے نامہ بیگم کو کرسی پر بٹھا کر ایک خاصی ظہیر رقم گوائی۔

آخر میں اس رقم کو کسی اچھے اور مناسب مقصد میں خرچ کرنے کی رائے دی اور مرحوم اسرار احمد کے لئے بھی چند ایک تعزیری اور الوداعی الفاظ ادا کئے۔



اس تمام کارروائی کے دوران نثار احمد چپ چاپ دروازے کے قریب بیٹھنے پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ کسی نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

نامہ بیگم جب اچھی طرح رقم سنبھال چکیں اور نیک دل آفیسر نے کرسی سے کھڑے ہو کر احتراماً انہیں رخصت کرنا چاہا مین اس وقت نامہ بیگم نے کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ نثار احمد پر ایک کڑی نظر ڈالی اور اپنے لہجے میں دنیا بھر کا درد اور خوف شامل کر کے کہنے لگیں۔

”صاحب! مجھے اس شخص کے پھندے سے بچائیے۔۔۔“

آفیسر کی پیشانی پر سیٹکڑوں بل پڑ گئے۔ وہ تیز نظروں سے نثار احمد کو گھورنے لگا۔ نثار احمد کا دل دھک سے رہ گیا۔

بیروں تلے زمین ٹھکسے لگی۔

انہیں اپنی ساعت پر یقین کرنا۔ شاہ جو گیا۔ ”یہ بھائی صاحب نے کیا کہا!“

کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی غش کھا کر گر پڑیں گے۔

”کون ہے یہ تمہارا؟“ آفیسر نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”اور۔۔۔ کیا خطرہ

ہے تمہیں اس شخص سے؟“

نامہ بیگم نے فوراً وقت بھری آواز میں فریاد کی۔ ”جی یہ میرے مرحوم شوہر چھوٹا بھائی ہے۔ مگر میرا سب سے بڑا دشمن ہے یہ بہت لالچی اور حریص ہے۔ میرا بیوہ ہونے کے بعد اس کی نگاہ میرے جان و مال پر ہے۔ یہ مجھ سے یہ رقم بھی ہتھیلیا کے پکر میں ہے اور صاحب۔۔۔ اس سے مجھ سب سے بڑا خطرہ۔۔۔ اپنے مال، علاوہ اپنی۔۔۔ عزت کا ہے۔ صاحب! یہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اور جھوٹا موت کا نکاح کر کے میرے یتیم بچوں کے حق پر ڈاکا ڈالنا چاہتا ہے۔۔۔ یہ میرے بچوں کو بے آسرا کرنا چاہتا ہے۔

مگر میں نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ میں عزت و آبرو کے ساتھ اپنے بچوں کی پرور خود کرنا چاہتی ہوں، مجھے اس شخص کے شر سے بچایا جائے۔۔۔ میری عزت اور جا مال کا تحفظ دلایا جائے۔ صاحب! میں آپ سے فریاد کرتی ہوں کہ مجھے میرے د کے لالچ سے بچایا جائے۔ تاکہ میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ آرام سکون کی زندگی گزار سکوں۔۔۔ مجھے اس شخص سے بہت بڑا خطرہ اور اندیشہ ہے۔ اس سے نکاح نہیں کرنا چاہتی مگر یہ میرے بیوہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر بے جا باؤڈ کر نکاح کرنا چاہتا ہے۔ میں کس سے فریاد کروں اور اپنا دکھ بیان کروں۔ مجھ بے آ بیوہ کا تحفظ کیا جائے!“

نامہ بیگم نے یہ مکاری سے پرہیز نہیں کیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر اور، فریادی اور دلگیر و دلگذازا انداز میں کہیں کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی تھو دیر کے واسطے بھونچکا ہو کر ان کے پکر میں پڑ جاتا۔

اس آفیسر پر براہ راست اثر ہوا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ فوراً ہی ٹار احمد کی طرف ہا پڑا اور انتہائی سرد و تحسانہ لہجے میں بولا۔ ”کیوں جناب! آپ کا دماغ تو درست چلتے ہیں کسی لاوارث اور بیوہ خاتون کو چھیڑنا اور پریشان کرنا کس قدر بڑا جرم ہے

بہت انوس کی بات ہے۔ یہ تو آپ کے بھائی کی بی بیوہ ہیں۔ بجائے ان کا دکھ بنانے کے المان کی پریشانی کا موجب بن رہے ہیں؟ مانا کہ نکاح ایک جائز فعل ہے مگر۔۔۔ اس میں ایک طرفہ خواہش کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ صورت سے تو آپ اچھے خاصے بردبار اور شریف انسان دکھائی دیتے ہیں مگر باطن آپ کا انتہائی غلیظ ہے۔۔۔ خبردار جو آئندہ ان شریف خاتون کا پیچھا کرنے یا نہیں تنگ کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے بھائی کے فوت ہونے کے بعد اب یہ ان کا سر اسرافاتی فعل ہے کہ یہ آپ لوگوں سے آئندہ ربط مضطر رکھیں یا نہ رکھیں۔۔۔“

پھر وہ کمرے کے بیچ مظلوم شکل بنائے کھڑی نامہ بیگم سے مخاطب ہوا۔ ”بیگم! سر ارا احمد! چونکہ اس وقت آپ کے پاس کی معقول رقم موجود ہے اور آپ کو اس شخص سے بھی خطرہ ہے۔ اس لئے اس وقت احتیاطاً فون کر کے میں ایک سپاہی بلائے دیتا ہوں۔ وہ آپ کو بحفاظت آپ کے گھر تک پہنچا کر آئے گا۔ مگر اس سے آگے ہمارے ٹھکے کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اخلاقاً طور سے ہم نے اس شخص کو سمجھا دیا ہے۔ لیکن۔۔۔ اگر یہ آئندہ بھی آپ کے لئے کوئی مشکل پیدا کرنا چاہے تو آپ فوراً اپنے حلقے کے پولیس اسٹیشن پر اس کا نام و پتہ اور اپنی چتار دج کروادینے پولیس فوراً اسے حراست میں لے کر اس کے مزاج درست کر دے گی۔“

اتنا کہہ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور انگریزی میں کسی سے بات کرنے لگا۔ ٹار احمد اب تک گم صم کھڑے کے کھڑے تھے۔ وہ نامہ بیگم اور اس آفیسر کی گفتگو ضرور سن رہے تھے مگر خود ان کی اپنی قوت گویائی جیسے سب ہو کر رہ گئی تھی۔ کانو جیسے بدن میں لہو نہیں۔۔۔ دل خزاں کے دوش پر آئے ہوئے زرد چٹے کی طرح کانپے جا رہا تھا۔ ایک دم ہی

ان پر جیسے منوں بڑھاپا اور ضعیفی طاری ہونے لگی۔ عقل میں نہیں سارہا تھا کہ یہ نائنم نے کیا کہہ دیا۔۔۔ اور انہوں نے کیا سن لیا۔!

اتنا بھیاںک الزام۔۔۔

ایسا گھناؤنا بہتان۔۔۔

ایسا ان سنی اور ان کی باتیں۔۔۔ جو کبھی ثار احمد کے تصور سے بھی نہیں گزری تھیں۔۔۔



ان کے تو خواب و خیال سے بھی یہ گری ہوئی سوچ نہ کبھی کرا کی تھی۔ وہ تو بھواج کو انتہائی قابل احترام جانتے تھے۔۔۔ بھائی کے انتقال کے بعد سے تو اس احترام اور عزت و ہمدردی اور نمٹکساری میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہاں۔۔۔ جس دن نائنم نے عدت توڑی اور ثار احمد نے تینوں بچوں کو لاوارثوں کی طرح ادھر ادھر کی خاک چھانٹے پھرتے پایا تھا، وہ ضرور بھواج کی طرف سے بدظن ہو گئے تھے۔ تو اس سلسلے میں بھی انہوں نے شریفانہ قاعدہ اپنانے کا فیصلہ کیا تھا اور سوچا تھا کہ ذرا سرکار دربار کے چکر سے فارغ ہو جائیں اور فنڈ کی رقم نائنم بیگم کو دلاو دیں پھر آرام اور سکون کے ساتھ بچوں کے متعلق بات کریں گے۔

رقم کھانے یا نائنم بیگم سے نکاح کا تو ذکر ہی کیا۔۔۔ وہ خود بیوی بچوں والے تھے اور دنیا کی ہر نعمت قدرت نے ان کو مہیا کر رکھی تھی۔

ان کا جی چاہ رہا تھا، زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سا جائیں۔

عزت والے کے لئے ایک لفظ بھی توین کا بہت بڑی گناہی ہو تا ہے۔

کجا کہ نائنم بیگم نے ان کو بھیجی کر ڈالا تھا۔

اب وہ دنیا کو کیا منہ دکھلائیں۔۔۔ کہاں جائیں۔۔۔ کیا کریں۔

بہت بڑے بڑے سوائیلہ نشان آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

خدا جانے کیسے۔۔۔ اور کیونکر۔۔۔ ان کے قدم خود بخود اٹھے اور پھر اٹھتے چلے گئے۔

وہ نائنم بیگم کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد۔۔۔

نائنم بیگم ایک کیے پر شبانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے برابر ایک سپاہی وردی پہنے، مستعدی سے ہندوق ہاتھ میں تھا سے چونکے انداز میں ادھر ادھر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

یکہ دھیرے دھیرے لکھنؤ کے گلی کوچوں سے ہو تا ہوا لہجہ بہ لہجہ اسرار احمد مرحوم کے گھر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس گھر کی جانب جس کے دروازے نائنم بیگم نے اپنی انتہائی عیاری اور فطری دوراندیشی سے کام لے کر ثار احمد اور ان کی ساری اولاد کے لئے ہمیشہ کے واسطے بند کر دیا ہے تھے۔۔۔ اور یہی تھی وہ سازش جو ایک دن قبل تیار کی گئی تھی۔

یکے سے خاصے فاصلے پر ذاکر حسین اپنی سائیکل پر سوار چلے آ رہے تھے۔

چہرہ کسی اندرونی خوشی کے زیر اثر دک رہا تھا۔

اول تو خود نام نہ بیگم کا دل بھی دیور دیورانی اور ان کے بچوں سے نہیں مل سکا۔ ساری زندگی بھی انہیں ڈھنگ سے نہ ملیں نہ انہیں دیکھ کر پیشانی کے بل ہٹائے۔ کبھی ان کے ہاں گاؤں میں جانا پسند نہ کرتی تھیں۔ انہیں تو ہفتہ وار چھٹی پر میاں اور بیٹی کا ان کے گھر جانا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر اس جگہ اسرار احمد کے خاموش رویے سے مجبور تھیں۔ آندھی جی چڑھتی یا طوفان آتا تو اتوار کے اتوار بھائی کے ہاں جانا نہ بھولتے۔ نام نہ بیگم خواہ کتنا ہی بڑبڑکیوں نہ کرتیں۔ وہ ساری بڑبڑاوت نظر انداز کر کے اپنا یہ معمول بھی نہ توڑ پائے تھے۔

لیکن جب اسرار احمد اس جہان فانی سے اٹھ گئے تو یہ معمولات بھی خود بخود ٹوٹ گئے۔ مہینوں گزر گئے، مشکبار چچا کے گھر میں قدم نہ رکھی سکی۔ پہلے تو چچا چچی اور ان کے بیٹے نام نہ بیگم کے شک اور روکے روکے کے باوجود آتے جاتے رہے مگر پھر ایک دن یکایک یہ سلسلہ ایسا یکجہت تھما کر پھر بالآخر برسوں گزرتے چلے گئے، یہ دو گھرانے آپس میں نہ مل سکے۔

اسرار احمد کے دفتر میں نام نہ بیگم نے جو الزامات منہ در منہ ٹار احمد پر عائد کئے تھے ان کا گہر پھاڑ دینے کے لئے کافی تھے۔ اس روز کے بعد سے انہیں اپنی اس عیار بھاج تو بھاج ان کے بچوں تک سے نفرت ہو گئی۔

وہ اسی قاعدے کے انسان تھے۔ اگر کوئی ان سے ایک قدم پیچھے ہٹا تو وہ دس قدم ہٹا کر، کھلا دیے والوں میں سے تھے۔

پھر نام نہ بیگم نے تو اخلاق و مروت کی ساری حدود ہی آن واحد میں پھلاٹک ڈالی تھیں۔

اب ٹار احمد ان کا ذکر تک سننے کے رددار نہ رہے تھے۔

دفتر سے واپس لوٹ کر ان کے دل و دماغ قابو میں نہ رہے تھے۔ دماغ پر ایسا اثر ہوا

اگر تمام واقعات کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور بغور چھان بین کی جائے تو خاصی تک الزام ٹار احمد پر بھی عائد ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہتے اور اپنا غم و غصہ نظر انداز کر کے صرف اور صرف اپنے تئیم اور لاوارث بھتیجیوں، بھتیجی کے تحفظ اور مستقبل مد نظر رکھتے تو یقیناً کہانی چاہے کیسا ہی رخ اختیار کرتی مگر یہ بات مانی ہوئی ہے۔ مشکبار، شمشاد اور دلشاد کو زمانے کی وہ ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں جو بعد کو ان بد نصیبوں پر مقدر کر دی گئیں۔

مگر اس سلسلہ امر کو کیا کہا جاتا کہ وہ ذاتی طور پر بے حد غیور طبیعت اور خود فطرت کے مالک تھے۔ بہت کم خن اور سنجیدہ تھے۔ نہ بڑا بول بولتے تھے نہ کسی پر جھگرتے۔ کسی سے لینا نہ دیتا۔ ان کے دوست احباب بھی بہت کم تھے۔ اپنا سب سے سرپرست، دوست، ساتھی، منگھلاؤ وغیرہ اپنے بڑے بھائی اسرار احمد کو سمجھتے تھے اور ان کی وفات کے بعد مزید گوشہ نشین اور کم گویا ہو گئے تھے۔ دنوں اس صدمے ان کی حالت نہ سنبھل سکی۔

اپنی بھاج نام نہ بیگم سے وہ بھائی کی زندگی میں بھی بے تکلف نہ ہو سکے تھے کا بھلا کر ہی کیا ہے۔

کہ وہ اپنے گھر کا راستہ بھی فراموش کر بیٹھے۔ ذہن بیکار ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سارے دھند چھا رہی تھی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور سوچوں کے تمام سرے چلا ایک دم کم گہری کھڑ میں جا گئے تھے۔

قدم من من بھر کے ہو گئے۔ وہ جانا کس طرف چاہ رہے تھے بھٹک کر پہنچ جا۔ کس طرف کو گئے۔

اپنے آپ سے بے خبر چلتے چلائے اپنے گاؤں کے بجائے جانے کون سا راہ اختیار کیا کہ ہری بھری پلڈنڈیوں کے جال میں الجھتے چلے گئے۔ پلڈنڈیوں کی چھوڑی تو کھلیاں، باغات اور میدانوں میں بھٹک گئے۔

گزشتہ شام کو برسنے والی بارش کا پانی جگہ جگہ گڑھوں اور نشیبی جگہوں میں بھرا تھا۔ یہ کہیں پر بیٹھے کہیں گرتے آگے ہی آگے چلے گئے۔ سارے کپڑے کچھڑ میں پت ہو گئے، بال بکھر گئے، آنکھوں میں دھشت بھر گئی۔۔۔ مگر اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔ دراصل ٹارا احمد پر یہ افسوسناک کیفیت اور دھشت چھا جانے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ بھادوچ کے بے بنیاد الزامات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ بول پائے تھے۔ نہ کی جھڑائی نکلی تھی۔ نہ اپنی صفائی پیش کر سکے تھے۔ مزید یہ کہ اس آفیسر کے کڑے الفاظ، دھمکی اور سخت لہجے کا اثر۔۔۔ سارا غم و غصہ، رنج و الم اندری میں اندر گھٹ کر رہا تھا۔ اور نکاسی کا کوئی راستہ نہ پا کر ان کے پریشان حال دل و دماغ پر حملہ آور ہو گئے تھے



وہ تمام دن انہی ناہموار اور کچے راستوں پر بھٹکتے بھرے۔ کوئی انسانی صورت نظر نہ آئی۔ وہ تھے اور جنگل کا بولنا ہو اسناٹا۔۔۔ اونچی اونچی لہرائی فصلوں میں کھڑ لپا یا دور دور بکھرے ہوئے ہرے بھلے باغوں کے سلسلے۔

ساوان کی رات نے ہر منظر گھٹا کر ڈالا تھا۔ چتے چتے اور بونے بونے پر غصہ کی بہا رہی تھی۔ پانی کے چھینٹنے نے جھڑ میں کی کوکھ تک آباد کر ڈالی تھی۔ سبزے اور ہریالی نے مل جل کر جنگل میں منگل کر ڈالا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں والے معصوم خرگوش اور چھوٹی چھوٹی گھیریاں جھاڑیوں میں پھدتی پھدتی پھری تھیں۔ ننھی ننھی چڑیوں نے بیڑوں میں شور مچا کر کھتا تھا۔

موسم برسات کی ہر نعمت اس وقت جنگل کے پرفضا حوال میں عیاں عیاں کی لگ رہی تھی۔ مسلسل بارشوں نے نوکر دار کانٹوں تک کو نرم و نازک لباس پہنا ڈالے تھے۔ ہر منظر دعوت و نگارہ دے رہا تھا۔ مگر۔۔۔ ٹارا احمد کو کہاں ہوش تھا۔۔۔ کہا کہ لطف اندوز ہونا!

محض اتفاق ہی تھا کہ سورج کا آتشیں گولہ ڈوبنے سے پہلے پہلے کسی واقف کی ان پر نظر پڑ گئی۔ اگر گلگیا سا بھی اندھیرا پھیل چکا ہو تا تو ان کا حلیہ اس قدر بدتر اور گندابو رہا تھا کہ پہچانے ہی نہ جاتے۔ تاہم اس نے قریب آکر بغور دیکھنے کے بعد ہی یہ حیرت انگیز حقیقت پائی کہ ٹارا احمد کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا ہے۔

وہ بے مشکل گھنٹ گھنٹ کر انہیں اپنے ٹھکانے پر لے گیا اور گھوڑے پر لاد کر کسی نہ کسی طرح ان کے گھر تک پہنچانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

ٹارا احمد پر سراسر سائی کیفیت طاری تھی۔ ان کی بیوی تو مارے بول کے رونے لگیں۔ اچھے خاصے صبح ناشتہ کر کے کپڑے بدل کر گھر سے گئے تھے۔ انہیں تو کبھی معمولی سائلز و کامیاد پر دسر تک نہ ہوا تھا۔

چاروں لڑکوں کے ہاتھ حیر پھول گئے۔ ان بے چاروں نے بھی اپنے ہوش میں کبھی باپ کی یہ عجیب و غریب حالت نہیں دیکھی تھی۔ ٹارا احمد جانے کیا کیا بک رہے تھے۔ ہوش میں ہوتے تو صحیح بات کا علم ہو جاتا، کبھی کہتے۔

”میں چور ہوں۔۔۔ میں ڈاکو ہوں۔۔۔ میں غائب ہوں۔۔۔ میں منافق ہوں۔“
لیکن تھوڑی دیر بعد کہنے لگے۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں منافق ہرگز نہیں۔۔۔ میں تو بزدل ہوں بزدل ہوں۔“
مجھے سزا ملنی چاہئے۔“

کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

یہ تو سب کو معلوم تھا کہ صبح نامہ بیگم کو لے کر اسرار احمد کے دفتر گئے تھے فیڈ کی رقم دلانے کے لئے۔ بس وہیں سے اس عجیب و غریب حالت میں واپس آئے تھے۔ چنانچہ ان کے بڑے لڑکے نے نام بیگم کے ہاں بھی باپ کی اچانک عزالت کی اطلاع بھجوا دی۔ مگر وہاں سے کسی نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ بلکہ ایک سنگین خاموشی اختیار کر لی۔
نثار احمد کی دیوانگی کو کئی دن بیت گئے مگر نامہ بیگم کے ہاں سے کوئی آیا اور نہ کسی نے خیر خیریت دریافت کرائی۔

چنانچہ رفتہ رفتہ ان کی جلد چپ نے سب کو سمجھا دیا کہ دل میں جو کالا بے تودہ نامہ بیگم کی طرف سے ہی ہے۔۔۔ اور نثار احمد کو جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں نامہ بیگم کا ہی عمل دخل ہو سکتا ہے۔

اس احساس نے چاروں بیٹوں کے دلوں میں خود بخود ہی بڑی لہاں کی طرف اک کھٹک پیدا کر دی۔ قدرتی بات تھی کہ دیوانی کا دل بھی ان کی طرف سے میلا ہو گیا۔
یوں دلوں میں نفرت و مکدورت کا بیج پڑا تو دن بہ دن بڑھتا ہی چلا گیا۔

گاؤں کا دیسی علاج کرایا گیا۔ پھر شہری ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ نثار احمد کے بیٹوں نے ان کے دوا علاج میں کوئی کسر اٹھانہ نہ رکھی۔ جس نے جو رائے دی اس پر ضرور عمل کیا گیا۔

پھر سننے میں یہ بھی آیا کہ ہوش و خرد سے بیگانے انہی دنوں میں ایک دفعہ نثار احمد نے

اپنی جان ختم کر ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر بروقت ان کے منہلے بیٹے نے بچالیا۔



کچھ عرصہ گزرا اور بہتے رستے زخموں پر کھرہ بڑھا تو رفتہ رفتہ نثار احمد قدرے ہوش میں رہنے لگے۔ کیا معلوم قدرت کو پریشان حال بیٹوں اور روتی بکیتی بیوی کی حالت زار پر رحم آ گیا یا کسی کی دعا کا کام آگئی۔۔۔ بہر حال۔۔۔ پرآگندہ حالات سنورنے لگے۔ اور نثار احمد کی دماغی حالت کچھ اعتدال پر آنے لگی اور چوبیس گھنٹے میں زیادہ تر وہ صحیح المدبہ لوگوں کی طرح نارمل نظر آنے لگے۔ سب نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ یہ بھی بہت قیمت تھا۔ ورنہ سب ان کی صحت اور تندرستی کی طرف سے تقریباً باپوی ہو چکے تھے۔ تبھی خدا کی قدرت جوش میں آئی اور جس طرح اچانک وہ ہوش و حواس سے بیگانے ہوئے تھے ویسے ہی اچانک ان کی حالت اعتدال پذیر ہونے لگی۔

لیکن حال اور ماضی کے نثار احمد میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہو چکا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور خاموش طبیعت ہو گئے تھے۔ گھنٹوں خاموش لیتے چھتے کی کڑیاں گنتے رہتے یا زیمینوں کی سیر کو نکلتے تو سورج ڈوبے گھر لوٹتے۔

ایک روز انہوں نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ گھر کے سب افراد حیرت زدہ ہو گئے۔ مگر کسی کی بھی مجال نہ ہوئی کہ ان کو منع کرے یا تاکم از تاک اس کا سبب دریافت کرے۔
نثار احمد اکیلے ہی اپنی کارروائی میں مصروف رہے اور اپنے کمرے میں جہاں وقتاً فوقتاً۔۔۔ انہوں نے اپنی بچپنی اور بچپن کی بہت ساری تصویریں فریموں میں جڑ جڑ کر بڑے شوق اور لگن سے دیواروں پر سجائی تھیں، سب اتار اتار کر ایک بڑے سے ٹکڑی کے صندوق میں رکھ دیں۔ ہر تہوار کے موقع پر وہ خود ان بچوں کو کھنٹولے جا کر تصویریں کھنچوا کرتے تھے۔

کچھ بڑی بڑی تصاویر اسرار احمد مرحوم کی بھی تھیں جو ایک عرصے سے آواہریاں تھیں۔ یہ سب تصاویر صندوق میں بند کرنے کے بعد انہوں نے ایک بڑا سا تالا لگایا اور چابی لے جا کر اپنے ہاتھ سے بڑی مہر کے پانی میں غرّاب سے پھینک دی۔ پھر اس کے بعد بہت دیر تک باغ میں ایک بیڑے کے نیچے گم صم لینے رہے۔ خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں سے کہاں تک کا سفر کر ڈالا۔ آج وہ اپنی دانست میں بھائی کی اور بھائی کی اولاد سے ہر تعلق توڑ چکے تھے۔

اور حقیقت بھی یہی تھی۔

اس روز کے بعد سے پلٹ کر انہوں نے بھاج کی گلی تک نہ دیکھی۔

اپنی اولاد سے انہوں نے صاف صاف تنبیہ کر دی تھی کہ جو کوئی بھی تم میں سے آئندہ میری مرضی کے خلاف نانہ بیگم اور ان کی اولاد سے ملایا ان سے بات چیت کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ ان کی نظر میں مرچکا ہوگا۔

یوں وقت کا پتھیں اپنے بچوں میں حالات کی ست رنگی ڈور تھا سے کہیں جا نکلا، مگر ثار احمد نے نانہ بیگم کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کی۔ انہیں اس نام سے الگوا نفرت ہوئی کہ پھر تازنگی دھل نہ پائی۔

یوں بچا سے یتیم بچتے چھوٹ گئے۔

بے کس وہ بے بس، مجبور و لاچار معصوم بچتے چھوٹ گئی۔

اسرار احمد کا ساتھ چھوٹے ہی محض ایک عورت کی مکار ذہنیت کے کارن یہ چھوٹا سا گھرانہ نکلوں کی طرح منتشر ہو گیا۔

ثار احمد نے دل پر وزنی پتھر رکھ کر یہ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تینوں بچوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔ سب رشتے ناتے چھوٹ گئے۔ نوٹ گئے۔ نانہ بیگم کا جوہا چاہے کریں اور جیسے مرضی ہو ان کی پرورش کریں۔

اور یہی نانہ بیگم چاہتی بھی تھیں۔ ان کی دلی آرزو پوری ہو گئی۔ انہوں نے الزامات ہی ایسے تاک تاک کر لگائے تھے کہ کوئی غیرت مند اور خوددار انسان برداشت نہ کر سکتا تھا۔ پھر ثار احمد کی تواعت و فطرت بھی ایسی تھی کہ نانہ بیگم کا یہ ٹاپاک حربہ ان پر نہایت آسانی سے چل گیا اور وہ اپنی جگہ جامہ ہو کر رہ گئے۔

یوں ہر وقت رواں رہنے والے وقت کے سرد و گرم میں دھیرے دھیرے کئی سال بیت گئے۔۔۔ اور کسی نے کسی کی خبر نہ لی۔



اسی زمانہ کا ذکر ہے۔

نانہ بیگم کی پانچواں سٹی میں تھیں۔ نہ کسی طرح کا فکر و تردد نہ پریشانی پشیمانی۔ بڑے مزے اور بے فکری سے اپنا وقت کاٹ رہی تھیں۔

اسرار احمد کی چھوڑی رقم کیلانی، وارے کے نیارے ہو گئے۔ چنبیٹے اور دلارے بھائی ذاکر حسین نے مستقل انہی کے گھر ڈیرے ڈال لئے۔ آج یہ کاروبار کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں کل دوسری دکاندار کی رائے ہو رہی ہے۔ آج ایک پارٹی کھانے پر مدعو ہوئے تو پرسوں کسی اور طرف کی مہمان داری ہے۔

بھائی کے ایک اشارے پر مرنے پر غافل ہو جاتا۔ بریانی دم ہو رہی ہے۔ شب دیگ چڑھی ہے شاہی کباب بن رہے ہیں۔ نہاری تیار ہو رہی ہے۔ کسی کاروبار کی بنانے کے واسطے تو لی جی ہے یا تاش کی بازی جی ہے غرضیکہ ان لوگوں کا دن عید اور رات شب برات تھی۔

ذاکر حسین کو نوٹ پر نوٹ گنائی جلی جاتی مگر پیشانی پر ہل تک نہ پڑتا۔ خود نانہ بیگم کی اپنی سرگرمیاں بھی کم نہ تھیں۔

سبکی باز تو ہمیشہ کی تھیں۔ اب بالکل ہی کل کھلیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ کپڑے سلوائے کبھی کسی کے ہاں شادی میں جاری ہیں۔ کتیں رہتے تھے۔ کہیں محفل میلاد کہیں گانے ہوں یا محفل سماع۔۔۔ غنتہ ہو یا چالیسواں، ان کا پہننا لازمی ہوتا تھا۔ جو کسی مجلس سے غیر حاضر ہو جائیں۔ پھر اپنے ہاں بھی ایسی محفلیں سنانے سے نہیں چوکتی تھیں۔ مینے دو مینے میں محفل توانی کا اہتمام تو ضروری ہوتا۔

چہل پہل اور رونق کے شوق ہی شوق میں انہوں نے ایک دن دلشاد کی غنتہ انتہائی دھوم دھام سے کر ڈالی اور خوب خوشیاں منائیں۔ بھائی کے ہاں تیسرا بیٹا ہوا تو اپنی طرف سے میراثیں بھیج دیں اور اپنے گھر پر بھی تین دن تک ڈھولک رکھوائی اور موتی چور کے یہ بڑے بڑے لٹوے منوائے۔

الغرض

شورو و شغب اور دھوم دھام کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ گو کہ یہ تمام حرکتیں وہ اسرار احمد کی زندگی میں بھی باقاعدگی سے کر گزرتی تھیں مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کے انتقال کے بعد سے زیادہ آزاد اور منہ زور ہو گئے تھیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ ایک دم روپے پیسے کی افراط ہو۔۔۔ لیکن بہر حال۔۔۔ بات بھی طے شدہ ہے کہ روپیہ پیسہ آتی جانی شے ہے۔ اس سے بڑھ کر دینی چھاؤ کوئی بھی نہیں۔۔۔ آج یہاں ہے توکل وہاں۔۔۔ یہ بے فیض بھلا س کے پاس رکی۔۔۔ جو نائنہ بیگم کو وغانہ دینا!

اول تو وہ خود بھی شاہ خرچ کہ نہ تھیں اوپر سے ذاکر حسین کی دھوکے بازیاں۔۔۔ کار و بار۔۔۔ وہ کار و بار۔۔۔ کے پکر میں کتنی ہی رقم ایٹھ گئے۔ بہن کے روپے کے لالو لال بنے ملک کے نواب کی طرح گھوما کرتے۔

اسرار احمد کی چھوڑی ہوئی رقم تمام ہوئی تو ان باغوں کی باری آئی جو ایک زمانے میں اسرار احمد نے بڑے شوق سے خریدے تھے۔

بعد ازاں نوبت اس جار سید۔ ایک ایک زیور و تما و قفا بکے لگا۔ ذاکر حسین کوئی ایک زیور و مال میں چھپا کر لے جاتے اور کچھ رقم لاکر ہمشیرہ کے ہاتھ میں دے دیتے۔ دنوں یہی سلسلہ چلا۔ لیکن آخر کب تک۔۔۔

عادت تو شاہ خرچی کی تھی۔ پیسے کی کمی اور بڑھتے ہوئے مسائل نے نائنہ بیگم کو دن میں تارے دکھا ڈالے۔ انہیں ہر وقت چڑچڑاہٹ اور کوفت کے دورے پڑنے لگے۔ نہ وہ اللے تلے رہے نہ عیش و عشرت۔ ایک محدود قسم کی زندگی ان پر مسلط ہو کر رہ گئی۔ محفلیں اجڑ گئیں۔ ڈھولک کی تھاپ تھم گئی اور میلوں غیلوں اور ”بائیسکوپ“ کے مزے لٹ گئے۔ انہیں ہر طرف اندھیرا اندھیرا چھایا دکھائی دینے لگا۔

ان سے زیادہ فکر مند ان کے بھائی ذاکر حسین تھے۔ جو روپے کوڑی کے ختم ہوتے ہی اپنے پر پر زے سمیٹ کر دوبارہ اپنی اماں کے گھر بڑا ڈال چکے تھے۔ کچھ مصیبت کے وقت مہایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔



ذاکر حسین اسی سوچ میں تھے کہ اب دیکھنے بھالنے والے عزیز رشتے دار کیا کہیں گے؟ آپا جان کا خرچ کہاں سے چلے گا؟ ظاہر ہے وہ خود تو یہ بار اپنے سر لینے سے رہے تھے۔۔۔ اگر ایسے ہی فرض شناس ہوتے تو ان کا رویہ بگاڑتے ہی کیوں؟

انہوں نے اس سے قبل کہ حالات مزید خدوٹ ہو جاتے، ادھر ادھر دو چار مشاہد دوڑا دیں۔ کھل کو آف بیان کر دیے گئے کہ ایک صاحب حیثیت بیوہ کے لئے

رشتہ درکار ہے۔ بشرطیکہ نکاح کے لئے آنے والا ان کے تین عدد یتیم بچوں کا بوجھ بھی بخوشی اٹھانے پر رضامند ہو۔“
اس کو شش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔
اور جلد ہی وادیک رشتے آموجد ہوئے۔

چند ایسے بھی تھے جو صاحب حیثیت تو تھے لیکن صرف نکاح کے آرزو مند تھے۔ بچوں کو رکھنے سے انکار کر رہے تھے۔ ذاکر حسین ایسے صاحبان کو کورا جواب اوپر ہی اوپر سے دے دیا۔ بھلا وہ خود کیسے ایک ساتھ تین بچوں کی ذمہ داری قبول کر سکتے تھے۔ اب یہ تو کوئی دوسرا ہی دل والا ہو سکتا تھا جو ان بچوں کا بوجھ بخوشی اٹھا سکتا۔
چنانچہ یہ وہی وقت تھا جب گل میاں کے ابا میاں نکاح عالی پر رضامند ہو گئے۔ ان کا بہرشتہ ان کے ایک قریبی دوست کی معرفت طے ہوا تھا جس میں ان کے بیٹے گل نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

رشتے کی ابتدا ہی بات چیت طے کرنے کے بعد ذاکر حسین نے اپنی بیوی شاہ بانو کو سمجھایا کہ وہ کسی طرح آپا جان سے اس رشتے کا تذکرہ کرے اور اندازہ کرے کہ وہ بھی نکاح ثانی کے لئے رضامند ہیں یا کہ نہیں۔

لہذا شاہ بانو نے انتہائی ہشیاری اور چابکدستی کے ساتھ نانہ بیگم کو ششے میں اتار لیا۔ بچوں کے محفوظ مستقبل اور خود ان کی بھلائی اور سکون کے لئے ایک سرپرست مرد کی ضرورت پر خوب بڑھ چڑھ کر تقریریں کیں اور بار بار ان کو اس امر کا احساس دلایا کہ تین تین بچوں سمیت ان کو قبول کرنا کسی معمولی ظرف اور حیثیت کے مالک مرد کا کام نہیں ہے۔ جس جگہ ہم آپ کا رشتہ طے کر رہے ہیں انتہائی بڑے لکھے بردہام اور صاحب حیثیت شخصیت کے مالک ہیں۔ خدا کا دیا ان کے پاس سب کچھ ہے۔ بھلا بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا، سرکاری ملازمت کے علاوہ اچھے کھاتے چیتے کھرا

سے تعلق ہے۔

نانہ بیگم یہ سب کوائف سن کر قدرے خاموشی ہو گئیں۔ ہر جانب سے پیسے کی آمد بند۔ خالی ہاتھ جھلائے بیٹھی تھیں۔ بھائی کے سر روئے کو بھی خوب سمجھ رہی تھیں۔ اتنی جہاندیدہ تو قیسی ہی کہ انہوں کی بدلی بدلی نگاہیں پہچان لیتیں۔ سمجھ چکی تھیں کہ خالی ہڈی ہوتا بھی سو گتھ کر چھوڑ جاتا ہے۔

مگر گلہ کس سے کرتیں! سب کچھ اپنا ہی کھا دھرا تھا۔ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ماری تھیں۔

اب ان کو ثار احمد کے کہے ہوئے الفاظ اور ان کی اہمیت کا پوری شدت سے احساس ہوا۔ دل ہی دل میں خاصا پیچھا نہیں۔ پشیمان ہوئیں۔ مگر یہ تاثر تادیر قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ انہی دنوں ذاکر حسین نے ایک دن ابا میاں کو ان کے دوست کے سمیت کھانے پر مدعو کر لیا اور اسی موقع پر شاہ بانو نے نانہ بیگم کو بہانے سے بلوا کر کھڑکی سے اندر کا منظر دکھا ڈالا۔

نانہ بیگم نے بالکل ہی خاموشی اختیار کر لی۔

اور ان کی بیٹی خاموشی، رضامندی سمجھ لی گئی۔ ابا میاں یوں بھی انتہائی رعب دار، باوقار اور بھاری بھر کم شخصیت کے مالک تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی پر جلال آنکھیں اور --- اونچا لمبا قد --- وہ اپنی اصل عمر سے بہت کم دکھائی دیتے تھے۔ --- پھر انتہائی شریف النفس اور خاندانی بندے --- چہرے بشرے کے باوقار سمجھی دیکھنے والوں نے بے حد پسند کیا۔

اور تو اور نانہ بیگم کی والدہ، بانو بیگم کو بھی یہ رشتہ پسند آیا۔ حالانکہ ذاکر حسین نے ان کی رائے تک لیٹی ضروری خیال نہ کی تھی۔

یوں ایک جیسے کے دن بے حد سادگی اور خاموشی کے ساتھ نانہ بیگم، ابا میاں

کے عقد میں دے دی گئیں۔ سادگی کے باوجود ان کی طرف سے کئی ایک بھاری کامدار جوڑے اور وزنی زیورات چڑھائے گئے تھے۔

اسی موقع پر ڈاکر حسین نے ایک کارنامہ اور کر دکھایا۔

اور۔۔۔ وہ یہ کہ۔

کچھ پچھلا قرض پکانے کے نام پر، چلتے چلاتے نائے بیگم کا گھر بھی فروخت کر ڈالا۔ یوں اسرار احمد مرحوم کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں جو آخری یادگار گھر رہ گیا تھا، نائے بیگم اور ان کے بچوں کا حقیقت میں ساری زندگی کے لئے اس سے بھی واسطہ چھوٹ گیا۔

کلاچ کے ابتدائی ہفتے تک تو تینوں بیچ اپنی نانی ماں کے ہاں رہے۔ پھر ایک دن نائے بیگم نے گل میاں کو بھجو کر انہیں بلوالیا۔ یہاں مہارن پور کے بہترین علاقے میں ابامیاں نے دو منزلہ مکان لے رکھا تھا اور یہیں اوپر کے حصے میں نائے بیگم نے اپنا رہائش اختیار کر رکھی تھی۔

یہاں آنے سے قبل مشکبار جب تک نانی کے ہاں رہی، دن میں کئی مرتبہ شیشا اور لٹاد کو لے کر اپنے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے ضرور جایا کرتی تھی، جو اس کے اورا کے بھائیوں کی جائے پیدائش تھا۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کا بہترین اور بے فکر، گزارا تھا۔ جہاں باپ کی شفقت اور محبت ملی تھی اور جہاں اس نے محو کرنے والے باپ کو زندگی کا آخری سفر کرتے ہوئے دیکھا اور اپنی تپتی ہوئی کانٹا دیکھی تھی۔

پھر بعد کے حالات نے اسے بے حس اور زندگی سے اتنا پلاس کر دیا تھا کہ اب میں زندہ رہنے کی کوئی آرزو باقی نہ رہی تھی۔ جس رات اسے باپ کی یاد آجاتی تو اس تک یہ صبح آنسوؤں کی نمی سے بھیج رہتا۔ مگر وہ قدرت سے لڑ سکتی تھی نہ اپنی پیلا

نقد پر سنوار سکتی تھی۔



اگلی صبح بادل تو چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر آرہے تھے مگر فضاء میں جس اور عھن کا یہ عالم تھا کہ سانسیں رکتی ہوئی لگ رہی تھی۔

کچھ تو پریشان الذہنی کی وجہ سے رات گئے جاگنے رہنے سے اور رونے سے شکبار کی آنکھیں متورم اور گلابی گلابی ہو رہی تھیں۔ چہرہ بہت زیادہ اترا سا لگ رہا تھا اور وہ ہر روز کی نسبت بہت ست تھی۔

لٹاد اور شیشا کو ناشتہ کروانے کے ساتھ ہی اس نے خود بھی چند نوالے توڑ لئے تھے۔ بھوک ذرا سی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرے گرمی کی شدت نے جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ موسم ایک دم ہی دوبارہ..... عھن آمیز اور گرم ہو گیا تھا۔ کل نائے بیگم کی بے رخی اور یوں اکیلے چلے جانے سے اس کی حساس طبیعت بھگ کر رہ گئی تھی۔ اور اس کا دل ایک ہل چلی یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ بچوں کو بلا دیا۔ جہاں گاؤں میں، چھوڑ جانے کا جواز تو کچھ بھی نہ تھا۔

مشکبار کو رہ کر اپنا آپ چھوٹا چھوٹا اور حقیر سا لگنے لگا تھا۔ وہ بار بار سوچتی تھی۔

”انماں نے یہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ یہ لوگ اپنے دل میں کیا سوچتے ہوں گے کہ ڈھائی تین ماہ کی..... مہمان داری کے بعد بھی دل نہ بھرا اور بچوں کو ہمارے سر ڈال گئی ہیں۔ آخر کوئی تک بھی تو ہو چھوڑ جانے کے۔“

وہ یہی سب سوچ سوچ کر کڑھتی رہی۔

دوپہر کے، وقت وہ نیم کے نیچے چنگ پر لٹاد کو بیٹھی تھپک تھپک کر سلا رہی تھی

کہ فاطمہ پھوپھو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈنڈی والا خوبصورت سا جھار لگا پکھا تھا وہ مسلسل جھلے جاری تھیں۔ ویسے نیم کی گھنٹی اور گھبرائی چھاؤں میں قدرے سکون اور تراوت کا احساس ہو رہا تھا، مگر یہ بھی کچھ کم کم تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح جتے ہوئے تھے۔

دلشاد کچھ دیر کسمانے کے بعد سوچا تھا۔

مشکبار خاموشی سے سر جھکائے دائیں پیر کی انگلیاں مروڑے جاری تھی۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فاطمہ پھوپھو بے حد نرمی سے کہنے لگیں۔ ”بیٹی! تم آج بہت چپ چپ ہو۔ پریشان لگتی ہو۔ کیا بات ہے؟“

مشکبار نے چونک کر انہیں دیکھا مگر منہ سے کچھ بولی نہیں۔ اس سے جواب ہی نہ بن پڑا۔

اب پھوپھو نے ایک ہاتھ سے اس کی چٹھہ چھکی اور پہلے سے زیادہ محبت سے بولیں۔ ”یہ تمہارا اپنا گھر ہے مشکبار! یہاں خدا کی مہربانی سے کس طرح کی اونچ نیچ ہے اور نہ بے جا تکلف کا رواج ہے۔ بے شک تمہاری اماں تمہیں یہاں اپنی مرضی سے چھوڑ گئی ہیں مگر اس میں کوئی عجز نہیں۔ تم ہمارے لئے ہماری بیٹی کی طرح ہو جو طرح جی چاہے بے فکر سے رہو۔ مگر خوش رہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کل اپنی اماں سے چلے جانے کے بعد سے تم کچھ زیادہ ہی خاموش خاموش اور اداس سی ہو گئی ہو۔“

شک ہے ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں۔ تمہارے لئے اس اور اس گھر میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ رات کو بھی میرا خیال ہے تم روتی رہی ہو آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔“

فاطمہ پھوپھو کی نرم و ملائم گفتگو سے اس کے دل پر مزید چوٹ لگی۔ باوجود ہزار ضبط کے اس کی آنکھیں دوبارہ بھیگنے لگیں۔ پھوپھو نے فوراً اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا

اور شہد آفریں لہجے میں پوچھا۔

”کیوں۔۔۔ میں کچھ کہہ رہی ہوں نا؟ مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“

مشکبار اور بھی زیادہ بے قراری سے رونے لگی۔

بہت دنوں کے بعد سچا خلوص اور محبت بھرا لہجہ سنائی دیا تھا۔ بے چین روح پر بیٹھے بیٹھے پیار کی مدھ بھری غنڈک پھوار کی طرح برس گئی تھی۔ اسے سکون کا احساس تو بہت گہرا ہوا تھا مگر ساتھ ہی آنسو بھی نکل پڑے۔ جانے کیوں!

جلدی ہی اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور آنسو پوچھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی،

”نہیں پھوپھو۔۔۔ ایسی غیریت والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اب آپ سب کو ہی اپنا سمجھتی ہوں۔ دراصل۔۔۔ کل۔۔۔ مجھے کل یقین نہیں تھا کہ اماں ہم تینوں کو۔۔۔ واقعی چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ بس اس لئے ذرا طبیعت گھبرا گئی تھی۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اس میں گھبرا جانے کی کیا بات ہے!“ انہوں نے نہایت ہمدردی سے سمجھایا۔ ”یہ بھی تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ سنا ہے وہاں سہارا پور میں گرمی اور برسات کی وجہ سے کارے کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ چند دنوں کے بعد جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو وہ تمہیں بلوائیں گی۔ تب تک آرام اور سکون سے یہاں رہتی رہو۔۔۔“

مشکبار خاموش ہو گئی۔

ان کی ان محبت آمیز اور خلوص والی باتوں کا کیا جواب دیتی۔

جتنی اچانکیت اور سچائی ان کی باتوں میں تھی، وہ تو ترس گئی تھی ایسے لہجوں، ایسی باتوں اور ایسے جذبوں کو۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔

بھرہ خود ہی یہ سوچ کر کہ اس کے یوں رونے کا پھوپھو جانے کیا مطلب لیں،

کہیں بھول جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس نماز میں کتنی سنتیں ہوتی ہیں اور کتنے فرض اور نفل وغیرہ۔“

فاطمہ پھوپھو کو اس کی بھولی بھالی باتیں سن کر نہایت افسوس ہو رہا تھا۔ اس کی صاف گوئی سے متاثر بھی ہو رہی تھیں۔

وہ بھی آج دل کھول کر بول رہی تھی۔ شاید اس کے دل کی بھڑاس نکل رہی تھی اور وہ لاشعور میں طور پر ایسا چاہ رہی تھی یا پھر پھوپھو کی تنگداری نے راستہ کھول دیا تھا۔

”پھر تو تم نے قرآن شریف بھی نہ پڑھا ہو گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ اس نے بہت شرمندگی کے عالم میں گردن ہلا دی۔“

پھوپھو کچھ دیر افسوس کے عالم میں سوچی رہی ہیں۔

دھیرے دھیرے اسے بھی اور خود کو بھی چکھا جھلکتی رہیں۔

پھر..... فیصلہ سن لےجے میں اس کی طرف دیکھ کر سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔
”ٹھیک ہے جتنے دن بھی تم یہاں رہو روزانہ صبح میرے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بیٹھا کرو۔ اس کے علاوہ میں تمہیں نماز پڑھنا بھی سکھاؤں گی۔ دھیرے دھیرے تم انشاء اللہ سارے اسلامی امور سیکھ جاؤ گی۔ اس طرح تمہارا دل بھی لگ جائے گا اور اہم ترین باتیں بھی آجائیں گی۔ دیکھو بیٹی! ایک لڑکی کے لئے نماز روزہ اور تلاوت کلام پاک خواہ وہ دن میں ایک دفعہ ایک رکوع ہی کی جائے انتہائی ضروری اور بہتر ہے کبھی کبھی فرصت پا کر میں تمہیں اور بھی بہت سے مسئلے مسائل سے آگاہ کروں گی۔ تم ایک طرح سے نہ صرف یہ کہ بن باپ کی پیچی ہو بلکہ اس لحاظ سے ماں کی اصل متاثر اس کی طرف سے اولاد کو ملنے والی مراثیات اور محبت و الفت سے بھی محروم ہو۔ اس لئے میرے نزدیک تمہارے کام آنا ہمارا فرض بھی ہے اور ثواب کا کام بھی بس شرط یہ ہے کہ تم بھی مجھ سے تعاون کرو تا اور پورے شوق اور لگن سے پڑھنا شروع کرنا۔“

انہیں مطمئن کرنے کے لئے وضاحت سے بولی۔ ”حالات کیسے ہی رہے، اماں نے ہمیشہ رکھا ہمیں اپنے ساتھ ہی ہے یا پھر ہم لوگ اپنی نانی اماں کے ہاں رہا کرتے تھے۔ اس لئے اچانک جب اماں ہمیں چھوڑ کر اکیلا چلی گئیں تو مجھے رونا آگیا۔ اور پھر میں نے ہر بھی سوچا کہ..... اگر آج ہمارے ابا اماں ہوتے تو ہمیں ساتھ لے کر جاتے۔“
پھوپھو کے دل پر چوٹ سی گئی، وہ سوچنے لگیں۔

”..... تو یہ چھوٹی سی حساس لڑکی ہر وقت اس سوچ میں ڈوبی رہتی ہے! آج ہے اس کے گئے باپ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی سچا اور پاک رشتہ نہیں۔“

رنجیدہ لہجے میں کہنے لگیں۔ ”بس بیٹی! یہ تو اپنے اپنے نصیب کے کلکے ہیں۔ ام! کلکے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ نہ تم نہ میں۔ خدا تم کو حوصلہ دے۔ یہ بھائی بڑے ہو جائیں گے اور پھر تمہاری شادی بیاہ ہو جائے تو بہل جاؤ گی۔ اللہ بہت خوشیاں دے گا۔ ام! سے اچھی اچھی دعا میں مانگا کرو۔ آج ہی سے نماز پڑھنی شروع کرو۔ انشاء اللہ سارا پریشانیوں اور دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہر نماز کے بعد ایسا سکون اور سرور محسوس کرو گے کہ صبر و وقار کے کرنا سیکھ جاؤ گی۔“

ان کے آخری جملے سن کر مشکبار نے بے بسی سے سر جھکا لیا اور بے چارگی۔
جواب دیا۔ ”پھوپھو! ہمیں نماز آتی نہیں، بیچ بیچ میں بھول جاتے ہیں۔“

وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ ”کیوں! تمہاری اماں بیانی نے سکھائی نہیں کبھی!“
”اماں خود پڑھتی ہیں نہ انہوں نے کبھی سکھائی۔ نانی کے پاس ہم لوگ بہت رہے ہیں۔ جب ہمارے ابا میاں زندہ تھے تو ایک مولوی صاحب روز ہمیں قرآن شریف پڑھانے اور نماز سکھانے آیا کرتے تھے۔ مگر ابا میاں کے فوت ہو جانے کے بعد ان نے مولوی صاحب کا آئینہ کر دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ پیسے بہت لیتے ہیں۔ طرح طرح سے ہمارے ابا میاں بھی بھول گئے۔ نماز کی دفعہ پڑھنے کی کوشش کی مگر۔۔۔۔۔“

مشکبار جوان کی باتیں بڑی عقیدت، شوق اور غور سے سن رہی تھی ایک دم سے ہی ان سے چمٹ کر رونے لگی۔

پھوپھو اسے ممتاز بھرے انداز میں آہستہ آہستہ تھپک کر خاموش کرانے لگیں۔ اس دوپہر کے بعد مشکبار میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا اور اس خوشگوار انقلاب کا واحد سبب پھوپھو فاطمہ کی سکھ بانٹنے والی ہستی تھی۔

ایک بات اور بھی اس نے خود بخود سمجھ لی تھی۔ اور وہ یہ کہ دن بھر میں سیکینہ بھابی اور نیسہ کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹانے لگی تھی، کبھی آٹا گوندھ دیا۔ کبھی مسالہ پیس دیا۔ صفائی کر دی۔ ان کے بچوں کو سنبھال لیا۔ وہ دونوں یوں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھتی تھیں، اب مزید خیال رکھنے لگیں۔

سب سے پہلے اسے پھوپھو نے فجر کی نماز پڑھنی سکھائی تھی۔ سویرے اس کی آنکھ جلدی کھل جاتی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد سپارہ لے کر پھوپھو کے پاس جا بیٹھتی۔ اس کے سبق سنانے اور مزید یاد کرنے تک سیکینہ بھابی باورچی خانے کا رخ کرتیں۔ وہ سپارہ رکھ کر خوشی خوشی ناشتے کے لئے آٹا گوندھ دیتی، یہ سارے کام وہ دلشاد اور شمشاد کے جاگ اٹھنے سے پہلے پہلے کر لیتی۔ پھر دونوں بھائیوں کو ناشتہ کروانے کے بعد نہلا کر کپڑے بدلوا دیتی اور میلے کپڑے دھو کر پھیلا دیتی پھر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دیورانی جیٹھانی کا ہاتھ بٹاتی رہتی۔

عصر کے وقت دوبارہ پھوپھو کے پاس پڑھنے بیٹھ جاتی۔

قدرتی طور پر وہ ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی تھی۔ بہت جلد ساری نمازیں پڑھنا سیکھ گئی۔ قرآن پاک کا سبق بھی پھوپھو جتنا صبح کے وقت دیتیں، وہ شام کو سنا ڈالتی۔ ان معمولات نے جیسے اسے صبر و سکون کے خزانے عطا کر ڈالے۔ چہرے پر ہر وقت ایک نور اور پاکیزگی احاطہ کئے رہنے لگی۔ اب تک جن سلیقوں اور حسن کا اس کی زندگی

میں دور دور تک بھی شائبہ نہ تھا اس کے اندر جذب ہونے لگے تھے اسے از خود اپنا یہ روپ بہت پسند آیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اب اس کا دل بھی یہاں لگنے لگا تھا۔ اور اس گھر کے سارے افراد دھیرے دھیرے اسے اپنے محسوس ہونے لگے۔ بچوں کے ساتھ شفقت اور بڑوں سے ادب و احترام نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے۔ گھر والوں کے علاوہ کنبے کے آنے جانے والے بھی اس کے اچھے اخلاق اور خوش اطواری کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے تھے۔

یوں رفتہ رفتہ اس نے ایک قطعی غیر اور اجنبی ماحول اور افراد کو اپنا گرویدہ کر لیا اور خود ان میں جذب سی ہو گئی۔

فاطمہ پھوپھو تو اس سے بہت ہی مانوس اور خوش تھیں۔ ہر موقع پر اس کی تعریف میں چند جملے ضرور کہتیں۔ ایسی اطاعت گزار، سمجھ دار، ذہین اور سعادت مند لڑکی جو ان کی ذرا سی محنت اور توجہ سے نکھرتی سنورتی چلی گئی۔



نامہ بیگم کو گاؤں سے گئے تقریباً ایک ماہ گزر گیا مگر انہوں نے پلٹ کر تینوں بچوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ بلوایا۔

مشکبار کے دل و دماغ گو کہ نئے مشاغل میں الجھ کر پہلے کی نسبت بہت بہل گئے تھے لیکن پھر بھی آخر انسان ہی تھی۔ جب بھی رات کے اندھیرے میں ماں کی یاد آجاتی اس کی آنکھوں سے نیند یکلخت اڑ کر رہ جاتی اور وہ ان کے رویے اور سخت دلی پر غور کرتے کرتے رات کے آخری حصے میں سو جاتی۔

اسے حیرت ہوتی تھی کہ اماں کیسی ہو گئی ہیں۔ اگر اسے نہیں تو کم از کم ننھے دلشاد اور شمشاد کا خیال تو کر لیں۔

وہ تو کہنے یہاں کے لوگ ہی نہایت خدا ترس اور نرم دل واقع ہوئے تھے ورنہ طعنے تشنوں کے ساتھ کلیجے چھلنی ہو جاتے۔ سوتیلے رشتے ناتوں کے ساتھ یوں مستقل ہی جڑ کر رہ جانا معمولی بات تو نہ تھی! مگر نامہ بیگم کو ان نزاکتوں کی بھلا کب پروا ہوتی۔

دلشاد نے کئی دن تک رو رو کر مشکبار کا آرام و چین لوٹا تھا۔ مگر پھر بالآخر سنبھل گیا تھا۔۔۔ سنبھلتا نہ تو کیا کرتا۔

ہاں شمشاد کی فطرت کچھ عجیب ہی ٹھس اور بے حس سی تھی۔ اس نے ماں کو

جدائی کی کچھ ایسی پروا نہیں کی تھی۔ یا پھر شروع سے محرومیوں اور تشنگی نے اسے رویے کا عادی کر دیا تھا۔ بہر کیف۔۔۔ اس نے بہن کو تنگ نہیں کیا۔ سارا سارا دن اپنے کم سن بچوں کے ہمراہ نیم کے نیچے کھیلتا رہتا۔۔۔

ایک دوپہر، مشکبار سیکنہ بھابی سے اجازت لے کر بانو کے ہاں آگئی۔ یہ لوگ فاطمہ پھوپھو کے سکے عزیزوں میں سے تھے۔ بانو انہی کی منجھلی لڑکی کا نام تھا۔ اور اسی لڑکی سے پھوپھو نے گل کی نسبت طے کر رکھی تھی۔ گو کہ دیہاتوں میں منگنیاں اور خاص طور پر بچپن کی منگنیاں کسی خاص دھوم دھام سے نہیں رچائی جاتیں۔ تاہم کوئی نہ کوئی ایسی رسم ضرور ادا کر دی جاتی ہے جس کے ذریعے ہر رشتے دار اور خاص و عام کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں لڑکے سے فلاں لڑکی کی نسبت ٹھہرا دی گئی ہے اس طرح ہوتا یہ ہے کہ لڑکی کے بقیہ امیدوار، اس لڑکی کے حق میں دستبردار ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

ایسا ہی گل اور بانو کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

لیکن یہ ہے کہ گل چونکہ فاطمہ پھوپھو کا بہت ہی چہیتا اور لاڈلا بھتیجا تھا مزید یہ کہ سب میں چھوٹا تھا، اس لئے پھوپھو نے ان کی نسبت ذرا اہتمام اور شوق سے ٹھہرائی تھی۔ تین دن تک حلوائی دروازے پر کڑھائی چڑھائے رہا تھا اس لئے کنبے کے ہر چھوٹے بڑے کو اس نسبت کا ایک ایک رتی حال معلوم تھا۔ سب لڑکیوں بالیوں کو وہ دلفریب منظر تو کبھی بھلائے نہ بھول سکتا تھا جب شرماتی بجاتی بانو کو پھوپھو کے ہاں سے آیا ہو اگلا بی رنگ کاریشی جوڑا پہنایا گیا تھا۔

بانو، مشکبار کی تقریباً ہم عمر تھی۔ اس لئے دونوں کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ملتیں تو گھنٹوں ایک دوسری سے باتوں میں مصروف رہتیں۔ بانو اسے بچپن کے قصے اور سہیلیوں کی باتیں سنایا کرتی۔ مشکبار کے پاس اسے سنانے کو کچھ نہ ہوتا مگر وہ اس

کی بھولی بھالی باتیں دلچسپی سے سنتی۔ بانو میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے کبھی بھی مشکبار سے اس کے حالات کریدنے کی کوشش نہ کی تھی۔

اس وقت بھی وہ دونوں ایک پلنگری پر پاس پاس بیٹھتی تھیں۔ بانو ایک میز پوش پر رنگ برنگے ریشمی دھاگوں سے خوشنما چٹھڑیوں والا پھول کاڑھ رہی تھی۔ وہ اس ہنر میں خاصی تیز معلوم ہو رہی تھی۔ مسلسل باتوں میں بھی مصروف تھی اور ہاتھ بھی چل رہا تھا۔



کچی مٹی کا بنا ہوا یہ بڑا سا کچا گھر مشکبار کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی خوبصورتی میں سارا ہاتھ گھر کی عورتوں کا تھا، چکنی مٹی سے بنائے ہوئے گل بوٹے، چھوٹی چھوٹی دیواروں پر رکھے ہوئے برج، کمروں میں برتن سجانے کے چیمبے اور ان پر ابھرے ہوئے نقش و نگار۔۔۔ زمین کا فرش ایسا لپا پتا اور چمکا گویا پکا ہو۔

یہ سب عورتوں کی محنت اور ہنر مندی تھی۔ خاص طور پر رات کے وقت تو یہ گھروند اچاندی کی لہروں میں دھلا دھلایا بہت ہی اچھا لگتا۔ آنگن میں بنی ہوئی بڑی بڑی سالانہ اناج ذخیرہ کرنے کی کچی کوٹھریاں اوپر سے اتنی چکنی چکنی، صاف و شفاف اور چمکتی ہوئی نظر آتیں، جیسے چکنی مٹی کی مخروطی پہاڑیاں کھڑی ہوں۔۔۔۔

بڑے صحن میں پیپل کا بلند و بالا درخت کھڑا جھومتا رہتا۔ ہوائیں زور زور سے چلتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے پتے تالیاں بجا بجا کر رقص کر رہے ہوں۔ بانو سوئی میں نیا دھاگہ پروتے ہوئے شوخی سے بولی۔

”مشکبار! تم بھی اپنا جہیز کاڑھنا پرونا شروع کر دو، آخر کب یہ سلسلہ شروع کرو گی۔“ مشکبار نے شرارت سے اسے دیکھا اور ہنس کر بولی۔ ”میری فکر چھوڑو۔ یہ کہہ

میرے بہانے یہ جتنا چاہ رہی ہو کہ مجھے معلوم ہو جائے تم یہ میز پوش اپنے جہیز کے لئے کاڑھ رہی ہو۔۔۔ کیوں! ہے نا یہی بات!“

وہ قدرے لجا سی گئی۔ مگر ڈھیٹ بن کر جواب دیا۔ ”تو اس میں شک کیا ہے۔ ہمارے ہاں کار و راج ہے جب لڑکیاں سیانی ہو جاتی ہیں سائیں ان کو کپڑے، دھاگے اور سونیاں، کر دیشیے اور سلائییاں وغیرہ خرید کر دے دیتی ہیں اور لڑکیاں فرصت کے اوقات میں تھوڑا تھوڑا کاڑھتی پر وتی رہتی ہیں۔ اس طرح ایک طرف جہیز تیار ہوتا رہتا تھا اور دوسری طرف ماؤں کی فکر کم رہتی ہے۔ شغل کا شغل، کام کا کام۔“

مشکبار اسے ستانے کو بولی۔ ”بڑی اماں دادیوں کے انداز میں سو جتی ہو اور صورت سے ایسی بھولی بھالی لگتی ہو جیسے بات بھی کرنی نہیں آتی۔ تمہارے تو پیٹ میں داڑھی ہے بانو۔“

بانو کو اس کے مثال دینے پر ہنسی آگئی، وہ ذوردار قہقہہ لگا کر بولی۔ ”ایک تو یہ تم شہر والے کہاوتیں بڑی عجیب عجیب دیتے ہو۔ یعنی کہ پیٹ میں داڑھی، گویا میں لڑکی نہ ہوئی داڑھی والا بابا ہو گئی۔“

مشکبار بھی اس کے مذاق پر ہنسنے لگی۔

عین اس وقت جبکہ یہ دونوں باواز بلند ہنس رہی تھیں، گل باہر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے اور اسی طرف آتے ہوئے زور سے بولے۔ ”ارے ارے..... ایسے زور سے مت ہنسو کہ کو ابے چارہ شرما جائے۔“

بانو کی ہنسی میں فوراً بریک لگ گئے۔ اس نے جلدی سے دور پڑی اوڑھنی سنبھالی اور اپنا سامان سمیٹ کر تیزی سے اندر بھاگ جانے کی کوشش کی، مگر مشکبار نے بڑھ کر مضبوطی سے کلائی پکڑ لی اور شرارت آمیز لہجے میں بولی۔

”کہاں بھاگ رہی ہو، بھائی جان ہی تو آئے ہیں کوئی جن بھوت تو نہیں آگیا!“

گل جو آتے ہی دوسری چارپائی پر براجمان ہو چکے تھے چبھتے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ ”ارے بھی تم نہیں روک سکتیں ان کو مشکبار۔۔۔ میں دل ہی دل میں لاحول پڑھتا آیا ہوں۔ ان کا بھاگ جانا تو لازم و ملزوم ہے۔“

مشکبار ہنسنے لگی۔

بانو کھسانی سی ہو کر ان کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔

ایک ہی کنبہ اور ایک ہی گاؤں ہونے کی وجہ سے بانو کا گل سے پردہ تو نہیں تھا اور نہ ہی کبھی بزرگوں نے ایسی ضرورت سمجھی تھی، مگر وہ خود بخود ہی ان سے سامنا کرنے پر جھجکتی تھی۔ کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا تو شرم و حیا سے دوہری ہو ہو جاتی۔

تھوڑی دیر ان تینوں کے درمیان خاموشی کا پردہ حائل رہا۔ پھر گل نے پوچھا۔

”اور سناؤ مشکبار۔۔۔ یہاں دل لگ گی یا اب تک اسی طرح گھبراتی ہو!“

وہ ایک دفعہ پھر ہنس پڑی اور خوش دلی سے جواب دیا:

”اب تو بہت دل لگ گیا۔ سب اپنے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ سنا ئے آپ نے کیوں اتنے سارے دن لگا دیئے۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے اچانک تھم گئی۔ پھر سوچ کر اپنی بات پوری کی۔ ”مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اماں نے ہمیں بلوانے کے لئے بھی آپ کو نہیں بھیجا۔۔۔ شروع میں تو میں ہر روز انتظار کیا کرتی تھی کہ شاید اماں آج بلوا لیں کیونکہ انہیں اکیلے کام وغیرہ کی بھی تکلیف ہوگی۔ مگر بہت دن گزر گئے۔ نہ آپ آئے نہ انہوں نے کوئی اطلاع بھجوائی۔ دلشاد و شمشاد بھی بہت یاد کرتے تھے اور اب آپ ایک ماہ کے بعد آئے ہیں۔ ہمیں لینے بھیجا ہے کیا؟“

وہ ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ گئی۔۔۔ بہت ساری سناڈالیں۔ جیسے پھر کہنے سننے کا موقع نہ ملے گا۔ وہ خاموش ہو گئی تو گل نے مزاحیہ انداز میں ایک ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ ”سب کچھ پوچھ چکیں، یا کوئی سوال باقی رہ گیا ہے؟“ وہ شرمندگی سے ہنس دی۔

بانو نے دھیرے سے اسے چٹکی کاٹی اور شوخی سے مسکرانے لگی۔ اتنے میں گل کو آتے دیکھ کر بانو کی والدہ اور بھابی بھی ادھر ہی آگئیں اور سلام دعا کے بعد حال احوال پوچھنے لگیں۔



بانو انہیں دیکھ کر چپکے سے کھسک گئی۔

مشکبار بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ اور اس کے سارے سوال و جواب وہیں کے وہیں رہ گئے۔

ذرا دیر مزید رکنے کے بعد وہ گھر چلی گئی۔

دل و دماغ میں کھد بد سی مچی ہوئی تھی۔ گل کو ایک مہینے کے بعد دیکھا تھا اور دیکھتے ہی ماں کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ کبھی سوچتی۔

”شاید اماں نے بلوا بھیجا ہو۔ تیاری وغیرہ کر لینی چاہئے۔“

پھر خیال آتا۔

اگر ایسی بات ہوتی تو گل بھائی جان آتے ہی کہہ دیتے۔ لانے کو کہا ہی نہ ہوگا اماں نے۔

گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے شمشاد اس کی ٹانگوں سے آپٹا۔

”آپا۔۔۔۔۔ گل بھائی جان آگئے۔۔۔۔۔ گل بھائی جان آگئے۔۔۔۔۔ منٹھائی لے کر آگئے۔ وہ ہمیں اماں کے پاس لے کر جائیں گے۔۔۔۔۔ گل بھائی جان آگئے۔۔۔۔۔“

مشکبار نے استغماہیہ نظروں سے ریشہ کی طرف دیکھا جو سامنے چارپائی پر بیٹھی کروڑیے سے جھار بن رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”اے یونہی کہہ گئے گل بچے کو بہلانے کی خاطر۔ پھوپھو نے پوچھا تھا۔ کہہ رہے تھے تمہاری اماں نے کہلویا ہے کہ یہاں ابھی تک گرمی کا زور نہیں ٹوٹا ہے۔ اگر بچے

پریشان نہ کر رہے ہوں تو وہیں رہنے دیں پھر بعد میں بلوالیں گے۔“

اس کو رے جواب پر مشکبار کے دل کو دکھسا لگا۔ وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ دلشاد اب تک مزے سے سو رہا تھا، جیسا وہ سلا گئی تھی۔

رئیسہ نے غور سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں! تم خاموش سی کیوں ہو گئیں! کیا اماں بہت یاد آرہی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ بے بسی سے گردن جھکا کر بولی۔ ”میں

نے سوچا تھا شاید اب وہ ہمیں بلوا ہی لیں۔“

”تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے۔۔۔ سچ بتانا!“ رئیسہ نے کروشیاروک کر سنجیدگی

سے پوچھا۔

مشکبار نے اسی انداز میں جواب دیا۔ ”آپ غلط سمجھیں بھابی! ایسی بات کا دریافت کرنا صرف اسی لئے تو نہیں ہو سکتا کہ خدا نخواستہ ہمیں یہاں کسی طرح کی تکلیف ہے۔ مجھے تو بس اماں کی بے پروائی تر تعجب ہو رہا ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ چپ چاپ دلشاد کے پاس لیٹ کر کچھ سوچنے لگی۔

رئیسہ نے بھی مزید بات نہیں بڑھائی۔ دورہ اپنے کروشیئے اور جھار کی طرف

متوجہ ہو گئی۔

مشکبار کے دل میں سواندیشے آرہے تھے، سو جا رہے تھے۔

”اماں نے تو کمال کر دیا بے حسی کی حد گزار دی۔ اب ایسی بھی کیا وہاں گرمی ہوگی کہ خود تو رہی ہیں اور ہم گرمی سہہ نہ سکیں گے! اتنے نازک تو نہیں ہم بہن بھائی۔“

سوچتے سوچتے اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔

خبر نہیں کتنا وقت گزرا ہو گا کہ وہ تیزی سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

دیکھا تو دوسری چارپائی پر گل زانو بیٹھے شرارت سے کہہ رہے تھے،

”اچھا جی۔۔۔ تو آپ پر بھی آپ کی سہیلی صاحبہ کا سایہ پڑ گیا ہے، جیسے وہ سارا سارا دن پڑی اینڈا کرتی ہیں۔ آپ نے بھی خراٹے لینے شروع کر دیئے۔“

وہ سمجھ گئی کہ یہ بانو بے چاری پر فقرے بازی ہو رہی ہے۔

جواب دیئے بغیر وہ اٹھ کر پانی پینے چلی گئی۔ کچی نیند سے اٹھنے پر ایک دم سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔

پانی پی کر واپس آئی تو گل کھانا کھا رہے تھے۔

”آؤ۔۔۔۔ تم بھی شروع ہو جاؤ۔“ وہ مسکرائے۔

”شکریہ۔۔۔۔ بس آپ کھائیے۔“ وہ دلشاد کے قریب بیٹھ گئی۔

جی کو یہی چٹا لگی تھی کہ وہ اماں کی کوئی خیر حیرت سنائیں۔

گل کو جیسے اس کے دل لگی کی خبر ہو گئی تھی۔ کھانا کھا کر انہوں نے ہاتھ دھوئے اور سنجیدگی سے بولے۔

”میں جانتا ہوں مشکبار کہ تم اپنے سوالوں کے جواب لینے کے لئے بے چین ہو۔“

بھئی بات یہ ہے کہ اسی خیال کے تحت میں ہوٹل سے چارپانچ مرتبہ گھر ہو کر آیا کہ

شاید اماں تم لوگوں کو لانے کے لئے کہہ دیں۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم گاؤں میں

ضرور ادا اور پریشان ہو گئی۔ دونوں بھائیوں نے بھی پریشان کر رکھا ہو گا، مگر.....

حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے ایسی کوئی ہدایت یا تاکید نہیں کی، پھر پچھلے دنوں

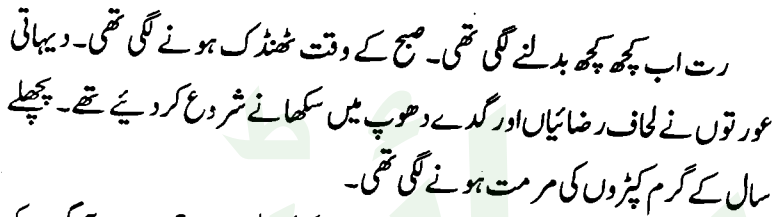
میری کالج میں مصروفیات اس نوعیت کی رہیں کہ میں ذاتی طور پر بھی یہاں نہ آسکا۔ تو

بس جناب یہ مجبوری ہے۔۔۔۔۔ لے جانے کو تو میں تم تینوں کو آج ہی لے جاؤں۔ مگر

پھر اس بات کا خیال آتا ہے کہ وہ سوچیں گی چند دن بچوں کو نہ رکھ سکے۔“

مشکبار نے سوچتے ہوئے لہجے میں پوچھا ”اور..... اماں اکیلی سارا کام کس طرح

کرتی ہیں؟ واقعی میری ضرورت نہیں ہے۔“



دیہاتوں کے پرانے قاعدے کے مطابق اندر کی کوٹھڑیوں، چھتوں اور آنگنوں کی بھی لپائی پٹائی ہونے لگی تھی۔ تاکہ آتے جاؤں میں آرام کے ساتھ کمروں میں سو سکیں اور کپڑے پٹنے کا ڈر خوف نہ رہے۔ بھابی سکی نہ اور ریسہ بھی آج کل زیادہ مصروف رہنے لگی تھیں۔ گو کہ لپائی کا کام کرنے والی تیلی عورتیں آکر مٹی گارے کا کام کرتی تھیں مگر ان دونوں کو ساتھ ساتھ لگا رہنا پڑتا۔

ایک دن فاطمہ پھوپھو بھابھی سے کہنے لگیں۔ ”اے سیکنہ! اس دفعہ تم بڑی کام چوری سے وقت کاٹ رہی ہو۔ اگلے چند دنوں میں رمضانوں کا چاند نظر آنے کو ہے اور تم دونوں ایسے بے فکر ہو رہی ہو کہ نہ سویاں بٹ رہی ہونہ دالیں پھینکی ہیں اور نہ ہی بڑیاں توڑی ہیں۔“

سیکنہ بھابی نے ذرا چڑ کر جواب دیا۔ ”ہائے ہائے پھوپھو! بے فکری کا ہے کی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہی ہیں کہ آج کل سارا دن مٹی گارے سے الجھتے ہو جاتا ہے۔ پھر ہانڈی روٹی بچوں کے سوسو نخرے الگ۔ ذرا ایک طرف سے فرصت ہو لے تو سویاں بھی بن جائیں گی۔“

ان کا لہجہ پھوپھو کو برا لگ گیا، مگر دھیرے سے بولیں۔ ”یہ سارے کام اور بچوں کا ساتھ اللہ رکھے سدا ہی ہوتا ہے یہ کہو آج کل باتیں زیادہ بناتی ہو، کام کم کرتی ہو۔

”ہوں..... اسی لئے.....“ اس کا منہ اتر گیا۔

گل اس کی طرف دیکھ کر قدرے تردد سے بولے۔ ”آخر تمہیں یہاں رہنے میں کیا عار ہے؟ دل نہیں لگتا کیا؟“

وہ جلدی سے بولی ”بھائی جان! اب تو یہاں میرا دل خوب لگ گیا ہے۔ فاطمہ پھوپھو نے تو اس قدر مجھ پر محنت کی ہے کہ کیا بتاؤں۔ نماز پڑھنا سکھایا۔ قرآن پاک بھی ان سے پڑھ رہی ہوں۔ دونوں بھابھیاں اپنی بہنوں کی طرح چاہتی ہیں۔ اور کیا چاہئے مجھے۔ دلشاد اور شمشاد بھی خوب بہل گئے ہیں۔ مجھے تنگ نہیں کرتے۔ بس۔۔۔ ماں چونکہ ماں ہے، اس لئے ظاہر ہے ان کے متعلق بار بار پوچھتی ہوں۔ یہی بات میں ہر کسی سے کہتی ہوں۔ کیونکہ یہاں تو ایسی محبت ملی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ دلشاد کی طرف متوجہ ہو گئی جو سو کراٹھ گیا تھا اور پیشاب کرنے کو کہہ رہا تھا، مشکبار اسے گود میں لے کر نالی کی طرف چلی گئی۔

گل کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

گل ایک ہفتہ گھر پر رہے۔

مشکمار نے پھر پلٹ کر ان سے اماں کا تذکرہ نہیں کیا۔

ان کے چلے جانے کے بعد دوبارہ وہی شب و روز لوٹ آئے۔ ان کے آجائے سے ذرا رونق کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ کبھی بڑی بھانج کو چھیڑ رہے ہیں کبھی چھوٹی کو کبھی بچوں کو دھمکا رہے ہیں کبھی فاطمہ پھوپھو سے لاڈ کر رہے ہیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد ہر کوئی دوبارہ اپنے معمول پر آگیا۔

مشکمار نے ایک بار پھر اپنے آپ کو روزمرہ کے کام کاج میں الجھا لیا۔ پانچوں وقت

اس برس تو ڈھیروں کھجور کے تنکے بھی پڑے سوکھائے۔ کنتی کی چنگیریں اور ٹوکریاں بنائیں ہو۔“

اب سیکنہ بھابی خاموش ہو گئیں۔

یہ حقیقت تھی کہ اس سال وہ قدرتی طور پر ست سی تھیں۔ ورنہ ہر سال برسات کے موسم میں ان کی پھرتی اور تیزی طراری دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ برسات کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی وہ ہاریوں کے پیچھے لگ لیتی تھیں کہ کھجوروں میں نئے پتے پڑ چکے ہوں گے۔ جلدی توڑ کر لاؤ۔ ورنہ دوسرے لوگ لے جائیں گے۔

پھر کھجوروں کے یہ ہرے ہرے پتے یا تنکے، جنہیں یہ لوگ، گھگھے، کہتی تھیں، ہاری لاکر ڈھیر کر دیتے اور یہ لوگ ان گھگوں کو رنگ رنگ کر خوبصورت اور دیدہ زیب چنگیریں، ٹوکریاں اور مختلف چیزیں بناتی رہتیں۔

اس وقت ماحول میں تلخی سی رچ گئی تھی جسے ریسہ نے کم کرنا چاہا۔

”پھوپھو میں نے رمضان تیلی کی بیوی اور لڑکی کو کھلو ابھیجا ہے۔ آج کل وہ تایا کے یہاں سویاں بنوا رہی ہیں۔ پرسوں ہمارے ہاں آئیں گی ہاتھ بٹانے۔“

پھوپھو کچھ نہیں بولیں۔ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئیں۔

پھر مشکبار نے دیکھا کہ ایک دن بچ کر کے واقعی اگلے دن رمضان کی بیوی اور جوان لڑی آگئیں۔ زور و شور سے سویوں کے لئے میدہ چھان چھان کر گوندھا جانے لگا۔ سب کی مصروفیات قابل دید تھیں۔ بڑی بڑی چارپائیوں کو دھوپ میں کھڑا کر کے رسیاں باندھ دی گئیں اور مشین میں سے نکلنے والی سویوں کے لچھے کے لچھے توڑ توڑ کر ان رسیوں پر سوکھنے کے لئے ڈالے جانے لگے۔ مشکبار کے لئے یہ سارے کام نئے اور دلچسپ تھے۔

مشین بھی عجیب دلچسپ چیز تھی۔ بچکی کے پاٹ کی طرح گول سی۔ رمضان تیلی کی بیوی جو ایک دوہرے جسم کی بھاری بھر کم عورت تھی، وہ اس مشین میں خوب کرا کر امیدہ گولوں کی صورت میں ٹھونسنے کے بعد مشین کے گول پاٹ پر دھرنا مار کے بیٹھ جاتی۔

سویاں آن واحد میں کچکا کچکا کر باہر نکلنا شروع ہو جاتیں۔ ان لچھوں کو اس کی لڑکی اور ریسہ، بھی بھابی سیکنہ ہاتھوں پر توڑ توڑ کر رسیوں پر پھیلانے لگتیں۔ اس طرح ایک پہر دن بھی نہ گزرا تھا کہ کافی سویاں تیار ہو گئیں۔

شام کو سیکنہ بھابی نے بھون کر تھوڑی سی سویا پکائیں یہ سویاں بازاری سویوں کے مقابلے میں تھیں تو خاصی موٹی موٹی۔ مگر کھانے میں ان کی لذت اور خوشبو بہت مخصوص قسم کی تھی۔ جو مشکبار کو بہت ہی بھلی لگی۔

بعد ازاں ان سویوں کو بھوننے کا مسئلہ ہر سال کی طرح فاطمہ پھوپھو کے ذمے تھا۔ اور وہ تیار بیٹھی تھیں انہوں نے بڑے آگن میں بنے تنور میں خوب لکڑیاں جھونکیں۔ حتیٰ کہ ان کی جلائی ہوئی لکڑیوں سے تنور سرخ ہو گیا۔ پھر انہوں نے تمام کو نکلے اور راکھ باہر نکال دی۔ ایک کپڑے سے تنور کو اندر سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ لیا۔ اس تیاری سے فارغ ہونے کے بعد سویاں بڑے اہتمام کے ساتھ توڑ توڑ کر اس تنور میں بھر دیں۔

اور جب یہ سویاں دوبارہ تنور سے نکالی گئیں تو خوب گلابی گلابی اور مہکی مہکی ہو رہی تھیں۔ اب انہیں پکاتے وقت بھوننے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ آرام کے ساتھ مکے میں سے نکالو اور پکا کر کھاو۔

مشکبار کو ان سب تیاریوں سے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں رمضان المبارک کا استقبال کس احترام اور اور پر مسرت انداز میں کیا جاتا ہے۔



رمضان المبارک کے آغاز سے ایک دو دن قبل ہر امیر و غریب پوری طرح تیار ہو کر پاک صاف ہو چکا تھا۔ گھر تو گھر چوپائیں اور بیٹھکیں تک اجلی اجلی اور صاف ستھری کر دی گئی تھیں۔ ایسا اہتمام، ایسی خوشی، ایسا استقبال اور ایسا عظیم الشان سواگت --- جو شہروں میں شاید عید منالینے کی حد تک محدود رہتا ہے۔

بچہ بچہ خوش ہو ہو کر اعلان کر رہا تھا کہ، آہا۔۔ ہم بھی روزے رکھیں گے۔ جس شام رمضان المبارک کا چاند نظر آنے کو تھا، لوگ باگ نماز پڑھ کر مسجد سے سیدھے بڑے میدان میں جمع ہو کر آسمان پر چاند تلاش کرنے لگے۔ گلیوں، بازاروں میں پر مسرت سا ہنگام اور رونق نظر آرہی تھی۔ لڑکیاں بالیاں کوٹھوں پر چڑھ کر اس مقدس تلاش میں شریک ہو رہی تھیں مگر چاند ابھی کسی آنکھ کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ مشکبار بھی ایسی لڑکیوں میں شامل تھی اور اس وقت وسیع و عریض چھت کے ایک کونے میں آسمان کی طرف ٹٹکی لگائے کھڑی تھی۔

عین اس وقت جبکہ چاند کا مہین سا، رو پہلا روشن مکھڑا اس کی نظروں میں سما چکا تھا اور اس نے جلدی سے دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے، گل ایک ایک کے بجائے دو دو زینے چڑھتے ہوئے اوپر آئے اور چپ چاپ اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے۔ مشکبار نے شام کو ہی سن لیا تھا کہ گل آگئے ہیں۔ اس وقت ان کے قدموں کی چاپ بھی پہچان لی تھی۔ اس نے مختصر سی دعا مانگ کر جلدی سے ہاتھ گرا لئے اور پیچھے مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”لیجئے --- ہمیں بھی ایک بابرکت پھونک مار دیجئے مولانا“ وہ اپنا چہرہ اس کی طرف بڑھا کر بولے۔

مشکبار جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور جلدی سے موضوع بدلنے لگی۔

”السلام علیکم بھائی جان! رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا۔“

انہوں نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”وعلیکم السلام بہنا! ویسے میں پہلے ہی چاند دیکھ آیا ہوں۔ خیر اس خیر و برکت والی اطلاع کا شکریہ۔ اب آپ ایک اطلاع سنئے، آپ کا بلاوا آیا ہے سہارن پور سے۔“

”ہائے سچ!“ وہ اچھل پڑی۔ ”کیا کہلوایا ہے اماں نے؟“
گل اس کے قریب سے ہٹ کر چہار دیواری کے پاس چلے گئے اور نیچے جھانکتے ہوئے بولے ”کچھ نہیں۔۔۔ فقط اتنی تاکید کی ہے کہ عید سے ایک ہفتہ قبل تینوں بچوں کو ہمارے پاس چھوڑ جانا، ان لوگوں کے کپڑے وغیرہ سلوانے ہیں۔“
”اوہ۔۔۔ اتنے دور کی تاریخ سن کر وہ چپ کی چپ رہ گئی۔
گل اس سے زیادہ بھی کچھ باتیں کرنی چاہ رہے تھے۔ مگر تبھی نیچے سے ان کے کسی دوست نے آواز دی اور وہ نیچے اتر گئے۔

رمضان المبارک کے بابرکت و مقدس مہینے میں مشکبار نے اس خوبصورت گاؤں میں ایسے ایسے روح پرور نظارے دیکھے کہ پھر آئندہ چل کر ساری زندگی میں اس کے لئے مشعل راہ بن گئے۔

وہ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتی کہ وہاں روزہ نہ رکھنے کا سرے سے کوئی سوال ہی نہ ہو تا تھا۔ اس ذوق و شوق اور اہتمام سے سحری میں اٹھایا جاتا اور گھر سے تازہ کھانے پکینے کی خوشبو، لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں، بچوں کے شور و شغب کی پکاریں آتیں گویا دن کا وقت ہو۔ سحری کے بعد گھر گھر سے قرآن پاک پڑھنے کی آوازیں ابھرتے لگتیں۔

ہر وہ بچہ جو دس بارہ برس کا تھا، اپنے لئے روزہ فرض سمجھتا۔ نہ اسے ماں باپ دھمکاتے، نہ سارا دن رحم طلب نگاہوں کا نشانہ بنتا۔ نہ یہاں شہر والوں کی طرح سے روزہ کشائی وغیرہ کا تصور تھا۔ روزہ اور نماز سر اسر خدا کی راہ میں رکھا جاتا اور نماز پڑھی

دروازے پر رکنے کی آواز سنائی دی، فاطمہ پھوپھو کا دل..... دھڑک کر حلق میں آٹکا۔
 نائمہ بیگم کی آواز بلند بین کرنے کی سی سریلی اور تیز پکار صاف سنائی دے رہی
 تھی۔۔۔۔۔ ”ارے رئیسہ! نصیبوں جلی۔۔۔ تم کہاں ہو۔ دیکھو تمہارا سہاگ اجڑ گیا۔۔۔
 چوڑیاں توڑ ڈالو۔۔۔۔۔ ہائے جوان جہان الیاس کیسے پھنڑ گئے سب سے۔۔۔۔۔“

جاتی۔ تراویح کے وقت مسجد میں تو کھپا کھپ بھری ہی ہوتی، گھروں کے بڑے بڑے کشادہ
 آگن بھی عورتوں اور لڑکیوں سے پٹے رہتے۔ بہت سے گھرانوں کی لڑکیاں اکثر تراویح
 مل جل کر ادا کرتیں۔ سحری میں عام طور پر ایک دوسرے کے ہاں آتی جاتیں۔
 پھوپھو کے ہاں باقاعدہ ایک مرغافانہ کے وقت اور دوسرا سحری میں ذبح ہوتا تھا
 جو اسی وقت پکایا جاتا۔ نہ وقت کی کمی کا شکوہ۔۔۔ نہ کام چوری۔۔۔

رمضان المبارک کا پہلا جمعہ گزرتے ہی گھر گھر عید کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور
 دھڑا دھڑا کپڑے سلنے لگے۔ حدیث کے مطابق ہر کسی کا کہنا تھا کہ روزوں میں کسی
 اخراجات کا خدا حساب نہیں لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ پھوپھو کے ہاں سب کے سال سال
 بھر کے جوڑے آگئے تھے۔

شاید ستر ہواں یا اٹھارواں روزہ تھا۔

الیاس بھائی فاطمہ پھوپھو سے کہنے لگے۔

”کل مجھے شہر جانا ہے، درزی سے عید کے کپڑے لے آؤں۔ آپ کو جو کچھ منگوا
 ہو، سوچ کر بتادیں کیونکہ پھر روزے کی وجہ سے بار بار شہر جانا نہ ہو سکے گا۔“

پھوپھو نے دونوں بہوؤں سے صلاح مشورہ کر کے ایک لمبی فہرست سامان آ
 لکھوا کر ان کے سپرد کر دی۔ جو چیزیں انہوں نے گھر کے بچوں کے لئے منگوا
 تھیں، ان میں مشکبار، دلشاد اور شمشاد کو بھی برابر کا شریک رکھا تھا۔

مشکبار آج کل اماں کے پاس پہنچنے کے لئے دن شمار کر رہی تھی۔

اگلے دن کا ذکر ہے۔۔۔۔۔

لوگ باگ تراویح ادا کرنے میں مشغول تھے۔ رات کے نو دس بجے کا وقت ہو گا۔

پھوپھو کے آگن میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں تراویح پڑھ رہی تھیں۔۔۔

اچانک گلی میں آنکھ پھولی کھیلتے کھیلتے شور مچانے لگے۔ ساتھ ہی بھاری بھر کم گاڑی۔

آواز کیا تھی، نائم بم تھا۔۔۔

تھوڑی دیر کے لئے توجہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

ہر سینے میں سانس اندر ہی اندر الجھ کر رہ گیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

نائم بیگم کی آواز جس جس کے کان تک پہنچ پائی تھی اسکی تراوت ادھوری رہ گئی۔

کیا پڑھ رہے تھے۔۔ کیا پڑھنا تھا؟ ایک سینکڑ میں حافظے سے نکل گیا۔

خبر ایسی المناک اور روح فرسا تھی کہ بندہ جیسے خدا کو بھول بیٹھا اور یکبارگی سب

کے سب بیرونی دروازے کی طرف لپکے۔

سب میں آگے بھابی سیکنہ تھیں۔ پھر بدحواس اور ہوش سے بے گانی رئیسہ۔ ان

دونوں کے پیچھے بانو، اس کی بہنیں ماں، مشکبار اور کئی دوسری۔۔۔۔

فاطمہ پھوپھو سب سے پیچھے مصلے پر کلیجہ پکڑے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

ان کی زبان سے بار بار ایک ہی کلمہ نکلے جا رہا تھا۔۔۔

”الہی خیر۔۔۔ میرے مولا خیر۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔!!“

ان کے سارے جسم کی جیسے جان نکل چکی تھی۔ گھٹنوں میں اتنی ہمت نہیں رہی

تھی کہ وہ اٹھ کر ایک قدم بھی چل سکتیں۔ ٹانگیں من من بھر کی ہو گئی تھیں۔

دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا،

نائم بیگم دروازے کی دہلیز پر آنکھوں پہ رومال رکھے کھڑی ہیں۔

بھابی سیکنہ ٹھٹھک کر وہیں کی وہیں تھم گئیں۔ زمین نے گویا پاؤں جکڑ لئے، لیکن

رئیسہ ان کے عقب سے نکل کر نائم بیگم کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور انہیں جھنجھوڑ

کر چلائی۔

”کیا ہو گیا آپا بیگم۔۔۔ ابھی آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ ان کو کیا ہو گیا؟!! وہ کہاں

ہیں۔۔۔! ہائے میرے اللہ کچھ تو بتائیے۔۔۔!!“

لیکن نائم بیگم نے جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر اسے گلے سے چٹا لیا اور

رونے لگیں۔۔ اس دہشت ناک منظر نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

سمجھ میں کچھ نہ آنے کے باوجود، بہت کچھ عقل سمجھا رہی تھی۔

سیکنہ بھابی گویوں لگ رہا تھا جیسے غش کھا جائیں گی۔ رئیسہ کا کوئی حال ہی نہ تھا۔

ایک منٹ کے اندر اندر وہ مردوں میں رہی تھی نہ زندوں میں۔ اوپر سے نائم بیگم اس

سے چٹی اب تک رومال میں منہ چھپائے چمکوں پہنکوں روئے چلی جا رہی تھیں۔

دفعۃً باہر سے مردوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے

دروازے کے قریب آکر تھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا، ”ہٹو۔۔۔۔۔ راستے سے الگ ہو

جاؤ۔ دروازے میں کیوں جھگھٹا لگائے کھڑی ہو۔“

فوراً ہی دوسری آواز نے بھی حمایت کی۔

تب کسی عورت نے رئیسہ اور نائم بیگم کو پکڑ کر دہلیز پار کرادی۔ باقی عورتیں

بھی دروازے سے ادھر ادھر ہٹ گئیں۔

ان لوگوں کے ایک طرف ہٹتے ہی تین اجنبی صورتوں والے سفید پوش مرد اندر

داخل ہوئے۔ ان میں سے دو نے ابا میاں کو اپنے بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔ جو ہوش

میں کم اور غشی کی سی کیفیت میں زیادہ لگ رہے تھے۔

ابامیاں کو اس ناقابل یقین حالت میں دیکھ کر کئی عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ اسی اثناء میں کسی نے مسجد تک اس نئی اور المناک صورت حال کی اطلاع پہنچا دی۔ آن کی آن میں گلی کچھا کچھ بھر گئی۔

گلی سے باہر تک سر ہی سر نظر آنے لگے۔

وہ بھاری بھر کم ٹرک، جس پر نامہ بیگم اور ابامیاں کو وہ تینوں سفید پوش اجنبی لے کر آئے تھے، اب تک دروازے کے سامنے کھڑا تھا، اور اس کے گرد بدحواس و متوحش مردوں اور لڑکوں بچوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

ٹرک کے پیچھے دروازے پر گل سر جھکائے انتہائی رنجیدہ اور اپنے آپ سے بے گانے کھڑے تھے، آنکھیں سرخ آنکارہ ہو رہی تھیں، جیسے بہت دیر تک روتے رہے ہوں۔ اچانک مجمع کو چیرتے ہوئے عباس گلی کی ککڑ پر نمودار ہوئے اور دوڑتے ہوئے ٹرک کی طرف لپکے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا! اور کیا ہونے والا ہے! وہ تو ابھی ابھی تراویح پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ یوا لگ رہا تھا جیسے درحقیقت اصل معاملہ کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ ہاں یہ ہر کسی کو معلوم ہو چکا تھا کہ ابامیاں ایک ٹرک پر آئے ہیں اور ان کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔

گل کو ٹرک کے پاس عجیب و غریب حالت میں سر نہواڑے کھڑے دیکھ کر ا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ چھٹی حس پکار پکار کر کوئی منحوس خبر سنانے لگی۔

”کیا ہو گیا..... کیا بات ہے گل! ابامیاں تو..... خیریت سے ہیں؟“ انہوں نے دا

ہی سے چلا کر دریافت کیا۔

گل نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔



بڑے بھائی کو رو رو دیکھ کر جیسے ضبط کے بندھن یکنخت ٹوٹ گئے۔ ان کے منہ سے بے اختیار ایک رکی رکی سی چیخ نکل گئی اور دیوانگی کے عالم میں چلانے لگے۔

”ہم لٹ گئے بھائی جان..... الیاس بھائی گئے..... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے بھائی جان۔“

موقع پر موجود افراد ہونفوں کی طرح ایک دوسرے کی صورت تکٹنے لگے یوں گویا گل نے کوئی انجانی زبان..... استعمال کی ہو۔

الیاس کو بھلا کیا ہوا تھا! ہو کیا گیا الیاس کو۔۔۔ سب کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے وہ!۔۔۔ اور بھلا کیوں؟

وہ تو بھلے چنگے ہنستے مسکراتے ہوئے کل صبح ہی سہارن پور روانہ ہوئے تھے، گھر والوں کی بہت ساری فرمائشوں اور ضروریات زندگی کا مختلف سامان خریدنے، اور ایسا تو ہر سال عید سے پہلے ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ سالانہ خریداری کے لئے شہر جاتے تھے۔ دو ایک روز اپنے ابامیاں کے پاس رہ کر سامان وغیرہ خریدتے اور پھر خوشی خوشی اپنے گاؤں لوٹ آتے تھے۔

مگر اس دفعہ کیا ہوا تھا!

آخر یہ گل رو رو کر، چلا چلا کر کیا کہہ رہے تھے!

عباس کے کانوں میں سائیں سائیں سیٹیاں بجنے لگیں۔ دماغ ماؤف سا ہو گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چکراتا سر تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔۔۔

عین اسی وقت وہ آدمی جو شہر سے ابامیاں کے ہمراہ آئے تھے، اندر سے نکل آئے۔ چند منٹ ابامیاں کے رشتے کے چند بھائیوں اور خاندان کے عمر رسیدہ بزرگوں

الیاس کا چانک ایکسٹنٹ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

اس جوان جہان موت نے اپنے پرائے سب کا دل دہلا کر رکھ دیا تھا، گھر کا ہر فرد نیم پاگل ہو چکا تھا۔

ابامیاں کے دل پر اس ناگہانی حادثے اور جوان بیٹے کی المناک موت نے بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔۔۔ دنوں ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ چند دن کے اندر اندر جھٹک کر رہ گئے تھے۔

جس روز الیاس گاؤں سے ان کے پاس پہنچے تو سیدھے انہی کو سلام کرنے حاضر ہوئے تھے۔ رات بھر رہے پھر اگلی صبح ذرا سویرے ہی بازار نکل گئے تھے۔ اس وقت تک ابامیاں گھر پر ہی آرام کر رہے تھے وہ اپنے آفس دس ساڑھے دس کے قریب جاتے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہونے کی وجہ سے آرام زیادہ کرتے۔ اس لئے الیاس ان کے اٹھنے کا انتظار کئے بغیر نامہ بیگم کو بتا کر چلے گئے۔ گاؤں میں بھی خاصا کام تھا۔ اس لئے انہیں زیادہ سے زیادہ..... کل..... واپس لوٹ جانا تھا۔ گھر کے ملازم کو وہ سامان وغیرہ اٹھانے کے لئے ساتھ لے گئے تھے۔

لیکن ابھی انہیں گھر سے نکلے بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ واپس آگئے۔ وہ رقم کی تھیلی گھر پر بھول گئے تھے۔

رقم لے کر واپس چلے۔ اور عین اس وقت جب سامنے کی سڑک پار کر رہے تھے، ایک بھاری بھر کم گاڑی انہیں پہیوں تلے کچلتی ہوئی نکل گئی اور انہوں نے موقعہ واردات پر ہی دم توڑ دیا۔۔۔ شاید دوسری تیسری سانس بھی نہ لے پائے تھے۔

ابامیاں اسی وقت سو کر اٹھے تھے۔ جب لرزتا، ہانپتا، کانپتا ہوا ملازم یہ اطلاع ان تک پہنچائے آیا۔

اس ناگہانی حادثے نے ان کے ہوش و حواس معطل کر دیئے اور وہ بالکل ہی ہاتھ

سے کچھ بات چیت کی پھر آگے بڑھ کر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

اس نے اپنی سیٹ سے اتر کر ٹرک کے پیچھے لگا ہوا تختہ جو رسیوں سے بندھا ہوا تھا، کھول کر نیچے گرادیا۔

اونچے سے پلنگ پر کوئی سر سے پاؤں تک سفید براق چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ چپ چاپ۔۔۔ خاموش۔۔۔ سکون و سکوت کی گہری آغوش میں سویا ہوا۔

گل یہ نظارہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر پچھاڑیں کھانے لگے۔

چند باہمت مردوں نے کلمہ پڑھتے ہوئے پلنگ ٹرک سے نیچے اتار لیا۔ اور یہ پلنگ ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا ابامیاں کے گھر کے بڑے آنگن میں پہنچ گیا۔

پورے گاؤں میں اک کہرام مچ چکا تھا۔ جس جس کو اس المناک حادثے کی اطلاع ملی رہی تھی، وہ بھاگا چالا آ رہا تھا۔

حتیٰ کہ ذرا سی دیر میں حزاروں کی جھونپڑیاں خالی ہو چکی تھیں۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔

ہر دل نوحہ کناں تھا۔

آہوں کی یورش۔۔۔ آنسوؤں کی برسات اور بین کرنے کی بوچھاڑ سے درود یوار

دہلے جا رہے تھے۔

ہر کوئی اپنے دکھ کا اظہار اپنے طور پر بھرپور انداز میں کر رہا تھا اور الیاس۔۔۔

وہ سب کے رنج و غم سے بے نیاز۔۔۔

ایک ابدی نیند سو رہے تھے۔

انہیں اب کسی کا شور، کسی کا بین، کسی کی پکاریں اور کسی کا رونا وادپس نہیں بلا سکتا تھا۔



پیر چھوڑ بیٹھے۔۔۔ کیا ہنستا مسکراتا بیٹا نکل ان کے پاس آیا تھا اور آج بے سان و گمان کیسا اجل نے ان سے ان کا لختِ جگر جھپٹ لیا تھا۔ جیسے تھا ہی نہیں کبھی۔

اس اچانک حادثے نے انہیں سوچنے سمجھنے کے لائق ہی نہ رکھا۔ گھبراہٹ تو نامہ بیگم بھی گئی تھیں۔ آخر کو انسان تھیں۔ ایک عورت کا حس اور گداز دل پہلو میں رکھتی تھیں۔ حادثہ بھی اس نوعیت کا تھا کہ دشمن بھی ہوتا تو تھرا اٹھتا۔

لیکن نامہ بیگم، ابامیاں کی نسبت تھیں حوصلہ مند۔ جب انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے ہیں۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے اٹھائی جا چکی تھی۔ بھاگ دوڑ کون کرتا۔ سہارن پور میں کوئی عزیز واقارب بھی نہیں تھے۔ لے دے کے گل تھا تو وہ بھی ہو شل میں۔ ان کو تو بھائی کے آنے کی اطلاع بھی نہ پہنچ سکی تھی کہ وہ راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ اور پھر اس اچانک روح کھینچ لینے والے ایسے کو سن کر خدا معلوم ان کی کیا حالت ہو جاتی!



ابامیاں کا چہرہ اسی گھر پر ہی موجود تھا، کچھ دیر قبل ان کو لینے آیا تھا۔ نامہ بیگم نے دانشمندی سے کام لے کر فوراً چہرہ اسی کو ابامیاں کے چند قریبی اور خاص دوستوں کے ہاں یہ اطلاع پہنچانے دوڑا دیا۔ نتیجے کے طور پر ان لوگوں نے آکر نہ صرف یہ کہ تمام معاملات سنبھال لئے بلکہ ابامیاں کی بھی بروقت دیکھ بھال کر لی۔

بعد ازاں انہی لوگوں نے پوسٹ مارٹم کی رسم کارروائی کے بعد سول اسپتال سے لاش حاصل کی، گل کو بلوایا، آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ایک ٹرک کرائے پر لے کر، ابامیاں، نامہ بیگم، گل اور الیاس کو گاؤں تک پہنچانے آئے۔

گھر کے شوخ و شریر بچے سہم کر رہ گئے تھے۔ بڑوں کے منہ سے بات نہیں نکلتی

تھی۔ سب آپس کے رشتے دار تھے ایک دوسرے کے دکھ کاٹنے نہ کٹ رہے تھے۔ اگلے دن جب جنازہ اٹھا، کوئی عورت ایسی نہ تھی جو دھاڑیں مار مار کر نہ رو رہی ہو۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر اور بین کر کر کے ان کی آوازیں بیٹھ گئیں۔ بمشکل تمام مردوں نے آخری دفعہ منہ دکھانے کے بعد جنازہ آنگن سے اٹھایا۔ ورنہ ایک دوسرے کے اوپر روتی جھینکتی عورتیں گری پڑ رہی تھیں۔ ایک محشر ہاتھ چاروں طرف۔ اس وقت، جبکہ میت اٹھائی جا رہی تھی، اک عجب منظر دیکھنے میں آیا۔

دراصل الیاس ایک خالص دیہاتی شخص تھے۔ کھیتی باڑی میں انہیں عباس سے بھی زیادہ دلچسپی تھی۔ فصلوں کے اتار چڑھاؤ، بوائی، چھلائی اور کٹائی وغیرہ جیسے کاموں میں جہاں پیش پیش رہتے تھے، وہیں انہیں اپنے مویشیوں سے بھی حد درجہ الفت تھی، بھینس، گائے، بکری، بیل اور گھوڑے سے لے کر معمولی مرغی کے چوزے تک ان کی نگاہ میں رہتے۔ اور وہ سب کے چائے پانی کا انتظام ہر وقت اپنی نظر میں رکھتے تھے۔ اگر کسی جانور کو کہیں چوٹ وغیرہ لگ گئی ہے یا بیمار ہو گیا ہے تو الیاس انسانوں کی طرح اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرتے۔ ان دن رات کی تیمارداریوں اور محبت نے بے زبان جانوروں کو بھی ان کی پہچان کروادی تھی۔ اڑیل سے اڑیل گھوڑا اور بیل بھی انہیں قریب پا کر رام ہو جاتا۔

ان کی ایک پیار بھری چھکی سے جانور سر جھکا دیتے اور محبت سے اپنا منہ ان کے بازو سے رگڑتے اور ان کے ہاتھ چاٹنے لگتے تھے۔

تمام جانوروں میں خاص طور پر ایک بیلوں کی جوڑی اور ایک ریسہ کو جہیز میں ملی بھوری بھینس تو ان کے قدموں کی آہٹ تک پہنچاتی تھی۔ اگر کسی روز اتفاق سے الیاس گھر پر موجود نہ ہوتے اور رات سے ان تینوں کو اپنے ہاتھ سے چار اڈالنے نہ آتے تو یہ تینوں آدمی رات تک زنجیریں تڑواتوا کر بھاگنے کی مشق جاری رکھتے اور سب کو

پریشان کرتے۔

اس اچانک آپڑنے والی افتاد سے اس دن کسی نے مویشی کھولے اور نہ چرواہا آ سب جانور اپنے اپنے کھونٹے سے بندھے رہے۔

کہنے والے کہتے ہیں اور بہت سے دیکھنے والوں نے آنکھوں سے مویشی خانے میں جاکر دیکھا کہ دونوں بیلوں اور بھوری بھینس کی آنکھوں سے آنسو باقاعدہ قطروں صورت میں بہہ رہے تھے اور جس وقت لوگ کلمہ پڑھتے ہوئے میت باہر لے جا رہے تھے تو بھینس کے زور زور سے ڈکرانے کی آواز ہر کسی نے سنی۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اس طرح ایک وہ شخص جو بہت سارے جذبوں اور محبتوں کی پہچان تھا، تہہ زمین اتر گیا۔

ایک دن اسی رونے دھونے میں بیٹا۔۔۔ دوسرا بھی گزر گیا۔ سوئم آگیا۔

رئیسہ کے منہ میں ایک کھیل کا دانہ بھی اڑ کر نہ پہنچا۔

اسے گود والے بچے کے سوا کوئی..... بھی یاد نہ تھا۔ بس وہ سینے سے چٹا، سوا چھاتیوں کو چوستا رہتا جن میں..... غم اور فاقہ کشی کے باعث دودھ کی دھاریں ہم خشک ہو چکی تھیں۔ مگر اس دیوانی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ سب عورتیں دانے پڑھنے میں مصروف تھیں۔

رئیسہ بھی ایک کونے میں منہ ڈھانپنے، گود کے بچے کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ اس قریب مشکبار اور بانو، دانے پڑھنے میں مشغول تھیں۔

مشکبار بھی الیاس کر مرگ ناگہاں پر جی بھر کے روئی تھی۔۔۔۔ اسے جانے کیا پھوٹ پھوٹ کر رونا آیا تھا۔ اپنے رونے میں اس نے اپنی امی کو بھی قابل توجہ نہ سمجھا تھا۔ اے یوں لگتا تھا جیسے اپنا ماں جلیا ہمیشہ کے لئے چھڑ گیا ہو۔

دانے پڑھتے پڑھتے مشکبار نے سر اٹھا کر دیکھا تو چادر اوڑھے ہوئے ایک

رسیدہ عورت اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی اس کونے کی طرف بڑھتی چلی گئی جہاں رئیسہ منہ ڈھانپے بیٹھی تھی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے بانہیں پھیلا کر رئیسہ کو سیٹ لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اسے دیکھ کر رئیسہ بھی بکھر گئی۔ اس کے بین سے درود یوار کا پٹنہ لگے، آج تو اس کی آہ وزاری دیکھی نہ جا رہی تھی۔ رورو کر وہ بے حال ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے دانے پڑھنے والی عورتیں انہی دونوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ بانو اور مشکبار بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اچانک مشکبار کے قریب بیٹھی ہوئی سکی نہ بھابی کو جانے کیا سوچھی، اپنی جگہ سے کھسک کر ان دونوں کے پاس گئیں اور انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے کرتے بڑے عجیب سے لہجے میں رئیسہ سے کہنے لگیں۔

”ایباب بس بھی کرو..... اور بھلا تم کیوں رورہی ہو! رونا تو مجھے چاہئے جس کے حق پر اب تم ڈاکہ ڈالو گی سوت بن کر۔“

رئیسہ کے رونے اور ہچکیوں سسکیوں میں جیسے ایک دم بریک لگ گئے اور وہ یکلخت خاموش ہو کر آچل سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی۔

محفل پر سناٹا سا چھا گیا۔

مگر نہ کسی اعتراض کیا اور نہ ہی سکی نہ بھابی کو ٹوکا۔

خلاف توقع خود رئیسہ سے کوئی جواب بن پڑا اور نہ اس نے احتجاج کیا۔

اسی وقت کسی نے مشکبار کو پکار لیا کہ دلشاد دور ہے۔

وہ اندر سے اٹھ کر باہر آگئی۔ بانو بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ آئی تھی۔

مشکبار نے روتے ہوئے دلشاد کو گود میں اٹھالیا اور خیر انگی کے عالم میں بانو سے

صبر نہ ہو سکا۔ آخر کو عورت ہی ہیں۔ ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تو وہ بھی کہہ گزریں۔ خواہ کوئی طنز سمجھ یا حقیقت۔“

مشکبار کچھ سوچتے ہوئے بولی ”خیر۔۔۔ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ نکاح کیا جائے۔ عباس بھائی اور بلکہ خود ریشہ بھابی کی مرضی، وہ نکاح کریں یا نہ کریں! انکار کر دیں!“

”او نہہ۔۔۔۔۔ انکار کر دیں۔“ بانو جائے کیوں دھیرے سے ہنس دی۔

”ان تینوں میں سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے سامنے دم مار سکیں۔ اور ایسا کئی وجوہات کی بنا پر مجبوراً بھی کیا جائے گا۔ اول تو یہ کہ اب الیاس بھائی کے پانچوں بچے بے آسرا ہو گئے۔ باپ سے تو قدرتنا محروم ہو گئے۔ جیتے جی ماں سے بھی کس طرح چھڑوا لیے جائیں! اور بغیر شوہر کے بھابی اب اس گھر میں کیسے رہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کا سہارا چاہئے۔ اب چونکہ شوہر کا انتقال ہو گیا ہے تو سسرال سے بھی ان کا پہلے جیسا ناتہ نہیں رہ سکتا۔ سب میں بڑی بات یہ کہ ان کے والدین اور بھائی ہی انہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ میکے میں جا کر رہنے سے یہ ہو گا کہ ممکن ہے بچے ہی در بدر ہو جائیں۔ بھاگ کر ماں کے پاس جائیں گے تو دوڑ دوڑ کر اپنی ودھیال بھی آئیں گے۔ اس طرح ان کے خیالات دو طرف بٹ جانے کا خطرہ ہے۔ پھر جب یہی بچے جوان ہوں گے تو زمینوں اور دیگر جائیداد میں اپنا حق علیحدہ سے مانگ سکتے ہیں۔ جبکہ ہم گاؤں کے رہنے والوں میں ایسی باتوں کو عیب سمجھا جاتا ہے ایسی ہی چند وجوہات مزید ہیں جنہیں خاندان کے بزرگ زیادہ صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام مصلحتوں کے تحت ہمارا یہ بہت پرانا رواج ہے کہ اگر خدا نخواستہ کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو مستقبل میں بہت ساری الجھنوں سے بچنے کی خاطر سسرال والے آپس میں اسی گھرانے میں کسی سے اس کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔ اگر جیٹھ ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ بعض گھروں میں تو دیوروں تک سے نکاح ہو جاتا ہے۔“

دریافت کیا۔

”بانو! یہ کیا قصہ ہے بھلا! ریشہ بھابی کس سے چٹ کر اس قدر رو رہی تھیں اور پھر بڑی بھابی نے انہیں اتنی سخت اور غلط بات کیوں کہی۔۔۔؟ میں تو حیران ہوں کسی نے ان کو بھی منع نہ کیا! ریشہ بھابی کا دل کتنا ٹوٹا ہو گا؟“

بانو نے اس کی پوری بات قفل سے سنی اور دھیرے سے جواب دیا۔

”اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ریشہ باجی یا کوئی اور کیا کہہ سکتی ہیں۔ لیکن بھابھی بے چاری سچ کہہ رہی تھیں درحقیقت قسمت تو انہی کی خراب ہے۔“

مشکبار نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر کہا ”ارے۔۔۔۔۔ یہ کیا تم کہہ رہی ہو! لیکن بھابھی کی قسمت کیسے خراب ہوئی۔ بیوہ تو بے چاری چھوٹی بھابی ہوئی ہیں۔ ان کے سر کا تاج نہ رہا۔“

بانو افسوس کے لہجے میں سر ہلا کر بولی ”وہ تو اپنی جگہ ٹھیک بات ہے کہ چھوٹی بھابی کا زخم تو سدا بہار زخم ہے۔ اس دکھ کو اور پہاڑ جیسے غم کو کون مٹا سکتا ہے۔ مگر مشکبار! تم تو ایک سمجھدار لڑکی ہو، اتنا تو سمجھ سکتی ہو کہ سوت کا جلایا اور سوت کا دکھ کیوں اتنا مشہور ہے۔ ساری دنیا یہ باتیں کرتی ہے تو کوئی وجہ تو ہوگی۔ پھر اس لحاظ سے لیکن بھابی نے جو کچھ کہا ہے کیونکہ تم دیکھنا۔ جیسے ہی عدت پوری ہو گئی ریشہ بھابی کا نکاح عباس بھائی سے کر دیا جائے گا۔“

”ہائے میرے خدا!“ مشکبار کی زبان سے بے ساختہ کلمہ حیرت نکل گیا اور وہ حیران و پریشان نظروں سے بانو کی صورت تکتے لگی۔

اس کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دوبارہ کہنے لگے۔ ”اسی لئے تو کوئی اعتراض نہیں کر سکا۔ یہ جو ابھی چادر والی آئی ہیں، ریشہ بھابی کی خالہ ہیں اور دہلی میں رہتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ریشہ بھابی کو زیادہ رونا آگیا۔ مگر بڑی بھابی سے بھی



مشکبار جو انتہائی حیرت اور فکر مندی کے ساتھ یہ تمام تفصیلات سن رہی تھی، اس کے خاموش ہوتے ہی جلدی سے بولی،

”اور..... لڑکی کے والدین وغیرہ بھی منع نہیں کرتے۔۔۔۔۔ وہ خود بھی انکار نہیں کرتی! کمال کی بات ہے بھی۔“

”بس..... ہمارا رواج ہے۔“ بانو مجبوری کے سے عالم میں منہ لٹکا کر بولی ”ماں باپ بھی سوچتے ہیں کہ چلو یہ مسئلہ کا بہتر حل ہے۔ بچوں کو بھی دھیال سے زیادہ پیار کہاں مل سکتا ہے اور پھر ایک بیوہ عورت کا ٹھکانہ بھی کہاں۔۔۔!! اور چونکہ یہ رواج ہمارے پرکھوں سے چلا آ رہا ہے اس لئے کسی کو بھی اعتراض کا حق نہیں ہوتا۔ ویسے اگر بغور اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہی حل سب میں مناسب اور بہتر نظر آتا ہے صبر تو خدا وقت کے ساتھ ساتھ دے ہی ڈالتا ہے۔ مگر یہ مسئلہ تو پوری زندگی چلتا ہے۔ بچوں کے تحفظ کی خاطر سب چپ سادھ لیتے ہیں۔“

مشکبار بھی چپ کی چپ رہ گئی۔

بانو نے ایسی مفصل بات کی تھی کہ مزید سوال و جواب کی گنجائش ہی ختم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی مشکبار کا دماغ بلب بھر میں زقندیں لگاتا جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا۔ یہ نئے نئے انکشافات سن کر اس کے سامنے اپنی پوری زندگی کا نقشہ گھوم گیا تھا۔ روح پر خود بخود اک وزن سا آ پڑا۔

جب وہ یتیم ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اس کے ابا میاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان تینو کو چھوڑ کر رب پاک کو پیارے ہو گئے تھے، اس وقت وہ خاصی چھوٹی ہونے کے باوجود بہت باشعور اور حساس تھی۔

ان کے اس چھوٹے سے گھرانے میں جو جو انقلابات پھا ہوئے تھے، وہ سب اس کے دل میں روز اول کی مانند جاگزیں تھے اور وہ اس سانچے کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر فراموش کر دینے والوں میں سے نہیں تھی۔۔۔

اس وقت وہ بار بار اپنے جی جی میں سوچے جا رہی تھی

”ہائے..... کہنے کو دیہاتی ہیں یہ سب..... لیکن کس قدر سمجھ دار اور دور اندیش ہیں..... کتنی فراست اور عقلمندی سے ایسے معاملات طے کرتے ہیں کہ کوئی یتیم بچہ در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائے..... کوئی بے آسرا نہ کہلائے؟“



نامہ بیگم کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

ان کا زیادہ وقت نیم کے نیچے پلنگ پر لیٹے یا ابامیاں کے کمرے میں گزرتا۔ اب رت بدل رہی تھی۔ گرمی نے پاؤں سمیٹ لئے تھے ہر وقت خوشگوار سی خنکی کا احساس طبیعتوں میں سکون کا باعث رہتی۔ رات کے آخری پہر میں اکثر جب ہوائیں شبانم سے بوجھل ہو جاتیں تو یہی معمولی سی خنکی ٹھنڈ میں تبدیل ہو جاتی۔ لیکن اس خوشگوار خنکی کے باوجود نامہ بیگم کو ہر وقت اختلاج قلب کی شکایت رہتی اور اسی تکلیف میں ایک کے بعد ایک پان بنانا کرکلیں دبائے جاتیں اور ”ہائے، ہائے“ کرتی رہتیں۔ دوسرے پھر انہیں ہر وقت کے روتے بسورتے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔ روتی آنکھیں، بہتے آنسو اور نالہ و شیون کی آوازوں سے ان کے کان پک چکے تھے۔

یہ سب ان کی نازک مزاجی پر بہت بڑا بار تھا مگر زبان سے کچھ کہنے سے بھی گزراں رہتی تھیں۔ زمانہ ساز اور جہان دیدہ تھیں، سمجھتی تھیں کہ یہ سرال والے بے

حد مضبوط اور اپنی پرانی قدروں کے پوری طرح پابند ہیں۔ ثار احمد کی طرح ان لوگوں کو تودباؤ میں رکھ نہ سکتی تھیں۔

یہی سبب تھا کہ وہ طبیعت کی خرابی کے باوجود کان دبائے چپ چاپ پڑی تھیں اور ابامیاں سے شہر چلنے کی فرمائش نہیں کر رہی تھیں۔ خوب جانتی تھیں کہ صدمہ بہت بڑا اور دل بہت چھوٹا ہے سنبھلتے سنبھلتے سنبھلے گا۔ ایسے نازک اور المناک موقع پر انہیں چھیڑنے کا مطلب بجائے ہمدردی کے عذاب بن جاتا ہے۔

لیکن---

ایک دن ہوا یہ کہ ان کے اندر کہیں مصلحتوں کی نیند سوتی نامہ بیگم یکنخت غضبناک ہو کر بیدار ہو بیٹھیں اور ان پر پرانا جلال طاری ہونے لگا۔

اس روز الیاس کا دسواں تھا۔

نامہ بیگم حسب معمول گھمیری نیم کے ٹھنڈے اور فرحت بخش پیڑ کے چھاؤں تلے لیٹی تھیں۔ چہرے پر ہلکا سا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ گویا سو رہی ہوں۔ مگر جاگ رہی تھیں۔

آج دور و نزدیک کے دیہاتوں سے بھی لوگ آئے تھے مگر گھر کے اندر صرف عورتیں تھیں۔ چہرے پر ہلکا سا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ گویا سو رہی ہوں۔ مگر جاگ رہی تھیں۔

آج دور و نزدیک کے دیہاتوں سے بھی لوگ آئے تھے مگر گھر کے اندر صرف عورتیں تھیں۔ مردوں کا انتظام باہر رکھا گیا تھا۔

نامہ بیگم سے کچھ فاصلے پر چند عورتیں دوسرے پلنگ پر باتوں میں مصروف تھیں۔ اچانک ایک عورت..... انگوٹھے سے اشارہ کر کے دھیرے سے بولی۔ ”معلو ہوتا ہے کہ نامہ بیگم دوسرے جی سے ہیں۔“

دوسری جھٹ سے مسکرا کر بولی۔ ”ارے تمہیں فقط معلوم ہی ہوتا ہے اور ہم تصدیق بھی کر چکے ہیں۔ وہ جب یہاں سے واپس آکر سہارن پور ہو گئی ہیں، تب ہی سے پاؤں بھاری ہے ان کا۔“

”خدا کی شان ہے۔“

تیسری ٹھنڈا سانس بھر کر طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”بڑھاپے میں گل کے ابامیاں پھر سے باپ بن رہے ہیں۔ گل میں اور اس آنے والے بچے میں کتنے سالوں کا فرق ہو گا! ارے مجھے تو سوچ کر ہنسی آتی ہے۔“

باقی عورتیں بھی منہ دبا دبا کر ہنسنے لگیں۔

نامہ بیگم کو بہت برا معلوم ہوا۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی طبیعت کی دیے ہی تیز تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ان سب مذاق اڑانے والیوں کے کلیجے چبا ڈالیں۔ مگر مصلحتاً خاموش لیٹی رہیں۔

اتنے میں ایک عورت قدرے زور سے کہنے لگی۔ ”ارے تم ساریوں کے دماغ تو نہیں چل گئے۔۔۔ اس میں بھلا ہنسنے اور کاٹھی اور ٹھٹھول بازی کی کوئی بات ہے! مرد تو سدا ساٹھا اور پاٹھا کہلاتا ہے پھر ہمارے بھائی میاں تو ماشاء اللہ صحت اور کاٹھی میں جوانوں سے بھی بڑھ کر گھبر و نظر آتے ہیں۔ تم خود ہی سوچو مرد کے لئے بچے.....“

ایک عورت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور چپکے سے بولی۔ ”اے چپ ہو جاؤ وہ کہیں سن نہ رہی ہوں۔“

”سنا کریں میری بلا سے۔“ وہ بڑی دلیری سے انگوٹھا دبا کر بولی۔ ”میں بڑی ان کی برائی کر رہی ہوں جو ڈروں۔ میں تو اپنے بھائی میاں کی بات کر رہی ہوں۔ اب فرض کرو ہماری بھابی زندہ سلامت ہو تیں تو کیا گل کے بعد ان کی کوئی اولاد ہی نہ ہوتی! ارے میں کہتی ہوں بچوں کے ڈھیر لگے ہوتے۔“

گل کی ماں کے تذکرے پر کچھ عورتیں سنجیدہ ہو گئیں۔

جن عورتوں نے مذاق کی ابتدا کی تھی، وہ تھیں بھی مرحومہ کے میکے والیاں۔
تھوڑی دیر میں وہاں اسی کی جواں سالہ موت کا تذکرہ چل نکلا اور پھر اسی کی باتیں
ہونے لگیں۔ کچھ کے آنسو بھی نکل آئے۔

چند ایک تو نامہ بیگم کو سنا سنا کر برملا کہنے لگی تھیں،

”ارے اگر ہماری ہاجرہ بی بی زندہ ہوتی تو یہ دوسری شادی ہی کیوں ہوتی،
غیروں کا منہ کیوں دیکھنا پڑتا۔ سوتیلی ماں کیوں آجاتی ہماری ہاجرہ ہی نہ اتنے بڑے
گھر میں راج راج رہی ہوتی۔“

اسی نوعیت کی باتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔

ہر کسی کی زبان چلنے لگی۔

سب اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔ بڑھ چڑھ کر اس بحث میں حصہ لینے لگیں۔
جب یہ باتیں نامہ بیگم کی قوت برداشت کو چیلنج کرنے لگیں اور غصہ ان کے
دماغ پر ٹھو کریں رسید کرنے لگا تو وہ وہاں سے انھیں اور کمرے میں آگئیں۔

یہی غنیمت تھا کہ انہوں نے ان عورتوں سے جھڑپ نہیں کی تھی ورنہ ان کے
منہ نوح ڈالتیں۔

لیکن اسی وقت وہ دل ہی دل میں ایک اہم ترین فیصلہ کر چکی تھیں اور وہ نامہ بیگم ہی
کہاں جو اپنے فیصلے پر عمل درآمد نہ کرتیں۔ انہوں نے کمرے میں آکر اپنے آپ سے
وعدہ لیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جیسے ہی موقع آیا وہ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا کر دم لیں گی۔
وہ اسی صورت ابامیاں کے کنبے کی عورتوں سے آج کی گفتگو کا بدلہ لینا چاہ رہی تھیں۔

اب انہوں نے دل میں کیا ٹھانی تھی، یہ تو وقت ہی بتاتا۔

رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر ابامیاں حسب معمول بہت دیر تک مردانے حصے

میں رہے۔

جب ایک ایک کر کے سب لوگ اٹھنے لگے تو رات گئے وہ بھی اپنے کمرے کی
طرف آگئے۔ نامہ بیگم، اب تک ان کے انتظار میں جاگ رہی تھیں اور کروٹوں پر
کروٹیں بدل رہی تھیں۔ ان کے تئیر دیکھ کر ہی ابامیاں سمجھ چکے تھے کہ آج وہ ضرور
کسی طرح کا دھماکہ کرنے والی ہیں۔

اور ایسا ہی ہوا بھی۔

جیسے ہی وہ بستر پر نیم دراز ہوئے نامہ بیگم نے الٹی میٹم دے ڈالا،

”بس جی بہت رہ گئے ہم۔ اب نہیں رہا جاتا۔ رخصت سفر باندھئے۔“

”کیوں۔۔۔ کسی سے لڑائی جھگڑا ہو گیا ہے کیا!“ انہوں نے تھوڑا سا مسکرا کر پوچھا۔

”لڑائی جھگڑا کیسا!“ وہ صاف ٹال گئیں۔ مصالحانہ انداز میں بولیں۔ ”آپ کو اچھا

خاصا معلوم ہے کہ آج کل میری طبیعت ہر وقت اوبتی رہتی ہے بڑی مشکل سے خود
پر ضبط کر کے اتنے دنوں سے پڑی ہوں۔ گرمی کی وجہ سے ہر وقت دل گر تار ہتا ہے پھر
یہ بھی ہے کہ الیاس بے چارے کی ناگہاں موت سے ماحول افسردہ اور دکھی دکھی رہتا
ہے اب یہ سب کچھ برداشت کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ اس مارے کہہ رہی ہوں کہ
دوبارہ آجائیے گا۔ اب چلئے۔“

ابامیاں نے سنجیدگی کے لہجے میں جواب دیا۔ ”چھٹی تو زیادہ میری بھی منظور
نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میں یہ سوچتا تھا کہ کم از کم بیسواں تو ہو جائے۔ پھر چلتے۔ یوں
ایک دم جانا اچھا بھی نہیں لگتا۔“

وہ طبیعت میں بھری تلخی چھپا کر بولیں۔ ”بیسویں، چالیسویں میں دوبارہ آکر
شریک نہیں ہو سکتے! اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا، یہاں مستقل رہنے میں یہ قباحت ہے
کہ آپ کی ملازمت کا بھی ہرج ہوگا اور میری طبیعت الگ خراب ہے۔ وہاں شہر کا

معاملہ ہے۔ سو طرح کا آرام ہے۔ یہاں تو کبخت گرمی میں تپ کر مر جاؤ لیکن مجال ہے کہ ذرا سی گلوڑماری برف ہی مل جائے.....“

”ابامیاں نے ان کی بات کاٹ دی اور خوش خلقی سے مزاحا کہنے لگے۔“ آگے یہ بھی تو کہئے کہ یہاں دیہات میں بھلا مہکتے ہوئے ماوے کی قلفیاں اور جمائی آکس کریم کہاں۔۔۔ وہ خوشبودار فرنی کی کلبیاں اور رس ملائی کہاں۔۔۔ وہاں تو جب چاہو حاضر۔۔۔“

”اے ہے۔۔۔ بڑے آئے کہیں گے۔“ وہ قدرے اٹھلا کر اور بن کر بولیں۔
”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم بیٹھے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ منوں مٹھائیاں اور سوغاتیں پڑی رہیں ہمارا کبھی جی نہیں لپٹایا۔ ہاں۔۔۔ اپنی بات کیجئے تو کوئی یقین بھی کر لے۔ جب تک کھانے پر کوئی میٹھی چیز نہ ہو نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔ گاجر کا حلوہ تو ساری سردی بنا بنا کر ہماری طبیعت اوب گئی۔“

اور دھیرے دھیرے منہ میں دبا پان چباتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔

”پھر..... چل رہے ہیں ناسویرے سہارن پور.....“

نائمہ بیگم کی ضد کسی صورت ٹوٹنے کا نام نہ لے رہی تھی۔

”ہاں..... آں..... آں.....“

وہ بے خیالی میں فقط گردن ہلا کر رہ گئے۔

”صاف صاف جواب دیجئے۔۔۔ تاکہ میں تیاری کر لوں۔“ اس دفعہ وہ جھنجھلا

بولیں۔

”سوچ لو اچھی طرح۔۔۔۔“ وہ اپنے خیالات کی رو سے چونک کر بولے۔“ا

عجلت میں چلے جانا مجھے تو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔۔۔ اول تو اپنا جی نہیں مانتا

.....

نائمہ بیگم کو غصہ آگیا۔ تنک کر بولیں۔

”بس پھر تو ٹھیک ہے آپ یہاں بیٹھے رہئے اپنے کنبے والوں کو پکڑے۔ میں صبح بچوں کو لے کر سہارن پور چلی جاؤں گی، یہ طے ہے کہ اب نہ رکوں گی۔“
انہوں نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا اور بے ساختہ پوچھا۔ ”بچوں کو اس دفعہ ساتھ ہی لے کر چلو گی؟“

”نہیں تو کیا ساری عمر یہیں گزار دیں گے؟“ انہوں نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔



لہجہ ایسا تھا کہ ابامیاں ان کو ایک نظر دیکھ کر رہ گئے۔ جواب میں کچھ بولے نہیں۔ بلکہ انہوں نے چپ چاپ سیدھے لیٹ کر کروٹ بدل لی۔
نائمہ بیگم نے بھی مزید بات چیت نہیں بڑھائی اور نہ ہی صبح چلنے کے لئے مزید استفسار کیا۔ جانے کیوں خاموشی اختیار کر لی۔

باوجود اس کے کہ رات صحیح طور پر گاؤں سے چلنے کا فیصلہ ہو پایا تھا اور گفتگو ادھوری رہ گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہو اوہی جو نائمہ بیگم نے کہہ دیا تھا۔

سویرے فجر کی نماز سے ہو کر ابامیاں نے ایک آدمی بائیکسل پر شہر بھیج دیا۔ دس بجے کے قریب ان کے دروازے پر کرائے کی ایک جیپ کھڑی تھی اور نائمہ بیگم بے حد اطمینان اور سکون سے چلنے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ چونکہ وہ امید سے تھیں۔ اس لئے ابامیاں نے دھچکوں اور جھٹکوں وغیرہ کے خوف سے یکے پر سفر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

مشکار کو بھی کوچ کا حکم مل چکا تھا اور وہ جلدی جلدی دونوں بھائیوں کو نہلاتی دھلاتی پھر رہی تھی۔

جانے کیوں۔۔۔

اسے سہارن پور جانے کی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ آج سے قبل وہ جب بھی گل، شہر سے آیا کرتے تھے، وہ ان سے سب سے پہلے یہی سوال کیا کرتی تھی کہ اماں نے ہمیں بلایا نہیں۔۔۔؟ وہ ہمیں اپنے پاس بلا کیوں نہیں لیتیں۔

لیکن اب جبکہ سچ سچ جانے کا وقت آ پہنچا تھا تو اس کا دل آپ سے آپ اداس ہوا جا رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بھری آرہی تھیں اور طبیعت پر جیسے منوں بوجھ آن پڑا تھا، ساری چستی جاتی رہی تھی۔

اس کے جانے کا سن کر بانو اور بہت سی بھولی لڑکیاں جمع ہو گئیں سب اداس اور رنجیدہ تھیں۔ بھائی سکینہ، ربیہ حتیٰ کہ فاطمہ پھوپھو تک کا دل دکھ رہا تھا۔ یوں جیسے ان کی بہت عزیز شے ان سے چھڑ رہی ہو۔

گھر میں اتنا بڑا سانحہ ہو جانے کے باوجود فاطمہ پھوپھو اپنی وضع داری اور رسم رواج کی پابندی فراموش نہ کر پائی تھیں۔ انہوں نے وقتِ رخصت ان تینوں بہن بھائیوں کو کئی کئی جوڑے کپڑے اور مشکبار کے منع کرتے کرتے بھی بہت سی چیزیں جیسے چنگیریں، ٹوکریاں، ازار بند اور چوٹیاں وغیرہ دی تھیں۔ بانو اور کئی دوسری لڑکیوں نے بھی حسبِ توفیق تحائف دیئے۔

مشکبار کی حساس اور غیور طبیعت پر چر کے پرچر کا لگتا رہتا۔ وہ ہزار خواہش ہو کے باوجود کسی کو کوئی تحفہ نہ دے سکتی تھی۔ زخمی نگاہوں سے ماں کی صورت دیکھ رہی۔ جب یہ سب لوازمات اس اطمینان سے دیکھ رہی تھیں، جیسے یہ ساری وصولی ان کا حق رہی ہو۔

مشکبار کے جانے کا سب سے زیادہ افسوس بانو کو تھا۔ وہ اس عرصے میں اس بہت قریب آگئی تھی اور اس حد تک مانوس ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر ایک شام

گزارتی تھی۔

چلتے وقت وہ باقاعدہ آنسوؤں اور ہچکیوں سے روئی۔

چپ میں بیٹھ کر مشکبار کو یکبارگی خیال آیا کہ جب وہ اس گاؤں میں۔۔۔ اس گھر میں اتری تھی تو ایسا بھائی زندہ سلامت موجود تھے۔۔۔ اور اب جبکہ رخصت ہو رہی ہے تو وہ ہیں نہیں۔۔۔ ان کی مشفق اور مہربان ہستی یاد کر کے اس کے بھی آنسو چھلک پڑے۔ لیکن اس کی ہلکی سی سسکی پر نائمہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا تو اس نے جلدی سے ہتھیلی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

چپ کے پیوں کو حرکت ہوئی اور وہ آگے بڑھ گئی۔

بہت ساری کہانیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔

کچھ کہانیاں آگے بڑھ آئی تھیں۔

کوئی آنکھ، کوئی دل اور کوچ نہیں جانتی تھی کہ اس کے لئے مستقبل کے دامن میں کیا ہے؟

مشکبار بھی نہیں جانتی تھی کہ آئندہ کبھی زندگی میں دوبارہ اس گاؤں میں آنا ہوگا بھی یا نہیں، کون جانے!

مگر کوئی اس کی دی کی دھڑکنوں میں بیٹھا دھیرے دھیرے اصرار کئے جا رہا تھا۔

”یہاں۔۔۔۔۔ اس گاؤں میں تم نے بہت کچھ پایا ہے۔ یہاں فاطمہ پھوپھو رہتی ہیں۔۔۔۔۔ یہاں بانو ہے۔ تمہیں یہاں ضرور لوٹ کر آنا ہوگا۔ صرف تم ہی ان کو یاد نہیں کرو گی بلکہ وہ سب بھی تمہیں کبھی نہ بھولیں گی۔ تم نے یہاں نماز پڑھنی سیکھی۔ قرآن حکیم پڑھا۔۔۔ روزے کا صحیح لطف اٹھایا۔۔۔ اور بہت سی دینی کہانیاں اور مذہبی مسائل سے آگاہ ہوئیں۔۔۔۔۔ فاطمہ پھوپھو کی ان نیکیوں اور عنایتوں کو بھول مت جانا۔“

وہ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔

اور جیپ سفر آگے ہی آگے طے کرتی رہی۔
گل ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ یوں بھی بڑے بھائی کی موت کے بعد
سے ان کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ کئی روز تک بخار بھی آتا رہا تھا۔

نائمہ بیگم آج کل ننھے منے کپڑوں کی کتیریونت میں لگی رہتی تھیں۔ کلمے میں پان
دبا ہے، ہونٹ لال انگارہ ہو رہے ہیں، اپنا بھاری بھر کم وجود لئے تخت پر بیٹھی ہیں، ہاتھ
میں قینچی ہے اور سامنے خوش رنگ کپڑوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔
دن کے بیشتر وقت میں ان کا یہی مشغلہ ہوتا۔

آج کل ان کا وجود قدرے بھاری بھی ہو گیا تھا۔ ان کا سب سے چھوٹا بچہ دلشاد ہی
تھا۔ جواب ماشاء اللہ پانچ چھ برس کا ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد نخل امید میں دوبارہ
ثمر آنے کے آثار ظاہر ہوئے تھے۔ اگر بیوہ نہ ہوئی ہوتیں اور پھر بیٹھی نہ رہتیں تو
حالات دوسرے ہوتے۔ بہر حال یہ طے تھا کہ اس موجودہ صورتِ حال سے وہ بہت
مطمئن اور پرسکون رہتی تھیں۔ بچے کی متوقع پیدائش کی خبر سے ابامیاں بہت خوش تھے۔
نائمہ بیگم نے اپنے کام کی رفتار میں بہت کمی کر دی تھی۔ ایک ملازمہ کا مستقل
انتظام ہو چکا تھا اور پھر مشکبار بھی آچکی تھی۔ ویسے وہ میاں کی طرف سے غافل نہیں
ہوئی تھیں۔ ان کے لئے کھانا اپنے ہاتھ سے ہی تیار کرتیں۔ باقی کام انہوں نے مشکبار
اور ملازمہ کے درمیان بانٹ رکھا تھا۔

گو کہ مشکبار پر کام کا خاصا وزن تھا مگر ملازمہ ہونے کی وجہ سے برتن مانجھے، جھاڑو

ایسا بھی ہوتا کہ کچھ ان کی واقف کار خواتین ادھر آنکلتیں۔

لیکن مشکبار کو اس قسم کی آمد و رفت سے مزید کوفت میں مبتلا ہونا پڑتا۔ کیونکہ اماں اپنی عادت کے مطابق نہایت فراخ دلی سے آنے والوں کو کھانے پر روک لیتیں چنانچہ کام کا بوجھ یلخت بڑھ جاتا اور مشکبار دل ہی دل میں ان سب کو کوستی ہوئی اس نئی مصروفیت میں دھنستی چلی جاتی اور تو اور جب وہ دسترخوان پر بیٹھ جاتیں تو دلشاد اور شمشاد کے علاوہ ان کے ننھے بچوں کو سنبھالنا اور بہلانا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو جاتا۔ اس لئے وہ ہر صبح دعا کرتی۔

”خدا یا! اماں کی کوئی سہیلی ہمارے گھر نہ آئیں۔“

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔

گاؤں میں الیاس بھائی کا بیسواں اور پھر چالیسواں بھی ہو گیا۔

مگر مشکبار تڑپ تڑپ کر رہ گئی، اس کا جاننا نہ ہو سکا۔

اماں جاتیں تو شاید اسے بھی لے جاتیں۔ مگر وہ اپنی حالت کے پیش نظر گئی نہیں۔ نہ ہی ابامیاں نے اصرار کیا۔ خود اکیلے ہی جا جا کر فاتحہ میں شریک ہوتے رہے۔ مشکبار ہزار چاہنے کے باوجود بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد نہ کر سکی۔ دل موس کر رہ گئی۔ فاطمہ پھوپھو، سیکنہ بھابی، ریسہ بھابی، بانو اور بہت سارے پر خلوص لوگ رہ رہ کر یاد آئے۔ جی چاہا پر لگا کر اڑ جائے اور ان سب سے مل آئے۔ مگر حالات نے اجازت دی اور نہ اس نے اماں کے ڈر سے جانے کا اصرار کیا۔



صبح کے کوئی ساڑھے دس بجے ہوں گے۔

نائمہ بیگم چھوٹے چھوٹے کپڑوں کی کتربونت سے فارغ ہو کر ذرا کمر سیدھی

اور بچلی منزل سے پانی بھرنے کے جیسا پر مشقت کام اس کے حصے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی۔ ورنہ گاؤں جانے سے پہلے یہ سارے کام بھی اسی کے سپرد تھے۔ جو بہر حال صبر شکر کے ساتھ کرنے پڑتے۔ سب میں زیادہ مشکل کام اسے نیچے سے پانی بھر کے اوپر لانا لگتا تھا۔

دونوں بھائیوں کے اور اپنے کپڑے اب بھی اسے خود ہی دھونے پڑتے تھے۔ ابامیاں اور اماں کے کپڑے ملازمہ دھوتی۔ ویسے زیادہ کپڑے تو دھو بی کے ہاں جاتے تھے۔ یہاں کے معمولات اور گاؤں کے روزمرہ کے کاموں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شروع کے چند دنوں تو مشکبار بوکھلائی بوکھلائی رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کام کو کہاں سے پکڑے اور کہاں ختم کرے! مگر پھر دھیرے دھیرے اپنی فطری ذہانت اور محنت سے ہر مشکل پر قابو پالیتی، دونوں بھائیوں کو..... سنبھالتی بلکہ اپنی بیچ وقت نماز کو بھی نہیں بھولی تھی۔

اماں اس کی اس عادت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں مگر زبان سے کبھی اظہار کرتی تھیں، وہ بہت کم کسی کی تعریف کرنے کی عادی تھیں۔

یہاں سہارن پور میں بہ نسبت گاؤں کے، مشکبار کی زندگی قطعی محدود اور یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ وہاں پردن کے بیشتر حصے میں ہم عمر لڑکیوں کا ساتھ رہتا تھا۔ کبھی ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانا بھی ہو جاتا۔ اس ہنسی مذاق اور باتوں میں بہت سارے وقت کا احساس بھی نہ رہتا تھا۔

مگر یہاں ہر وقت گھر کے اندر محصور رہنا پڑتا۔ نہ کہیں کا آنا جانا۔ نہ کسی سے ملنا۔ دنوں کسی کی صورت دکھائی نہ دیتی۔ ویسے ابامیاں کے دوستوں کے ہاں کئی اماں کا آنا جانا تو ہو گیا تھا۔ انہوں نے کئی گھرانوں میں اپنے جی بہلانے کے سامان کر لئے تھے۔ کبھی کبھی بے حد اہتمام اور سلیقے سے تیار ہو کر ان کے ہاں چلی جاتیں

”اور سناؤ وہاں کا سب کا کیا حال ہے؟ سکیمنہ، رینیہ اور پھوپھو وغیرہ کا۔“

”ٹھیک ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ سب آپ کو دعا سلام کہتی تھیں۔“

نامہ بیگم چپ ہو گئیں اور مشکبار کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

”مشکبار! گل کے لئے کچھ چائے ناشتہ وغیرہ تیار کرو۔ سیدھے گاؤں سے آرہے

ہیں۔“

گل جلدی سے بولے۔

”نہیں..... نہیں..... میرے لئے کچھ تکلف مت کیجئے میں گھر سے ناشتہ کر کے

ہی چلا تھا۔ یہاں سیدھا تو مشکبار کی چند امانتیں پہنچانے کے لئے چلا آیا ہوں ابھی کالج

چلا جاؤں گا۔ بہت غیر حاضریاں ہو چکی ہیں۔“

اپنے ذکر پر ایک بار مشکبار نے چونک کر اس طرف دیکھا۔

”کوئی امانتیں ہیں کس نے بھیجی ہیں انہیں؟“

گل نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنی اٹیچی کو کھولا اور اپنے کپڑوں کے اوپر رکھی کئی

ایک پھولوں اور موتیوں والی چوٹیاں، ریشمی دھاگوں سے کاڑھے ہوئے دو تئکے اور

ایک میز پوش، ایک فردیاں پڑا لال رنگ کا دوپٹہ نکال کر تخت پر رکھ دیا اور مشکبار کی

طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

”یہ ساری چیزیں تمہیں بانو نے بھجوائی ہیں اور کہا ہے کہ اپنے جنر کا ناپ بھجوا

دو۔ ایک سوٹ تمہارے لئے کاڑھ کر بھیجوں گی۔“

مشکبار جھجکتی، شرماتی قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ مارے خوشی کے اس کے گال تمتما

اٹھے تھے اور منہ سے کوئی آواز نہ نکل پارہی تھی۔

نامہ بیگم نے بھی اٹھا اٹھا کر ایک ایک چیز خوف یور سے دیکھی مگر کچھ اظہار خیال

نہ کیا۔ اپنی پرانی عادت اور فطرت کے مطابق۔

کرنے کو تخت پر لیٹ گئی تھیں۔

ملازمہ نیچے سے پانی لا کر مکے بھر رہی تھیں اور مشکبار مسالہ پیس رہی تھی۔ اچانک

زینے میں آنکھ پھولی کھیلنے ہوئے دلشاد اور شمشاد ایک ساتھ چلانے لگے۔

”آہا..... بھائی جان آگئے..... آہا! بھائی جان آگئے.....“

مشکبار نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

گل آہستہ قدموں سے اندر داخل ہو رہے تھے، وہ بھونچکی سی رہ گئی۔

ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی وہ پہلے سے آدھے بھی نہ رہے تھے۔ رنگت بھی بہت ماند

پڑ گئی تھی۔ شانے قدرے جھکے جھکے سے لگ رہے تھے۔

آگے بڑھ کر انہوں نے اماں کو سلام کیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ دونوں

لڑکے ان سے اس طرح چٹ گئے جیسے برسوں کے پچھڑے آج مل پائے ہوں نامہ

بیگم ہنس کر بولیں۔

”ارے پیٹھ پیچھے تو کبھی ان دونوں نے گل کا نام تک نہ لیا اور اب صورت دیکھ کر

کیسے واری صدقے ہوئے جارہے ہیں، خوشامدی۔۔۔ چالوسی کہیں کے۔۔۔“

گل مسکرا دیئے اور دونوں بچوں کو اپنے سے قریب کر کے پیار کرنے لگے۔

مشکبار دوبارہ سر جھکا کر مسالہ پینے لگی تھی مگر اب اس کے ہاتھ سست پڑ گئے تھے۔

الیاس بھیا کے انتقال کے بعد اس نے بھی آج ہی گل کو دیکھا تھا اور دل میں گاؤں کی

بہت ساری یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔

جی چاہ رہا تھا کہ ان سے سب کے متعلق فردا فردا دریافت کرے اور پوچھے کہ وہ

لوگ بھی ہمیں یاد کرتے ہیں یا نہیں۔

مگر وہ یہ سب کچھ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی خاموشی سے مسالہ پیستی رہی۔

نامہ بیگم نے ان سے پوچھا۔

گل خود بخود ہی دوبارہ بتانے لگے۔

”مشکبار! تمہاری سب سہیلیاں تو تمہیں وہاں بہت یاد کرتی ہیں۔ جہاں چار مل جل کر بیٹھیں تمہارا ذکر ضرور چھڑتا ہے۔ گھر میں پھوپھو بھی بات بات پر تمہیں یاد کرتی رہتی ہیں۔ الیاس بھائی کے -- چالیسویں والے دن سب نے تمہیں بہت یاد کیا۔ خیال تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔“

مشکبار نے دھیرے سے شرگیں لہجے میں جواب دیا۔ ”اماں کی طبیعت اچھی نہ تھی بھائی جان! اس لئے میں کس کے ساتھ آتی۔“

پھر قدرے رک رک کر ماں کی طرف دیکھتے دیکھتے اضافہ کیا۔ ”میں بھی یہاں سب کو بہت یاد کرتی ہوں..... اور..... بانو تو مجھے بہت زیادہ یاد آتی ہے۔“

واقعی یہ سب تھے..... اور بانو کا بے پناہ خلوص دیکھ دیکھ کر اس کا جی بھرا چلا آ رہا تھا۔ اس سے بھلا کس نے کب اور کہاں ایسا پیار کیا تھا!

نانمہ بیگم نے موضوع کی تبدیلی کی ضرورت کو اول جانا، پان لگاتے ہوئے بولیں ”اے بھیا! تم نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے! کبھی آئینہ بھی دیکھا ہے، گل کیار ہے گل کے بھوت بن گئے ہو۔“

گل ہنس کر چپ ہو رہے۔ واقعی انہوں نے بھائی کا بہت صدمہ کیا تھا۔ پہلے سے آدھے بھی نہیں رہے تھے۔ کہاں بھرے بھرے گال اور تمنتاتی ہوئی سرخ و سفید رنگت اور کہاں مرجھائے مرجھائے اداس اور گم صم گل --

ملازمہ جو پانی بھر چکی تھی، ہاتھ پونچھتی ہوئی فرش پر آ بیٹھی اور گفتگو میں پہلی دفعہ شریک ہوتے ہوئے افسوس کے لہجے میں کہنے لگی،

”ہائے بی بی! کیا کہتی ہو..... جس کا جوان جہان بھائی یوں ایک بل میں چٹ پٹ ہو جائے اس کا غم اور صدمے سے جو بھی حال ہو جائے کم ہے۔ بڑے صاحب کو دیکھئے

کس قدر کمزور اور خاموش ہو گئے ہیں۔ ہائے مجھے ان کڑیل جوانوں کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کیسے خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ ہم نوکروں سے بھی جب بات کی، ہنس کر کی۔“

کسی نے بھی اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

گل کا چہرہ پہلے سے زیادہ تاریک اور افسردہ ہو گیا، وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ ملازمہ نے بھی ان کے دلی تاثرات کا اندازہ کر لیا تھا، اس لئے خاموش ہو گئی۔

مشکبار ساری چیزیں سمیٹ کر اندر چلی گئی پھر گل کے لئے چائے بنا لائی۔ چائے پیتے ہوئے وہ کچھ دیر بیٹھے نانمہ بیگم سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر ہو شل جانے کا کہہ کر چلے گئے۔

مشکبار کے تمام تر دلچسپیاں چہار دیواری کی محدود فضاؤں کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ جاڑوں کا موسم پوری طرح ماحول پر حاوی ہو چکا تھا۔ آج کل دن چھوٹے اور راتیں خوب لمبی لمبی ہو گئی تھیں۔

وہ دن بھر کو لہو کے تیل کی طرح کام کاج میں جٹی رہتی، رات کو جب کمرے میں اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ لیٹی تو ذہن ہزاروں خیالات کی آماجگاہ بن جاتا اور وہ بچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی کہیں سے کہیں جا پہنچتی۔

رات طویل اور سرد ہونے کی وجہ سے نیند بچ میں ہی اچٹ اچٹ جاتی تو کبھی وہ اٹھ اٹھ کر بانو کی دی ہوئی سوغاتوں کو کئی کئی بار اپنے اکلوتے بکس سے نکال نکال کر دیکھتی اور ہزاروں دفعہ کی سوچی بات دوبارہ سوچنے لگتی کہ کاش کبھی وہ خود بھی بانو کو ایسی ہی کئی چیزیں بھیج سکتی۔



کپڑے کے منگوائیں گے تم ان میں سے رنگ اور کپڑا پسند کر لینا۔ پھر جیسا کہو گی ریشمی دھاگے بھی آجائیں گے۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو مشکبار خوشی سے اچھل پڑتی۔ مگر اس وقت اسے معلوم تھا کہ اماں مغالطے میں یہ ساری مہربانی کر رہی ہیں۔

خبر نہیں کیسے بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

”لیکن..... اماں ہم یہ میز پوش اور تکیے..... بانو کے لئے کاڑھیں گے..... آپ خفاتونہ ہوں گی۔“

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئیں۔

لیکن مشکبار نے کہا اس معصومیت اور سادگی سے تھا کہ جانے کیوں وہ چپ کی چپ رہ گئیں اسے لعنت ملامت کر سکیں اور نہ کپڑا منگوادینے سے انکار کیا۔

چنانچہ اگلے دن انہوں نے باہر کا سودا سلف لا کر دینے والے لڑکے کو دکان پر بھیج کر کئی رنگوں میں سوئی کپڑوں کے تھان منگوادیئے اور جن جن میں سے مشکبار نے کہا، کپڑا کٹوا کر دے دیا۔

اسی روز مشکبار کے پاس رنگ برنگے خوش رنگ ریشمی دھاگے بھی آگئے۔

احساس تشکر سے اس کی آنکھیں بھر بھر آئیں۔

ایک دم ہی ماں کی طرف سے دل صاف ہو گیا اور وہ رہ رہ کر سوچنے لگی،

”ہائے اللہ! میری امی کتنی اچھی اور فراخ دل ہیں اور میں کتنی بری ہوں کہ دل میں کبھی ان کے لئے اچھا سوچتی نہیں۔ ان کی سہیلیوں کو بھی برا بھلا کہتی رہتی ہوں..... اف! خدا مجھے معاف کرے۔“



بالآخر جب یہ سوچ بڑھتے بڑھتے ایک اہم ترین خواہش بن گئی اور یہ خواہش ایک ارمان اور حسرت کی طرح جی کو جلانے لگا تو ایک روز اس نے ڈرتے ڈرتے ماں سے کہا۔
”اماں آج کل جاڑوں کی راتیں خوب بڑی بڑی ہیں۔ رات کو ہمیں خاصی فرصت ہے آپ ہمیں کوئی سوئی کپڑا خرید دیں۔ ہم میز پوش اور تکیے کاڑھیں گے۔“

ماں نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

”کیا تمہیں کشیدہ کاری آتی ہے! ہم نے تو کبھی تمہارے ہاتھ میں سوئی تک نہیں دیکھی۔“

مشکبار ان کے نرم لہجے سے خوش ہو کر بولی۔

”اماں ہمیں گاؤں میں بانوں نے پھول کاڑھنا سکھائے تھے اگر آپ کپڑے لے دیں تو..... ہم خراب نہیں کریں گے ضرور پھول کاڑھ لیں گے۔“

نامہ بیگم نے خاموشی سے چند منٹ کچھ سوچا پھر بولیں۔ ”تم اپنے جینز کے لئے میز پوش اور تکیے وغیرہ کاڑھنا چاہتی ہو۔“

مشکبار دھک سے رہ گئی۔

بات کرنے سے قبل اسے گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس کی ماں ایسا غلط اندازہ قائم کریں گی اور بے دھڑک اس کے منہ پر کہہ بھی گزریں گی۔

وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی، افسوس کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔ پھر اس سس ایک منٹ بھی وہاں رکانہ جاسکا۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ ان کی طرف سے خود بخود اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔ وہ سارا دن افسردہ رہی۔

شام کے وقت جب وہ چائے بنا کر لائی تو ماں نے دوبارہ استفسار کیا۔

”صبح تم کپڑے کا کہہ کر غائب کیوں ہو گئی تھیں! تم نے بری بات نہیں کی تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم کشیدہ کاری سیکھ چکی ہو۔ خیر..... کل ہم چند تھان رنگیں

تک نہ نکلنے دی اور سارا کام آرام و سکون سے سمیٹ لیتی۔ مجال ہے جو پیشانی پر بل بھی پڑ جائے۔

سارا دن تھک کر چور ہو جانے کے باوجود بھی رات کو اکثر وہ خاصی دیر تک تکیوں کے پھول کاڑھتی رہتی لیکن کبھی دلشاد اور شمشاد ضد کر بیٹھے کہ آپا آج تو ہم کہانی سنیں گے۔۔۔ پھر ان کا اصرار اتنا بڑھتا کہ بالآخر اسے ہتھیار ڈالنے پڑتے اور وہ بچپن میں نانی اماں سے سنی ہوئی کوئی کہانی شروع کر دیتی۔ جسے سنتے سنتے دونوں بھائی میٹھی نیند کی وادیوں میں جا اترتے اور یہ اپنی کشیدہ کاری کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ ہر ہر ٹانگے پر اسے بانوں کی ہنستی مسکراتی شبیہ نظر آتی بعض اوقات اس کی کوئی پر مزاج بات یاد کر کے اس کے ہونٹ بھی مسکرا اٹھتے۔ درمیان میں اٹھ اٹھ کر بھائیوں کو اچھی طرح لحاف بھی اوڑھاتی جاتی۔۔۔ یہی دونوں بھائی تو اس کی کل امیدوں کا مرکز تھے۔ ہر نماز کے بعد ان کی بھلائی، بہتری اور اچھے مستقبل کے لئے خدا کے حضور دعائیں مانگتی۔



اس وقت بھی۔۔۔ ابھی زیادہ رات نہیں بتی تھی۔ دلشاد اور شمشاد کہانی سنتے سنتے سو گئے تھے اور مشکبار لحاف ٹانگوں پر ڈالے ریشمی دھاگوں سے پھول کاڑھ رہی تھی۔ بیکوہائی وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رنگین دھاگوں کا شید بھی کپڑے پر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ہر پھول کی پتی میں جیسے نفاست اور صفائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے یہ خوبصورت مصروفیت مل جانے سے وہ بڑی مگن اور خوش رہتی۔ اس دن کے تصور میں یہ سوچ سوچ کر اس کا دل مطمئن رہتا کہ جس روز یہ میز پوش اور تنکے بانو کو ملیں گے تو کس قدر خوش ہوگی۔

اس وقت کڑھائی کرتے ہوئے بھی اس کے سادہ سے ذہن میں یہی خیالات گھوم رہے تھے۔۔۔ اچانک اس کی قوتِ سماعت چونکنی ہو گئی۔

بھرا بھرا جاڑوں نے ماحول کو ٹھنڈا ڈالا تھا۔

اور جاڑے بھی کیسے، دنوں سورج بادلوں سے منہ نہ نکالتا۔ ایسی ٹھنڈ، ایسے اکڑا ڈالنے والے سرد ہواؤں کے جھکڑ اور خنک خنک فضاؤں کہ الامان! رگوں میں لہو جمتا محسوس ہوتا۔

لوگ باگ جلدی جلدی باہر کے کام کاج نمشا کر گھروں میں سر شام جا چھپتے۔ گلی کو پچے جلد ہی سنسان ہو جاتے۔ بھیڑ بھاڑ، رونق اور لوگوں کی چہل پہل نہ ہونے کی وجہ سے بازار بھی گرمیوں کی نسبت ذرا جلدی بند ہو جاتے۔

اس روز بھی بلاک کی ٹھنڈ تھی۔

صبح ہی سے فضاؤں میں کہر کی چادر تنی تھی۔ سرد جھونکے الگ مزاج پر سی کر رہے تھے۔ نامہ بیگم کی طبیعت کئی دن سے زیادہ ہی گری گری تھی اوپر سے انہیں نزلے زکام کی شکایت بھی لاحق ہو گئی۔ وہ سارا دن پچھلے کمرے میں رضائی اوڑھے لیٹی رہتیں۔ جب دھوپ نکلتی تو باہر تخت پر آن بیٹھتیں۔

جاڑا بخار آجانے کی وجہ سے ملازمہ نے بھی لگاتار دو تین چھٹیاں کر لیں۔ مشکبار ایک دم ہی کام کے بیشمار بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔ مگر تھی صبر و تحمل والی زبان سے اف

وہ پوری طرح کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے صاف طور پر سنا کوئی تیز تیز قدموں سے زینے اترتا آ رہا تھا۔

ایک لمحے کو اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑ دھڑانے لگا۔

اس وقت رات کے اس پہر کون سردی اور پالے میں گھومتا پھر رہا ہے؟ اچانک اسے خیال آیا۔

ہائے اللہ! یہ کوئی چور اچکانہ ہو جو چوکیدار کو چکر دے کر چوری کرنے ہمارے گھر آگھسا ہو۔۔۔!“

اس خیال کو یوں بھی تقویت مل رہی تھی کہ اوپر کے حصے میں سوائے اماں اور ابامیاں کے کوئی بھی نہیں رہتا تھا اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ اتنی رات گئے وہ نیچے اتریں۔ مشکبار نے تو انہیں کبھی دن میں بھی یوں دھما دھم زینے اترتے نہیں دیکھا تھا۔

جب تک وہ خیالی گھوڑے دوڑاتی، زینے اترنے والے نے دروازے کی زنجیر بھی گرا لی تھی۔ آواز صاف کمرے کے اندر تک آئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آخر ایسا دیدہ دلیر اور نڈر چور کون ہے جو رات کے اس پہر اتنے زور شور کے ساتھ سارے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔ جسے نہ گھر والوں کے جاگ پڑنے کا اندیشہ تھا نہ دیکھ لئے جانے کا خطرہ۔۔۔

دفعۃً وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

ابامیاں کی آواز اس نے پہچان لی تھی۔ وہ چوکیدار کو پکار رہے تھے۔

معلوم نہیں اتنی رات گئے کیا کام پڑ گیا ہے؟

اس نے سوئی میں نیا دھاگا پروتے ہوئے سوچا۔ اس کے ذہن میں کھولا باندھی رہی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد قدموں کی چاپ دوبارہ ابھری۔

لیکن یہ صرف ابامیاں کے پیروں کی ہی چاپ نہیں تھی۔ بلکہ کئی قدموں کی

تھی۔ باوجود کوشش کے مشکبار سے رہا نہ گیا۔ وہ دبے قدموں اٹھ کر کمرے کے سے باہر جھانکنے لگی۔



چوکیدار باہر کے دروازے پر کھڑا رہ گیا تھا۔ ابامیاں کے ہمراہ دو عورتیں تھیں۔ ملازمہ کو تو مشکبار نے صاف پہچان لیا مگر دوسری عورت اس کی سمجھ میں نہیں۔ سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے یہ عورت ابامیاں کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں کراؤ پر چلی گئی۔

مشکبار کی پریشانی اور فکر مندی دوچند ہو گئی۔

اس کی سمجھ میں یہ سارا گورکھ دھندا نہیں آ رہا تھا۔ اب اس کا دیدہ کڑھائی میں بھی لگ رہا تھا۔ خالی بیٹھے بیٹھے جی گھبرانے لگا۔ نیند بالکل اڑ چکی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں موہوم سا اندیشہ جاگا

کہیں امی کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔ کئی دنوں سے بیمار بیمار سے ہیں، یہ آتے ہی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اوپر جا کر صحیح صورت حال معلوم کرے۔ مگر ابامیاں کی وجہ سے ضبط کئے ہوئے تھی حالانکہ انہوں نے آج تک کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ قدرتی طور سے بہت ڈرتی تھی۔ اس نے کبھی ان سے بات نہیں کی تھی چھٹی کے دن ہمیشہ اکی یہی کوشش رہتی کہ ان کے سامنے نہ پڑنے پائے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی بے تابی اور پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ اگر وہ خود ابامیاں کو دو عورتوں کے ساتھ اوپر چڑھتے نہ دیکھ لیتی تو ن کرنا دشوار ہوتا کہ کچھ لوگ جاگ رہے ہیں۔

بہت دیر تک جب دل کو قرار نصیب نہ ہوا تو وہ اپنے تمام تر حوصلوں اور جراتوں

’---اچھا---تو ساری بات یہ تھی۔۔۔ راز کھل ہی گیا۔‘

اس نے دل کی خوشگوار سی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے خوش ہو کر سوچا۔ پھر دھیرے دھیرے قدموں سے اٹھ کر کمرے میں آگئی۔

دونوں بھائی بدستور نیند کے جھکولوں میں مست و بے خود تھے۔

اس نے بھی چارپائی پر لیٹ کر لحاف اچھی طرح چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔ بہت دیر کے بعد اب اسے سردی کا احساس ہوا تھا۔

ساری رات وہ خوابوں میں ننھے منے پیارے پیارے بچے دیکھتی رہی۔۔۔ ہنستے، روتے، کھلکھلاتے بسورتے ہوئے بچے۔۔۔

صبح تک ذہن میں یہی کھولا باندھی رہی کہ جانے اللہ نے بھائی دیا ہے یا بہن! سویرے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ملازمہ گھر پر ہی موجود تھی مگر چادر والی عورت نہیں تھی۔

ملازمہ نے اسے دیکھتے ہی ہنس کر اطلاع دی۔

”مبارک ہو بی بی! خدا نے تمہیں ایک پیاری سی بہن دی ہے۔“

ابامیاں حسب معمول دفتر چلے گئے تو مشکبار بھی جھجکتی ہوئی کمرے میں گئی۔ اماں آنکھیں موندھے سیدھی لیٹی تھیں۔ شاید سو رہی تھیں۔ پاس ہی وہ منی سی جان لیٹی تھی۔ گلابی گلابی ننھے منے ہاتھوں اور خوبصورت نرم و نازک چہرے والی گڑیا۔۔۔ مشکبار کو بہت بھائی۔۔۔ بہت اچھی لگی۔۔۔ وہ کتنی ہی دیر اسے پیار کرتی رہی۔

اگلے چند دن تو بہت مصروفیت رہی۔

نامہ نگار کے کہنے پر زور و شور سے چھٹی کی تیاریاں کی گئیں۔ تمام جاننے والوں کے گھروں میں بلوے تقسیم ہوئے، بچوں کے نئے کپڑے بنے۔ گھر سجایا گیا اور ایک دن پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی۔

کو یکجا کر کے بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور دبے دبے قدموں زینے کی طرف آئی۔ یہ وہی سیڑھیاں تھیں جو سارا دن اس کے پیروں تلے ہوتی تھیں، گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کبھی نیچے کبھی اوپر آنا جانا پڑتا رہتا۔۔۔ اور اب رات کے ان لمحوں میں یہی زینہ بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن لگ رہا تھا۔

ایک منٹ بعد ڈیوڑھی میں کھڑی آہٹ لیتی رہی، چھت سے چلتے پھرتے قدموں کی دھیمی دھیمی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ بڑی ہی ہمت کر کے وہ پہلی سیڑھی چڑھی، پھر آہستہ آہستہ بیچ سیڑھیوں پر پہنچ کر رک گئی۔ یہاں سے سیڑھیاں مڑ جاتی تھیں اور اس موڑ سے سامنے کا آنگن اور باورچی خانے کی ایک کھڑکی صاف دکھائی دیتی تھی۔

یہ اس کی چھٹی حس ہی تھی کہ وہ ایک دم آگے نہیں بڑھ گئی۔ بس ذرا سی گردن بڑھا کر جھانکا۔۔۔ ایک لمحے کے لئے جہاں کی تہاں رہ گئی۔ گویا پتھر کی بن گئی ہو۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

عین سامنے ابامیاں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔

اب وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ آگے جائے یا نہ جائے۔۔۔ کہیں وہ پوچھ نہ بینیں کہ تم اتنی رات گئے اوپر کیا کرنے آئی ہو؟ تمہارا کیا کام ہے؟ چلو بھاگو یہاں سے۔ باورچی خانہ روشن تھا اور وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

۔۔۔ یہ آدھی رات کو اماں کیا پکوار ہی ہیں؟

ابھی وہ اوپر جانے یا نیچے اترنے کا فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ دفعتاً کسی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز تیر کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

’ہائے اللہ۔‘

مشکبار دھم سے وہی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس کا حساس سا چہرہ گلابی پڑ گیا اور ہونٹ خود بخود مسکرانے لگے۔

ٹھٹی والے دن دونوں اماں بیٹی خوب اچھے اچھے گوٹے کناری والے جھلمل جھلمل کرتے ہوئے نئے کپڑے پہنے اور خوب بن سنور کر محفل میں بیٹھیں۔ چند ایک گانے بذات خود ڈھولک پر نائمہ بیگم نے بھی گائے۔ بعض خواتین ان کے اس جوش و خروش اور اہتمام کو حیرت اور تعجب سے دیکھتی رہیں۔

حسبِ توفیق انہوں نے ہر گھر میں علیحدہ علیحدہ لڈو بھی تقسیم کرائے۔

غرضیکہ انہوں نے بیٹی پیدا ہونے کی خوب جی کھول کر خوشی منائی اور اپنا دل رکھا۔ اسی روز انہوں نے اس بچی کا نام 'ماہتاب بانو' تجویز کیا۔

مگر --- قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

'ماہتاب بانو' کی ننھی سی زندگی نے وفانہ کی۔ وہ جو کہنے والے کہتے ہیں کہ جن کے لاڈ گھنیرے، ان کے دکھ بہتیرے، تو یہی مثال اس ننھی سی جان پر بھی صادق آئی۔ جیسا نائمہ بیگم اسے پہلی اولاد کی طرح سینت سینت کر رکھا، نظر گزر سے پرہیز کیا۔ ہوا کا ایک جھونکا قریب سے گزر جاتا تو یہ چونکنی ہو جاتیں، ویسا قدرت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔



سردی کا زمانہ تو تھا، کڑا کے کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ ایسی کہ لحاف سے ہاتھ بھی باہر نہ نکالا جائے۔ حالانکہ نائمہ بیگم ہر وقت ماہتاب بانو کو کرتاؤں پہنائے رکھتیں اور گھنٹوں تخت پر دھوپ کھلایا کرتیں، مگر ہونی شدنی کو کون روک سکا ہے! معلوم نہیں کب اور کیسے --- بے چاری بچی کو ٹھنڈ لگ گئی۔ ڈاکٹروں حکیموں کو دکھاتے دکھاتے پسی چلنے لگی۔

سب کی متفقہ رائے تھی کہ نمونیہ ہو گیا ہے اور نمونیہ بھی کیسا، ڈبل نمونیہ --- نائمہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابامیاں کی پریشانی بھی دیدنی تھی --- ابھی تو

س بچی کو گاؤں والوں میں سے کسی نے دیکھا تک نہ تھا۔ ابامیاں نے ہوٹل ملازم کو بھیج کر گل کو بلوایا تھا، وہی ہر ڈاکٹر اور حکیم کے پاس مانگے بھاگے پھر رہے تھے۔

ایک تین دن کے اندر کئی معالج تبدیل کئے گئے۔ مگر ہوا وہی جو خدا کو منظور تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر تو یہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

چوتھے دن صبح صادق کے وقت ---

ننھی ماہتاب نے اپنی ماں کی آغوش میں دم توڑ دیا۔

نائمہ بیگم نے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ روتے ہوئے اسے ابامیاں کی گود میں ڈال دیا۔



معصوم ماہتاب کی اچانک موت نے نائمہ بیگم کا مزاج بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ جیسے آپ ہی آپ بچھ کر رہ گئیں۔ لیکن اس تبدیلی کے ساتھ ہی ان کا رویہ دلشاد اور شمشاد سے بڑی حد تک اچھا ہوتا گیا۔ بچے ماں کی محبت کو ترسے ہوئے ایک دم ہی ان کے ہو کر رہ گئے۔

خاص طور پر دلشاد تو ہر وقت یہی چاہتا تھا کہ ماں کے ساتھ دیکار ہے۔

ماہتاب کے انتقال سے مشکبار بھی سہم کر رہ گئی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا مگر اب دلشاد شمشاد کو ماں سے قریب دیکھ کر اسے روحانی خوشی کا احساس ہوتا۔

سال بھر کے وقفے سے نائمہ بیگم نے ایک تندرست بیٹے کو جنم دیا۔ مگر بد قسمتی سے وہ بھی دو ماہ کا ہو کر راہی ملکِ عدم ہوا۔ اس کا نام انہوں نے بڑے ارمانوں سے 'جہاں زیب عالم' رکھا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ پکارنا نصیب نہ ہوا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے تھوڑے وقفے سے ان کے تین بچے، ان دونوں سمیت انہیں داغ مفارقت

دے گئے۔

نائمہ بیگم کا صدموں، غموں اور دکھوں سے برا حال تھا۔ کچھ سمجھ نہ آتی کہ کیا کریں۔ قدرت گود تو ہری کرتی تھی مگر بھری نہ رہنے دیتی تھی۔ یہ تو سب میں زیادہ دکھ کی بات تھی۔ اس سے بہتر ہو تا کہ یہ بچے دنیا میں انہیں دکھ دینے آتے ہی نہ۔! اپنے طور پر انہوں نے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ ڈاکٹری اور حکیمی علاج تو وہ نوزائیدہ بچوں کا شروع ہی سے رکھتی تھیں مگر ان کی زندگی کی خاطر ابا میاں سے چوری چوری تعویذ گنڈوں تک پر اتر آئیں۔

لکھنؤ اور سہارن پور کے درمیان خاصا فاصلہ ہونے کے باوجود ان کے میکے سے اب بھی کبھی کبھار کانا نہ جڑا ہوا تھا۔ اس عرصے میں ان کے بھائی ذاکر حسین نے موٹر خرید لی تھی ان کے حالات بہتر ہو گئے تھے۔ ان کی..... اماں ابھی تک حیات تھیں لیکن کبھی بھول کر بھی بیٹی کی دہلیز پر قدم نہ رکھا۔

ذاکر حسین کبھی سال چھ مہینے میں پھیرا لگا جاتے۔ ایک بار شاہ جہاں بھی ان کے ہمراہ آئی تھیں۔ یہاں چہلپتی مند کو بچوں کے لئے بلکتا دیکھ گئی تھیں۔ ازراہ ہمدردی اس نے لکھنؤ پہنچ کر تعویذوں کا ایک پلندے کا پلندہ بھیج ڈالا۔ مگر۔۔۔ کسی ایک تعویذ نے بھی خاک اثر نہ کیا اور نائمہ بیگم نامرادی رہیں۔

اب وہ خاصی حد تک چڑچڑی بھی ہو گئی تھیں اور ماہتاب بانو کے فوت ہو جانے کے بعد پہلے پہل جو انہیں دلشاد اور شمشاد پر مامتا آئی تھی۔ اب اس کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ وہ خود پے در پے صدموں سے ویران اور اجڑی اجڑی رہنے لگی تھیں۔ حالانکہ اگر سمجھ دار اور دیانتداری سے کام لیتیں تو ان تین بچوں سے بھی جی بہلا سکتی تھیں آخر کو یہ بھی ان ہی کی پیٹ کی اولاد تھے۔ لیکن ایسا ان کے لئے ممکن نہ ہوا اور وہ اپنی ہائے میں مصروف رہتیں۔

اب تو وہ ابا میاں کے طعام و قیام کا خیال بھی کم ہی رکھتیں۔ جی اٹھتا تو کچھ اپنے ہاتھ سے پکایا دیتیں ورنہ گھر میں جو کچھ ہو تا وہی ان کے سامنے بھی جاتا۔

انہی دنوں کوئی کھیل تماشہ یا دوسری دلچسپی یاد نہ آتی۔

اتنے عرصے میں مشکبار بھی خوب سمجھ دار اور ہوشیار ہو گئی تھی۔ باورچی خانے کا بیشتر کام کاج اس نے خود بخود بحسن و خوبی سنبھال لیا تھا۔ کھانا وغیرہ ماں کی طرح سلیقے اور ہنرمندی سے تیار کرنے لگی تھی۔

اس کے کاڑھے ہوئے تکیے اور میز پوش کب کے مکمل ہو چکے تھے مگر وہ آج تک بانو کو بھجوانہ سکی تھی۔ ویسے کے ویسے بکس میں دبے پڑے تھے۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ بانو کے لئے مشکبار ایک یاد پارینہ بن کر رہ گئی تھیں۔ اس ایک ملاقات کے بعد دوسری دفعہ کا ملنا نہ ہو سکا تھا۔ نہ وہ لوگ کبھی یہاں آئی تھیں نہ نائمہ بیگم نے کبھی پلٹ کر گاؤں جانے کا نام لیا تھا۔ وہ اپنی الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس دوران بس گل کا آنا جانا رہا۔

انہوں نے وکالت کا آخری سال بھی کامیابی کے ساتھ پاس کر لیا تھا۔ پھر ایک اچھے وکیل کے ساتھ مل کر پریکٹس کرنے لگے تھے۔ دو ایک سال کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ اپنی وکالت علیحدہ کر لیں گے۔

ان تینوں بہن بھائیوں کے ساتھ گل کارویہ وہی پہلے کی طرح نرم اور خوشگوار تھا۔ وہ ان لوگوں کے لئے ایسے ہی کڑھتے تھے جیسے اپنے سگے اور ماں جائے بہن بھائیوں کے لئے۔



گزشتہ بہت سارے دنوں سے وہ ایک خاص طرح کی فکر میں غلطاں تھے۔ ایک اتوار کو ہمت کر کے انہوں نے اپنے والد کے سامنے وہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

معلوم کروان کو درجہ اول میں داخلہ بھی مل جائے گا یا نہیں۔۔۔ مجھے دراصل اب تک کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ اور تمہاری اماں ماشاء اللہ ان کی طرف سے ایسی غافل ہیں کہ نہ کبھی خود خیال کیا نہ میری توجہ دلائی۔ میں سمجھتا ہوں اس میں میری زیادہ غفلت کو دخل بھی نہیں ہے کیونکہ یہ میری عادت ہے کہ میں گھر کے اندرونی معاملات میں تاک جھانک نہیں کرتا۔ اب یہی دیکھ لو کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان دونوں بچوں کی کیا مصروفیات ہیں اور یہ سارا دن کیا کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کو کب کا ہی اسکول میں داخل کر دینا چاہئے تھا۔۔۔۔۔

وہ بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔

سب سر جھکا کر سنتے رہے۔ گل نے بہت نازک موضوع چھیڑا تھا۔ جو درحقیقت ابامیاں کے عین دل پر جا کے لگا تھا اور شاید وہ خود کو قصور وار سمجھ رہے تھے مگر انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ الزام نامہ بیگم کو بھی دیا تھا۔

اور نامہ بیگم۔۔۔۔۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔ واقعتاً غفلت اور بے پروائی سے انہوں نے بھی کام لیا تھا۔ کبھی بچوں کی ضروریات کو قابل غور نہ سمجھا۔

گل کو ابامیاں کی اس درجہ حمایت کا یقین نہ تھا۔ خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ حوصلہ اور جرأت فرید بلند ہو گئی۔

انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مصالحانہ انداز میں کہنے لگے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ ویسے بھی دو ایک اساتذہ سے میری ذاتی واقفیت ہے داخلہ تو انشاء اللہ آسانی ہو جائے گا۔ میں تو آپ کی اجازت اور رائے لینا چاہتا تھا۔ اگر آپ کہئے تو میں کل صبح ہی یہاں حاضر ہو کر بچوں کو اسکول چھوڑ آؤں گا۔ تمام اساتذہ سے تعارف بھی ہو جائے گا اور داخل بھی کروادیے جائیں گے۔ تاخیر سے ویسے بھی کام نہیں لینا چاہئے۔۔۔ ششما ہی امتحانات سر پر ہیں۔“

اس روز چھٹی ہونے کی وجہ سے ابامیاں گھر پر ہی تھیں۔ اور برآمدے میں لیٹے ہوئے کسی دینی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نامہ بیگم دوسرے پلنگ پر براجمان ترکاری بنا رہی تھیں اور مشکبار باورچی خانے میں کچھ کام کر رہی تھی۔۔۔ گل کچھ دیر نامہ بیگم سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر برابر موقع کی تلاش میں رہے۔۔۔ جیسے ہی ابامیاں نے کوئی بات کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے لمحہ غنیمت جانا، بلا تہمید کہنے لگے۔

”اباجی! یہاں اپنے گھر سے نزدیک ہی ایک نیا پرائمری اسکول کھلا ہے۔ دلشاد اور شمشاد سارا دن بے کار گھومتے اور شرارتیں کرتے رہتے ہیں، اگر آپ کی رائے ہو تو ان دونوں کو داخل کر دیا جائے۔“

ابامیاں چونک کر ان کی صورت گھورنے لگے۔

نامہ بیگم بھی ترکاری بنانا چھوڑ کر چاقو ٹوکری میں رکھ کر اس طرف متوجہ ہو گئیں۔۔۔۔۔ مشکبار سر تپا گوش بن کر باورچی خانے کے دروازے سے چپک کر یہ اہم ترین گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگی۔

ابامیاں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

”کہاں پر کھلا ہے یہ اسکول؟“

”یہاں سے چند گلی پیچھے ہٹ کر مین روڈ سے پہلے ہی، بڑا سا گیٹ ہے سبز رنگ کا محل وقوع ایسا ہے کہ موٹر کیے وغیرہ کا خوف نہیں ہے۔ کیونکہ سڑک پار کرنی نہیں پڑے گی۔ گلیاں ہی گلیاں ہیں۔۔۔۔۔“

”یہ تو تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔“ ابامیاں نے ان کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں

جواب دیا۔

”اب یہ دونوں اتنے بڑے بڑے ہو چکے ہیں۔ الف ب تک نہیں جانتے۔ یہ تو

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور ادھر باورچی خانے میں مشکبار کا دل بلیوں اچھل اچھل جا رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر گل بھائی جان کے ہاتھ چوم لے۔ ان کے حق میں ہزاروں دعائیں کر ڈالے۔ جو اس کے بھائیوں کے لئے سگے خون سے بھی زیادہ بڑھ کر سوچ رہے تھے اور اپنے والد سے بے حد ڈرنے کے باوجود آج کتنا بڑا رسک لے کر وہ موضوع زیر بحث لاپچکے تھے، جو آج تک کسی کے ذہن میں آیا ہی نہ تھا۔ بچے ہونے کی وجہ سے وہ دونوں سارا دن ماں سے پچاسوں کو سننے اور نت نئی گالیاں سنتے لیکن شوخیوں اور شرارتوں سے پھر بھی باز نہ آتے تھے۔ کوئی دوسری مصروفیت نہ ہونے کے سبب بعض اوقات ان کی ضدوں سے مشکبار کا بھی جی عاجز آ جاتا۔ ابامیاں کے دفتر چلے جانے کے بعد ساری سیڑھیوں میں اودھم مچاتے پھرتے۔ کبھی گرتے کبھی چوٹیں لگواتے۔

اب دونوں کے اسکول داخل ہو جانے کا منصوبہ سن کر سچی خوشی سے اس کی آنکھیں بار بار بھری چلی آرہی تھیں۔ دل ممنونیت کے احساس سے لبریز تھا۔ آج بھائیوں کے بہتر مستقبل کے لئے مانگی ہوئی اس کی دعائیں پوری ہونے کا دن آگیا تھا اور اس کے لئے وہ گل کی مشکور و ممنون تھی۔

ادھر باہر بالآخر آخری فیصلہ ہو چکا تھا۔

ابامیاں نے کھلے دل سے گل کو کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے میاں! تم ان دونوں شیطانوں کے داخلے کا بندوبست کرو مگر ان کو اسکول پر سوں لے جانا کل سویرے آکر انہیں درزی کے پاس لے جاؤ، یونیفارم وغیرہ سلے گا اور جوان کا نصاب اور دوسری پڑھنے لکھنے کی چیزیں ہیں وہ سب خرید کر ان کے حوالے کرو۔“

”جی بہت اچھا۔“ گل نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

ابامیاں ان سے باتیں کرنے کے بعد دوبارہ کتاب میں محو ہو گئے۔

اور گل نے مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف دیکھا جہاں مشکبار بے اختیار لھڑکی میں سے جھانک کر ان کو دیکھ رہی تھی۔

جیسے زبان حال سے ان کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔

گل کے لبوں پر ایک مطمئن اور پرسکون سی مسکراہٹ تیر گئی۔

آج وہ بھی بہت خوش اور آسودہ تھے۔

ابامیاں کے اس آسانی سے رضا مند ہو جانے کا تو انہیں بھی گمان نہ تھا۔ بس ڈرتے جھجکتے ہی یہ ذکر چھیڑا تھا جو خدا کی قدرت کہ بالآخر کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

نامہ بیگم دوبارہ ترکاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ اس ساری گفتگو کے دوران چونکہ وہ خود دل ہی دل میں قائل اور شرمندہ سی ہو چکی تھیں، اس لئے انہوں نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا اور تو اور ابامیاں کے اپنے متعلق ریمارکس کو بھی بڑی حوصلہ مندی اور وسیع النظری سے پی گئی تھیں۔ ظاہر ہے ہوانہ کی اولاد کی فلاح و بہبود کے لئے کہہ رہے تھے۔ ورنہ انہیں بھلا کیا ضرورت پڑی تھی۔

گل اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھے۔

باپ کی طرف کنکھوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں پوچھنے لگے۔

”کیوں اماں جان! آپ نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی! اگر آپ ماسٹر جی کی پٹائی

وغیرہ سے اندیشے میں مبتلا ہوں تو پھر..... پھر رہنے دیتے ہیں۔“

نامہ بیگم جانتی تھیں وہ شوخی پر آمادہ لگ رہا تھا۔

انہیں جھوٹ موٹ جھڑک کر بولیں۔ ”چپ رہے..... چلا ہے باتیں مٹکانے۔

میری بلا سے ماسٹر ان آفت کے پرکالوں کو ماریں یا تھپکیاں دیں۔ بھلے سے چند گھنٹوں

کے لئے گھر سے دور تو رہیں گے۔ یہاں تو سارا دن اور دو پہر وہ ناک میں دم رکھتے ہیں

سادھ لی تھی اور اب خاموشی سے جو پکٹا کھا لیتے تھے۔ وہ فطری طور پر شریف النفس انسان تھے، ان کا خیال تھا کہ بچے درپے اولاد کا زخم کھا کھا کر ان کی بیوی کا دل زخمی ہو چکا ہے اور اب بلاوجہ ان کو چھیڑنا کم ظرفی کے مترادف ہو گا۔

مگر آج گل جو شکوہ کرنے پر اترے تو گلہ کرتے چلے گئے۔ نامہ بیگم ان کی ضد پر بہت دنوں کے بعد کھل کر ہنس رہی تھیں۔ انہیں اس وقت وہ گل کا اپنائیت بھرا لہجہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یوں خود ان کا رویہ گل سے ہمیشہ بہت بہتر اور مناسب رہا تھا۔ وہ گل کو کافی حد تک پسند کرتی تھیں اور ان کی کسی بات کا برا بھی نہ مانتی تھیں۔

اس دفعہ بھی انہوں نے پاندان اپنی جانب کھسکاتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔ ”اے بھئی! دل کیوں میلا کرتے ہو۔ اگر ہمارے ہاتھ کا کھانا ہی پسند ہے اور اتنی کمی محسوس کرتے ہو تو یہ کونسی بڑی بات ہے کسی روز پکا کر کھلا دیں گے۔۔۔ بس اب خوش ہو جاؤ۔“

گل پہلے سے بھی زیادہ اتر کر بولے۔ ”کسی روز کا کیا مطلب ہوا! اور آج میں آخر کیا قباحت ہے؟ یہ نیک کام آپ آج ہی کیوں نہیں کر ڈالتیں۔“

”اس وقت!“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ ”نا بابا۔۔۔ اب تو بہت دوپہر چڑھ گئی ہے۔ جو کچھ مشکبار پکا رہی ہے وہی صبر شکر سے کھا لینا۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ اگلی اتوار کو ضرور کوئی نہ کوئی اہتمام کر ڈالوں گی۔ چلو لگے ہاتھوں تمہارے باوا پر بھی احسان ہو گا۔ پچاس بار ٹوک چکے ہیں مجھے۔“

آخری جملہ انہوں نے ابامیاں کو سنانے کے لئے کہا تھا اور کہہ کر بے اختیار ہنس بھی پڑی تھیں۔

مگر انہوں نے شاید ساری گفتگو ہی نہیں سنی تھی۔

اسی طرح کتاب پڑھنے میں مصروف رہے۔ متوجہ نہیں ہوئے۔

کہ بس تو بہ بھلی۔ مجھے تو ان گھوڑ مارے اسکولوں کا معلوم نہ تھا ورنہ میں تو اردلی کے ساتھ بھجوا کر ان شریروں کو کب سے اسکول میں بند ہوا چکی ہوتی۔“

ان کے لفظ ’بند ہوانے‘ پر گل ہنس پڑے۔ ”واہ اماں! آپ نے تو بیک جنبش زبان مکتب کو ’اصطبل‘ بنا ڈالا۔ اسکول نہ ہوا وہ بازار ہو گیا جہاں مولیٰ باندھے جاتے ہیں۔“

وہ بھی ہنس پڑیں اور مشکبار کو آواز دے کر بولیں۔ ”لو بھئی یہ ترکاری لے جاؤ۔ ہم نے بنادی ہے۔ اب پکانا تمہارا کام۔“

وہ ترکاری لے کر دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی تو گل تردد سے بولے۔ ”اماں! خدا معلوم آپ کو کیا ہو گیا ہے اب تو ہفتوں آپ کے ہاتھ کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی۔ وہاں ہوٹلوں کا ابلا ابلا کھانا کھا کر طبیعت اوب جاتی ہے۔ یہاں ہر اتوار کو اس لئے دوڑے چلے آتے ہیں کہ آج ضرور ہماری اماں نے کوئی مزے کی چیز بنائی ہو گی۔ مگر..... اس نے منہ بسورتے ہوئے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔“

نامہ بیگم کو ایک بار پھر ہنسی آگئی۔ ”اے تم تو اس طرح رونے بیٹھ گئے جیسے مشکبار ڈھنگ کا نہ پکاتی ہو۔ میرا تو خیال ہے اب وہ اچھا خاصا مزے کا کھانا تیار کر لیتی ہے۔ کوئی ایسا خاص نقص یا کمی نہیں ہوتی۔ اسی لئے تو میں بھی بے فکر ہو گئی ہوں۔“

”اجی چھوڑیئے۔“ گل جھنجھلا کر بولے۔ ”جو آپ کے ہاتھ میں لذت اور مزہ ہے وہ دوسرے کے ہاتھ میں تھوڑی ہی ہو سکتا ہے۔ آپ کی باتوں سے پہلے وہ جس نے آپ کے تیار کردہ کھانے چکھے نہ ہوں۔ افسوس! مجھے تو وہ گیا وقت ہاتھ نہیں لگتا۔“

نامہ بیگم کو اپنی تعریف سن کر دلی خوشی ہوئی۔



بہت دنوں کے بعد کسی نے ایسی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ ان کے خود باورچی خانے میں دلچسپی نہ لینے پر ٹوکا تو ابامیاں نے بھی تھا مگر ایک دوبار کہنے کے بعد چپ

نامہ بیگم اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔
اور گل، شمشاد و لثاد کو بلا کر ان سے اسکول کی باتیں کرنے لگے۔



جائے جاڑوں اور آتی گرمیوں کے خوشگوار شب و روز تھے۔ نہ زیادہ گرمی۔۔۔ نہ زیادہ سردی۔

ایسے میں قدرت نے ایک بار پھر نائنمہ بیگم کی جھولی بھر دی۔

اس واقعہ ان کی گود میں سانولی رنگت، معمولی سے نقوش اور دبلے پتلے وجود والی نازک سی بیٹی نے آنکھ کھولی تھی۔

دشاد، شمشاد اور مشکبار کی بہن تو وہ کسی طرف سے بھی نہ لگتی تھی۔ نہ ہی ابامیاں کی سرخ و سپید رنگت لی تھی اس نے۔ نہ نانمہ کے تیکھے تیکھے نقوش چرائے تھے۔ بس اپنے رنگ میں رنگی ہوئی۔

---اور--- خدا کی شان-- کہ یہی بچی جی پڑی نہ اسے نزلہ زکام ہو انہ کھانسی کھرے
نے پکڑا، بخار آیا نہ بیمار ہوئی۔ ہاں ہاتھوں پیروں اور آنکھوں میں زندگی کی چمک ہی
چمک بھری پڑی تھی۔ اور واقعی وہ جی بھی گئی۔

اس کی روز افزوں بڑھتی صحت دیکھ کر ماں باپ پھولے نہ سماتے۔ ایک مرتبہ بھی ڈاکٹر کے چکر لگانے نہ پڑے نہ ملاسیانوں کو دکھانے کی نوبت آئی۔ نانہ بیگم اس کا مکھڑا دیکھ دیکھ کر جیتیں۔ پچاسوں ہی رنگ برنگی فراکیں سی ڈالیں۔ وہ بھی خوب شوخ تھی۔ ماں کو دیکھ دیکھ کر ہنسی۔۔۔ کھلکھلاتی۔۔۔ جو بھی توفیق ہوئی نانہ بیگم بھی کبھی اس کا صدقہ، کبھی خیر خیرات کبھی اتارے دیتی چلی گئیں۔ خدا نے زندگی دے کر دنیا میں بھیجا تھا، سو اس کا بال بھی بیکانہ ہوا۔ دھیرے دھیرے تین چار ماہ کی مدت بیت گئی۔

اب وہ اس کی طرف سے خاصی مطمئن رہنے لگی تھیں۔ اس مرتبہ خود نام رکھنے

مہے بجائے سامنے والی جامع مسجد کے حافظ صاحب کو بلوا کر نام رکھوایا۔ اور اسی روز سے
 ر کے سب سے چھوٹوں میں وہ 'عائشہ بیگم' کے نام سے پکاری جانے لگی۔ لاڈلی ---
 بتی اور اکلوتی۔۔۔ عائشہ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتی ماضی والی خوش لباس، خوش خلق اور خوش
 نامہ بیگم دوبارہ بیدار ہوتی چلی گئیں۔

ایک عائشہ کیا ملی، ان کی اجازت اور سنسان گلی کی سی زندگی لہلہا اٹھی۔ دھیرے دھیرے سارے رنگ دوبارہ چمک اٹھے تھے اب وہ پہلے کی طرح اپنے پسندیدہ کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ زندگی میں اک گہما گہمی اور رونق سمٹ آئی تھی۔ اس شگوار تبدیلی سے ابا میاں نے سکون کا سانس لیا۔

اگر کہیں عائنہ بولنے کے لائق ہوتی اور وہ آسمان کے تاروں کی فرمائش کر بیٹھتی کچھ تعجب نہ تھا کہ اس کی اماں سنجیدگی سے تارے توڑ لانے کی ترکیب بھی سوچنے ، جاتیں -- بچی کی ایک معمولی سی چیخ ان کے دل کا ناسور بن جاتا۔ ایسا ہتھیلی کا پھپھولا کہ اگر سور ہی ہے تو کسی کا زور سے بولنا تو دور کی بات، کسی کی مجال نہ ہوتی کہ چلے پیروں کی دھمک تو پیدا ہو جائے!

وہ تو خدا کا لکھ لاکھ شکر تھا کہ گل نے شمشاد اور دلشاد کو اسکول کی راہ دکھلا دی تھی۔
 وہ صبح کے گھر سے نکلے بعد دوپہر ہی اندر گھستے تھے ورنہ اللہ معلوم ان کی شرارتوں پر
 ما ان کا کیا حشر نہ کر ڈالتیں! بچے فرش پر مشکبار قدم دبا دبا کر چلتی، کسی وقت بے
 ٹی میں زینے تیز تیز چڑھ آتی اور ایسے میں جو عائنہ سورہی ہوتی تو اماں ایک زبان میں
 رصلو تیں ساڈا تیں۔

چڑیل، ڈائن اور کٹنی، تو ان کے مخصوص القابات تھے جن سے وہ مشکبار کو بلا تکلف میں کئی دفعہ نواز ڈالتیں۔ ان کے علاوہ کوئے بھی تھے، جو خاص انہی کی ایجاد تھے بارہر کوئے پر دل مسوس کر رہ جاتی۔

ماں کے سراسر ترجیحی سلوک سے ایک آہ اس کے دل سے نکلتی اور بعض اوقات تو بڑی مظلومیت سے سوچنے لگتی۔

’اے اللہ میاں! تو نے اماں کو اتنی کڑی اور زہریلی زبان کیوں عطا کی ہے؟ ایسی ایسی باتیں تو کوئی ماں بھی اپنی بیٹی کو نہ سناتی ہوگی۔ میں ایسی کون سی خطا کر جاتی ہوں؟ سارا دن تو ان کی مرضی کے مطابق کام کاج میں الجھی رہتی ہوں۔ یہ پھر بھی کبھی خوش نہیں ہوتیں۔ عاشی ذرا سی ہے پھر بھی ہر وقت..... اس کے لئے نت نئے کپڑے اپنے ہاتھ سے سیتی ہیں اور ہمیں تو کبھی ایک دوپٹہ بھی رنگ کر نہیں دیا۔۔۔۔۔ کبھی بال بھی نہیں سلجھائے ہمارے!‘

اپنے بالوں کے متعلق سوچ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو قطار در قطار بھر آتے۔

جہاں اسے قدرت نے لمبے لمبے قابل رشک کالے بھنورا سے بال عطا کئے تھے وہی اسے خدا کی یہ عطا بہت برا عذاب معلوم ہوتے۔ کسی نہ کسی طرح سلجھا سلجھا کر چوٹی تو وہ باندھ لیا کرتی تھی مگر ان بالوں کا دھونا۔۔۔۔۔ اس کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا! جب تک وہ لکھنؤ میں تھی، نانی اماں ہمیشہ اسے بلوا کر بڑی محنت اور محبت سے اس کے بال دھوتیں، خوب دیر تک ایک ایک بال میں تیل چھلتیں اور پھر کس کے چوٹی باندھ دیا کرتیں۔

مگر اب وہ زمانے کہاں تھے بھلا۔۔۔۔!

سب کچھ خواب و خیال ہو چکا تھا۔

نانی اماں کے تصور کے ساتھ ہی اسے اپنے چچا، چچی اور ان کے بیٹے یاد آ جاتے۔۔۔ بچپن کی شوخیاں، شرارتیں یاد آتیں۔۔۔ منوں مٹی تلے سو جانے والے جان سے پیارے۔۔۔ ابا یاد آ جاتے۔ اور ان سب انمول اور قیمتی یادوں کے ساتھ ساتھ ہی۔۔۔

روتے روتے اس کی ہنسی بندھ جاتی۔

چند برسوں کے اندر کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

انقلابات آگئے تھے۔۔۔۔۔ زندگیاں الٹ پلٹ کر گئی تھیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، گھر میں عائشہ کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ نامہ بیگم کی لاڈلی اور چہیتی جو تھی۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب گھر گھر انگریزی کی اہمیت اور ضرورت کے چرچے گونج رہے تھے۔ لوگ انگریزی پڑھ رہے تھے۔ سیکھ رہے تھے۔ بچوں کو انگریزی طرز معاشرت سے آگاہی ضروری خیال کی جانے لگی تھی۔ خوش حال گھرانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں داخلے لے رہے تھے۔

نامہ بیگم اپنے آس پاس اور ملنے جلنے والوں کے بچے کے یہ جو نچلے اور ڈھنگ بہ نظر غور دیکھ رہی تھیں۔ اور سب کچھ ذہن نشین کئے جا رہی تھیں۔ عائشہ ابھی اس قابل تو نہ تھی کہ پڑھائی لکھائی جاتی۔ اس لئے نامہ بیگم نے اپنی حسرت یوں پوری کی کہ عائشہ کے لئے الگ سے ایک ملازم رکھا گیا جو ہر شام اسے باقاعدگی سے بچہ گاڑی میں بٹھا کر قریبی پارک میں ہواخوری کے لئے لے جاتا۔ نامہ بیگم نے درزی سے اس کے لئے خوبصورت اور انگریزی طرز کے کپڑے بھی سلوائے اور ابھی سے اس کے بال بوائے کٹ رکھوائے تھے۔

ننھی عائشہ کے یہ ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر مشکبار کے دل میں کبھی حسد یا رشک کے جذبات نہیں بھڑکے۔ وہ اس کے اچھے اچھے کپڑے اور کھلونے دیکھ کر خوش ہوتی۔ لیکن نامہ بیگم خود ہی کبھی ایسی اوچھی بات کر جاتیں کہ وہ دہل کر رہ جاتی اور بعد میں سوچتی ہی رہ جاتی کہ اماں ایسی فرق والی بات کیوں کرتی اور سمجھتی ہیں۔۔۔ جس کا مجھے گمان تک نہیں ہوتا۔۔۔ میں کوئی یو قوف ہوں کہ اپنی ہی ذرا سی بہن سے جلوں گی! اور

پھر۔۔۔ مجھ میں اور اس میں تو کتنے ہی سارے برسوں کا فرق حاصل ہے!
ایک روز اس کے ہاتھ سے دھوئے ہوئے عاشی کے دودھ کی بوتل گر کر ٹوٹ گئی

اور اتنی سی بات پر اماں نے کس کس کر دودھو کے اس کی پیٹھ پر جڑ دیئے۔

یہ بھی خیال نہ کیا کہ اب وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں رہی کہ یوں بچوں کی طرح پٹے۔
مگر نامہ بیگم کی سی مطلق العنان حکمران کو بھلا یہ سچ کون سنا سکتا تھا؟ مشکبار کو اس مار کو
بہت ملال ہوا تھا اور جب اماں دوپہر کو عائشہ کے ساتھ اپنے کمرے میں جا سوائیں تو وہ
بہت دیر تک جھجھے پر کھڑی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ نیچے بازاروں میں خوش
باش لوگوں کا اثر دھام تھا۔

کھلی کھلی سڑکیں اور کھری کھری قضا ئیں تھیں۔

فٹ پاتھوں پر چلنے والے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ بچے گلیوں
میں خوبصورت بستے ڈالے آ جا رہے تھے۔ رونق تھی۔۔۔ چہل پہل تھی۔۔۔ گہما گہمی اور
شور و غوغا تھا۔

مگر آج مشکبار کے دل کو سکون نہ تھا۔ روح جیسے داغدار ہو گئی تھی۔ لاکھ نہ چاہنے
کے باوجود نامہ بیگم سوتیلی ماؤں کی طرح ننھی عاشی کے لئے خود بخود اس کے دل میں
تعصب اور حسد پیدا کر رہی تھیں۔

”یا اللہ! میں کیا کروں۔۔۔ اور کہا جاؤں!“

اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھ کر خود ہی اپنے آنسو پونچھ لئے۔ ظہر کی
اذان ہو چکی تھی اور سامنے جامع مسجد کے صحن میں نمازی جمع ہونے لگے تھے۔ مسجد
بھری بھری اور آباد ہو رہی تھی۔

ابامیاں کا یہ گھر کچھ ایسے محل وقوع سے بنا ہوا تھا کہ اونچائی پر بنی ہوئی جامع مسجد کا
صحن اور سامنے کا برآمدہ یہاں سے صاف نظر آتا تھا۔ مشکبار کا جب بھی جی گھبراتا وہ

یہاں سے نمازیوں کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے، وضو کرتے اور نماز ادا کرتے ہوئے
کتنی کتنی دیر کھڑی دیکھتی رہتی۔



یہ پانچویں وقت کا روح پرور نظارہ اسے بہت تسکین دیتا تھا۔

اس جھجے سے گھوم کر اگر دوسری طرف کے جنگلے میں جا کھڑے ہوتے تو ایک
وسیع و عریض حویلی کی بالائی چھت کا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ چھت بہت
کشادہ اور خوبصورت طرز تعمیر کا منہ بولتا شاہکار لگتی تھی۔ سامنے کوڑھلواں چھت والی
برساتی بنی تھی۔ جس کے گول گول سرخ رنگ کے ستون دوپہر کو سورج کی روشنی میں
اور رات کو چاند کی اجلی چاندنی میں بہت خوبصورت لگتے تھے۔ چھت کا آنگن کچھ اس
انداز سے بنا ہوا تھا..... کہ ہر طرف سے گول نظر آتا تھا۔ فرش اتنا چمکدار اور صاف
جیسے وارنش کی گئی ہو۔

اب تو خاک دھول سے ماند پڑ گیا تھا۔ صفائی کون کرتا! کیونکہ اس حویلی میں رہنے
والے لوگ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ بہت دن گزر گئے تھے مشکبار صرف اتنا جانتی
تھی کہ اس حویلی کے مکین کسی نواب فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آج کل کہاں
غائب تھے؟ وہ لاعلم تھی۔ حویلی نیچے اوپر ویران اور سنسان پڑی رہتی ورنہ اکثر بچوں
کے شور و غل کی آواز ہی چھت سے سنائی دے جاتی تھی۔

اس وقت دوپہر میں وہ تنہا کھڑی کھڑی سوچ میں ڈوب گئی۔

مسجد میں مولوی صاحب نے نماز شروع کر دی۔

وہ بھی اس نیت سے مڑی کہ جا کر وضو کرے اور دنیا داری کی خرافات کو چھوڑ کر
اپنے خدا کے حضور جھک جائے۔ جو نیتوں کا بھید جانتا ہے۔

عین اس وقت جبکہ وہ مڑنے کا قصد کر رہی تھی، اس کی نگاہ نیچے جم کر رہ گئی۔ یوں

مشکبار جیسے خوشی اور مسرت سے بے خود ہوئی جارہی تھی۔ یوں گویا اس کے اپنے ہلکے رشتے دار آگئے ہوں۔ حالانکہ نہ اس کا خون کا رشتہ تھا۔ نہ پہلے سے کوئی جان پہچان۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ ان سب کے خلوص نے اس کا دل اس حد تک موہ لیا تھا کہ وہ اپنے پرانے کی تمیز بھول گئی تھی۔

نامہ بیگم جو اس کے دہائی دینے پر ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھیں، اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر پوچھنے لگیں۔ ”اے کیا ہو گیا ہے دیوانی لڑکی! ہوش و حواس میں بھی ہے یاد ان میں خواب دیکھنے لگی ہے۔ کون آرہا ہے تیرا باپ اس دوپہر میں۔“



مشکبار کو جیسے ہوش آگیا۔ لیکن پھر بھی سرخوشی کے عالم میں جلدی سے بولی۔ ”اماں! بتا تو رہی ہوں کہ گاؤں سے سارے لوگ آئے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے عباس بھائی کو یکے سے اترتے دیکھا ہے۔“

نامہ بیگم کو اور کچھ نہ سوچا تو مسہری کے نیچے جھک کر اپنی جوتی تلاش کرنے لگیں اسے مارنے کے لئے۔

مگر اس سے قبل کہ وہ اپنی حسرت پوری کرتیں، آگے آگے عباس اور ان کے پیچھے پیچھے وہ سب کی سب کمرے میں داخل ہو گئیں۔

”السلام علیکم کہتے کیسے مزاج ہیں؟“

عباس نے بھاری بھر کم آواز میں نامہ بیگم کو سلام کیا اور ان کی مزاج پر سی بھی کی۔ وہ بے چاری ہکا بکا اپنی جگہ پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

بانو بھاگ کر مشکبار سے لپٹ گئی تھی اور کسی طور پر اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔

سکینہ بھابی اور ریمہ آگے بڑھ کر ساس کے قریب کھڑی ہو گئیں۔

نامہ بیگم نے جلد ہی اپنی بدحواسی پر قابو پا لیا۔ سب کو محبت اور خلوص سے بٹھایا۔

گویا اس نے ساکت کر دیا ہو۔۔۔ اس نے دیکھا بڑی سڑک سے مڑ کر دو یکے گھر کی طرف آئے اور بالکل دروازے کے سامنے رک گئے۔ دونوں یکوں پر چاروں طرف سے پردے منڈھے ہوئے تھے اوپر گول چھتریاں تھیں۔

مشکبار نیچے مزید نیچے کی طرف جھک کر غور سے دیکھنے لگی۔

وہ جی ہی جی میں اندازے لگانے لگی۔

”یہ اتنے سارے مہمان کہاں سے آگئے ہمارے ہاں۔۔۔! ہائے اللہ! کہیں اماں کی سہیلیاں وغیرہ نہ ہوں۔ پھر تو سمجھو شامت آئی۔“

اچانک۔۔۔

اس کی ساری سوچیں، سارے خیالات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے۔ آنکھوں کے گوشوں میں ایک جانی پہچانی سی چمک لہرا گئی۔۔۔ دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں سرسرا نے لگیں۔ اس کا جی چاہا۔ یہیں سے ایک زوردار خوشی کا نعرہ مار کر نیچے کود جائے اور سب کے گلے لگ جائے۔

وہ سب ایک ایک کر کے یکوں سے اتر رہے تھے۔

تبھی مشکبار کو جیسے ہوش آگیا۔

وہ اٹنے قدموں بے تحاشہ چلائی ہوئی نامہ بیگم کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”ارے۔۔۔۔۔ اماں اٹھئے۔۔۔۔۔ جلدی سے اٹھ جائیے۔۔۔۔۔ وہ گاؤں سے بہت سارے مہمان آئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ سب نیچے یکوں سے اتر رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔۔۔۔۔ ایک ایک کو پہچان بھی لیا ہے۔۔۔۔۔ ان میں بھابی سکینہ بھی ہیں۔ ریمہ بھی۔۔۔۔۔ اور اماں۔۔۔۔۔ سنئے تو۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ بانو بھی آئی ہے۔ میں نے اس کو چادر کے اندر سے پہچان لیا ہے۔۔۔۔۔ وہ بانو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ اب آپ جلدی سے اٹھ جائیے اماں۔۔۔۔۔ وہ لوگ اوپر آنے والے ہیں۔“

اڑ گئی تھیں۔ ہر روز مشکبار کو خواب میں دیکھتی تھی آج بھی سارے سفر کے دوران اس کی باتیں کر رہی تھی۔ کئی بار ہم نے ٹوکا بھی مگر اس کی زبان تو میرٹھ کی قینچی بنی ہوئی تھی۔ مشکبار، بانو کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

آج اس کا ایک ایک زواں خوش تھا ان سب کو اچانک دیکھ کر وہ اپنی ساری رنجشیں بھول بیٹھی تھی۔ اسے صحیح معنوں میں بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

شربت کے دوران نامہ بیگم نے خاموش بیٹھی بھابی سکینہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے! سکینہ جب سے آئی ہیں، چپ بیٹھی ہیں۔ کسی بات میں دلچسپی نہیں لے رہیں اور میں دیکھ رہی ہوں یہ پہلے کی نسبت کمزور بھی بہت ہو گئی ہیں۔ کیا بیمار ہیں؟“



سب ایک دم ہی خاموش ہو گئے۔

رئیسہ کے چہرے سے ایک تاریک ساسایہ گزر گیا۔

سکینہ بھابی اب بھی خاموش رہیں۔ جیسے چپ کا روزہ رکھ رکھا ہو۔

عباس کھنکار کر بولے۔ ”آپ کو کیا بتاؤں! سوچا تھا۔ فرصت سے عرض کروں گا۔

مگر اب آپ نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو بتا دوں کہ انہی کی وجہ سے ہم آج شہر آئے

ہیں۔ ان کی طبیعت بہت دنوں سے خراب رہنے لگی ہے۔ آپ خود ہی دیکھ رہی ہیں کہ

یہ پہلے کیا تھیں اور اب کیا ہو گئی ہیں جس نے جو بتایا ہم تو کر چکے ہیں۔ اپنے گاؤں کے

علاوہ اس پاس کے ہر حکیم اور ہر وید کو گھر پر بلا بلا کر ان کا علاج کرایا مگر کوئی آرام نہیں

آتا۔ کوئی کچھ مرض تجویز کرتا ہے کوئی دوسری بیماری بتاتا ہے۔ اب عاجز آ کے ہم نے

ادھر کا رخ کیا ہے۔ یہاں سہارن پور میں تو ایک سے ایک ڈاکٹر ہو گا۔ سوچا ہے کہ ابا

میاں سے مشورہ کر کے اب انگریزی علاج کروا کے دیکھے لیتے ہیں۔ شاید اسی سے کچھ

شفا مل جائے۔“

فردا فردا ہر کسی کی خیر خیریت دریافت کی۔ فاطمہ پھوپھو کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا ان کی بینائی پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے اس لئے ساتھ نہیں آسکیں نہ ہی وہ کہیں گھر کے علاوہ آنا جانا پسند بھی کرتی تھیں۔

عباس ایک طرف کرسی پر بیٹھے نفھی عائشہ کو گود میں لئے پیار کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں ایک خوشگوار سا ہنگامہ مچ گیا۔ سکینہ بھابی اور رئیسہ کے

بچے بھی آئے تھے اور بچوں سے جو ماحول میں ایک دم رونق ہو جاتی ہے وہ سبھی جانتے

ہیں۔ اسی شور میں عائشہ بھی اٹھ بیٹھی تھی اور اب عباس کی گود میں ٹھنسی ایک ایک کو

ٹکڑ ٹکڑ دیکھے جارہی تھی۔

جب ہنگامہ ذرا سرد پڑا اور ایک دوسرے کی بات سمجھ میں آنے لگی تو نامہ بیگم نے

مسکراتے ہوئے مشکبار کی طرف دیکھا اور کہنے لگیں۔

”مشکبار! بانو سے باتیں کرنے کو بہت وقت پڑا ہے۔ ذرا اٹھ کر سب کے لئے

شربت تو تیار کر لو۔ بچے پیاس کی شدت سے بلک رہے ہیں۔“

ہاں اماں! جارہی ہوں۔“ وہ خوش خوش یہاں سے اٹھ گئی۔

بانو بھی اس کے پیچھے ہی لپک گئی۔ اسے شہر آنے سے زیادہ مشکبار سے ملنے کی

خوشی ہو رہی تھی اور اب اس سے ایک پل بھی الگ ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دونوں

نے باتیں کرتے کرتے باورچی خانے میں جا کر شربت تیار کیا اور ٹرے میں کانچ کے

گلاس سجا کر ہنستی مسکراتی دوبارہ کمرے میں آئیں۔

نامہ بیگم ہنس کر بولیں۔ ”اے بانو! تم آتے ہی کام میں لگ گئیں۔ بھئی یہ کیا

بیوقوفی ہے؟“

وہ ہنس کر چپ ہو رہی لیکن رئیسہ بولی۔ ”اجی آپا بیگم! بانو کی خوشیوں کا تو کوئی

ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ جب سے سہارن پور آنے کا سنا تھا اس کی نیندیں مارے خوشی کے

ساری تفصیل سن کر نامہ بیگم کوچ کوچ بہت افسوس ہوا۔
کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔ ”آخر تکلیف کس نوعیت کی ہے؟ یہ کیا محسوس کرتی ہیں؟“

اس دفعہ سیکنہ بھابی خود بولیں۔ ”آپا بیگم! تکلیف بظاہر ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ میں خود اس انوکھی بیماری سے تنگ آچکی ہوں۔ اب یہ آخری علاج سمجھ کر اور ان سب کے بے حد اصرار پر یہاں آگئی ہوں۔ اگر اب بھی میں اچھی نہ ہوئی تو خدا معلوم۔۔۔ میں کیا کر گزروں گی۔ میں نے بھی بس یہ فیصلہ کر لیا ہے۔“

یوم معلوم ہوتا تھا جیسے آخری جملہ انہوں نے صرف اپنے میاں سے مخاطب ہو کر انہیں ہی سنانے کو کہا ہے۔

عباس بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے مگر زبان سے کچھ نہیں بولے۔ نامہ بیگم نے اچنبھے سے پوچھا۔

”اور..... تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آخر مرض کیا ہے۔ تم کیا محسوس کرتی ہو! ان مایوس کن باتوں کا کوئی تو سبب ہو گا۔ بھلا ایسی کونسی بیماری ہے جو حکیموں اور ویدوں کی بھی سمجھ سے بالاتر ہے! کچھ تو بتاؤ۔۔۔“

سیکنہ بھابی نے اسی مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

”بس آپا بیگم! ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔۔۔ بیٹھا جا رہا ہے۔۔۔ اور بیٹھ جاتا بھی نہیں۔۔۔ بعض دفعہ سانس تیز تیز چلنے لگتا ہے۔ کبھی تھم تھم کے آتا ہے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ٹھار پڑ جاتے ہیں اور سر میں بے شمار چکر ہی چکر بھر جاتے ہیں۔“



نامہ بیگم جوان کی باتیں بغور سن رہی تھیں اور دل ہی دل میں کسی خاص نتیجے پر پہنچ رہی تھیں، ان کے خاموش ہوتے ہی وثوق سے بولیں۔

عباس جلدی سے کہنے لگے۔ ”جی ہاں اسی لئے ہم نے تھک ہار کر ادھر کا رخ کیا ہے۔ شاید خدا تعالیٰ یہیں صحت یاب کر دے۔ ہمارے یہاں رہنے سے آپ کو تکلیف تو بے شک ہو گی مگر میں بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ پھر آپ سے ملنے کے شوق میں بانو اور دوسرے بچوں نے بھی ضد پکڑ لی.....“

نامہ بیگم نے ان کی بات کاٹ دی اور قدرے برا مان کر بولیں۔ ”دیکھو میاں عباس! یہاں ایسی غیریت والی باتیں تو کروا نہیں۔ اگر کہیں تمہارے ابا میاں یہ باتیں سن لیں تو اک آفت کر دیں گے۔“

اب یہاں اسی قسم کی باتیں چھڑک گئی تھیں۔

مشکبار، ماں کا اشارہ پا کر مہمانوں کے لئے کچھ کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بانو بھی اس کے ساتھ ہی باورچی خانے میں آگھسی۔

پھر تو وہ سارا دن سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ رات کو سوئی بھی اسی

لوں کان پتہ نہیں۔۔ میں نے تو گھر میں کبھی یہ تذکرہ ہی نہیں سنا۔ کبھی گل بھائی جان نے بھی نہ بتایا۔“

”لو جی۔۔ تم بھی عجب بے خبری کی بات کرتی ہو۔“
بانو نے گل کے نام پر آنکھیں منکا کر کہا۔ ”جس روز یہ نکاح ہوا ہے وہ وہیں پر موجود تھے۔“

اف میری توبہ۔“ مشکبار اب بہت حیران و پریشان تھی۔ ”ممکن ہے اماں نے مجھ نانا ضروری نہ سمجھا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ اسی لئے تو بے پاری سکینہ بھابی کا ہڈی سے چڑا لگ گیا ہے۔ ہائے اللہ! کیسی موٹی تازی اور صحت مند تھیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھیں۔ اب تو بس فقط ڈھانچہ رہ گئیں۔ ہائے بانو! ریسہ بھابی نے بھی منع نہیں کیا اس نکاح کو؟ نہ کرتیں تو۔“

بانو سر ہلا کر بولی۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بے چاری مانتی نہیں تھیں۔ انہوں نے صاف صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ اپنی جیٹھانی پر ظلم نہیں کریں گی اور ان کی سوت بن کر نہیں رہیں گی۔۔ اسی ضد میں وہ اپنے میکے میں عدت کے بعد جا بیٹھیں۔ مگر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے چین نہ لینے دیا۔ ایک طرف عباس بھائی صاحب کو عاجز کرنے لگے دوسری طرف ریسہ بھابی کے والدین کو سمجھانے لگے۔ پتہ بھی ہے تم کو اگر ریسہ بھابی فوراً ہی نکاح کے لئے آمادہ ہو جاتیں تو بہت پہلے یہ کام ہو چکتا۔ وہ تو ان کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اتنے دن گزر گئے۔۔ ورنہ عدت کی مدت۔۔ نکال کر حساب لگاؤ! لیاں بھائی کے انتقال کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ چنانچہ جب خاندان والوں کا اصرار دونوں طرف حد سے زیادہ بڑھ گیا اور بات بالآخر پنچایت تک جا پہنچی تو۔۔ آج سے چار مہینے پہلے یہ نکاح ہو گیا۔۔ بس مشکبار! وہ دن گیا اور یہ دن آیا۔۔ سکینہ بھابی بے چاری کسی دن بھی اچھی نہ رہیں۔ دراصل انہیں عباس بھائی سے بہت محبت ہے۔

کے کمرے میں۔

ساتھ رہنے کی وجہ سے باتیں تو تمام دن ہی ہوئی تھیں۔ مگر رات کو جب یہ دونوں لیٹیں تو مشکبار نے وہ بات پوچھ ڈالی جو سکینہ بھابی کو دیکھتے ہی اسے یاد آگئی تھی اور ایک دفعہ بانو اس موضوع پر اس سے بات کر چکی تھی۔

بانو ایک منٹ خاموش رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ”اس روز جو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو عام طور پر اس کا نکاح وہیں سسرال میں کسی سے کر دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ عدت پوری ہو جانے کے بعد تم دیکھ لینا ریسہ بھابی کا نکاح عباس بھائی صاحب سے پڑھو دیا جائے گا وہی بات تو تم پوچھ رہی ہونا!“

مشکبار نے جلدی سے گردن ہلا کر جواب دیا۔ ”ہاں وہی بات۔۔ میرے ذہن میں رہی تو بہت دن تھی، پھر دھیرے دھیرے میں بھول سی گئی تھی۔ آج دوبارہ یاد آگئی۔“
بانو نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پھسکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ ”کمال ہے تم کو اتنی اہم خبر معلوم ہی نہیں۔ اور کیا آج تم نے ریسہ بھابی کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں دیکھیں۔ انہوں نے زیور بھی پہن رکھا ہے اور ہار سنگھار بھی کیا ہوا ہے۔“
مشکبار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”تو کیا..... سچ مچ.....“

”اور کیا جھوٹ موٹ!“ بانو نے آہستہ سے ہنس کر جواب دیا۔ ”ان دونوں کے نکاح کو بہت دن ہو گئے ہیں۔ تم سکینہ بھابی کی حالت نہیں دیکھ رہیں۔ اسی غم میں تو کھ کر کاٹا ہو گئیں۔ وہاں گاؤں میں تو سب نے ٹی بی کا مرض بتا دیا ہے۔ پریشان ہو کر بھائی صاحب یہاں لے کر آئے ہیں۔“

”ہائے اللہ میری توبہ۔۔“ مشکبار کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ”اتنی بڑی بات کا مجھے



ایک دوپہر وہ دونوں باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ گل سب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی موجودگی سے بانو کھلی جا رہی تھی۔ مشکبار نے اسے چھیڑنے کی نیت سے کہا۔ ”سب کے نکاح بیاہ کی تو تمہیں بڑی فکر لگی رہتی ہے۔ ہر کسی کے قصے سناتی ہو۔ کبھی اپنے بارے میں بھی تو اطلاع دو کہ کب شادی ہو رہی ہے تمہاری۔۔۔ اب تو گل بھائی جان کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی۔“

بانو کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ زور سے اسے چنگلی کاٹ کر بولی۔ ”اچھا جی۔۔۔ میں کیا اتنی خراب ہوں کہ اپنا بیاہ آپ خود رچالوں گی تم کس مرض کی دوا ہو۔ بھائی جان، بھائی جان، تو چھٹی رہتی ہو اور بیاہ نہیں کر سکتیں اپنے چہیتے اور لاڈلے بھائی جان کا۔“

مشکبار زور سے ہنس پڑی۔ ”ارے میرے اختیار میں ہو تو ابھی اور اسی وقت یہیں اور اسی باورچی خانے میں قاضی جی کو بلوا کر تم دونوں کا نکاح پڑھوا دوں۔“

دونوں کے حلق سے ایک ساتھ ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

بانو نے جوش مسرت میں اس کی پیٹھ دھمو کے ہی دھمو کے جڑ ڈالے۔ جب سے بانو آئی تھی، مشکبار بہت خوش رہتی۔ دونوں کے درمیان اکثر یہی ذکر اور گل کی باتیں ہوتی رہتیں۔ روایتی مگیتروں کی طرح بانو شرما جاتی مگر چونکہ مشکبار سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی اس لئے ہر طرح کی باتیں کر جاتی۔

پندرہ مئی دن ہو اکی مانند اڑ گئے۔

یہاں کے علاج معالجے سے یہ ہوا کہ سکینہ بھابی کی کھانسی اور ہر وقت رہنے والا ہلکا ہلکا بخار ٹوٹ گیا اور چہرے پر بحالی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

عباس کے مارے خوشی سے پاؤں زمین نہ پر نہ لگتے۔

اتنے عرصے میں ان بے چاروں کا ایک پاؤں گاؤں میں ہوتا تھا تو دوسرا سہارن پور

اس دوسرا ہٹ کو ان کا ذہن قبول نہ کر سکا۔ اب تو ہر وقت ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے۔ حالانکہ بھائی صاحب بہت خیال کرتے ہیں، فاطمہ پھوپھو بھی دلجوئی میں لگی رہتی ہیں مگر ان کی روح کو لگا لگاؤ کم نہیں ہوتا۔ ہر بات میں ان کے حق کو فوقیت دی جاتی ہے۔ گھر میں اہمیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ریسید بھابی بے چاری بھی کبھی کچھ نہیں کہتیں مگر معلوم ہوتا ہے سکینہ بھابی اپنے مرض کو گھٹانے کے بجائے بڑھانا چاہتی ہیں۔۔۔“

بانو خاموش ہوئی تو مشکبار کے پاس کہنے سننے کو بھی نہیں رہا تھا۔ دونوں رات گئے تک یہی ذکر چھیڑے رہیں۔

پھر بانو جمائیاں لیتی ہوئی بستر پر ڈھیر ہو گئی تو مشکبار نے بھی سر تکیے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے دن ابامیاں نے اپنے ایک اچھے اچھے ڈاکٹر دوستوں سے سکینہ بھابی کے لئے تفصیلی گفتگو کی اور پھر ان کے باہمی مشورے سے علاج کروایا۔ انہیں بھی بہو کی حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا تھا۔ مگر سوائے افسوس کے کر کیا سکتے تھے۔ یہ تو دونوں کے معاملے تھے۔

نائمہ بیگم نے ان لوگوں کے یوں اچانک چلے آنے پر ناک بھنویں نہیں چڑھائی تھیں۔ آخر کو یہ سب ان کے سرالی عزیز تھے اور نکاح کے بعد اب پہلی مرتبہ ان کے ہاں آئے تھے۔ وہ بھی مجبوری کی حالت میں اس لئے انہوں نے اپنا رویہ ان کے ساتھ بدستور نرم اور خوشگوار رکھا۔ اور خاص مہمانوں کی خاطر تواضع کرائی۔

گل بھی سب کے آنے کی اطلاع پا کر اگلے دن ہی آگئے تھے اور اب حسب دستور ان کے ڈاکٹروں کے ہاں چکر پہ چکر لگتے۔

انہیں دیکھ کر بانو کی شوخیاں حد سے بڑھ جاتیں۔ آنکھوں میں مستی ہی مستی گھل جاتی۔۔۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی۔

میں۔ دونوں طرف کی فکر تھی ان کو۔

سیکنہ کو بہتر حالت میں دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ سیکنہ کو مزید بہتری کے لئے نہیں رہنے دیں اور ریسہ و بچوں کو گاؤں واپس لے جائیں۔ کیونکہ ان دونوں کے چلے آنے سے وہاں گھر میں بھی کام کاج کے کئی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ فاطمہ پھوپھو اکیلی کیا کیا کرتیں!

ایک دن شام کے وقت جبکہ سب چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، انہوں نے یہی ذکر چھیڑ دیا۔

لیکن ریسہ کو ساتھ گاؤں لے جانے کا سن کر سیکنہ بھابی ایک دم کنٹرول سے باہر ہو گئیں۔ مارے غصے کے ان کی آنکھیں ابل پڑیں۔ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ عباس کیا کہنا چاہتے ہیں، بس دو ٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”بس ہو گیا علاج و لاج۔۔ میں بھی یہاں رہ کر کیا کروں گی۔ میں بھی گاؤں واپس جاؤں گی۔“

نائمہ بیگم اور گل نے بھی بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک ہی رٹ لگا رہیں۔ ان کی ”نا“، ”ہاں“ میں نہیں تبدیل ہو سکی۔ تھک ہار کر سب خاموش ہو گئے۔ بحالت مجبوری عباس دودن مزید رکے۔ پھر ڈاکٹر سے اچھی طرح مشورہ کیا۔ جو دووائیں تجویز کی گئیں، وہ سب خریدیں، ترکیب استعمال ذہن نشین کی اور بالآخر ایک صبح سب کو لے کر گاؤں کو سدھارے۔

نائمہ بیگم کا گھر ایک دم ہی ویران اور سنسان ہو گیا۔

بانو اس دفعہ بھی جاتے وقت مشکبار سے چٹ کر دھواں دھار روٹی۔ مشکبار نے ریلوں سے پوچھ کر مہینوں پہلے کے کاڑھے ہوئے میز پوش اور تنکے کے غلاف بانو کو اپنی یادگار کے طور پر سوئپ دیتے تھے۔

وقت ستر فقراری کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ کاروبار زندگی اسی طرح

رواں دواں رہا۔

جب سے گاؤں کے مہمان آکر گئے تھے، نائمہ اکثر کسی الجھن میں گرفتار سی رہنے لگی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اندر ہی اندر کسی مسئلہ پر الجھتی رہتی ہیں۔۔ کوئی الجھن، سلجھانے میں مصروف رہتیں۔

مشکبار کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ کبھی ماں کی جھڑکی سن لی۔ کبھی رولی کبھی ہنس لی۔ وقت کب رکا ہے۔۔۔ بلا آواز چلتا گیا۔

جرم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
آئیڈیل بک لائبریری
 0301-7283296
 0334-9630911 *عظیم احمد طارق

بات تو کچھ بھی نہ تھی۔

بس اسے مشکبار بے چاری کی شامت اعمال کہہ لیجئے۔

ورنہ ایسا تو اکثر و بیشتر ہوتا ہی تھا کبھی فرصت کے لمحات میں جی گھبرا یا تو وہ مسجد کی طرف والے چھجے پر آکھڑی ہوئی یا نہلتی ہوئی دوسری طرف کے جنگلے کی طرف گئی تو وہیں تھم گئی۔

ادھر چند دنوں سے حویلی جیسے آباد ہو گئی تھی۔ وہاں اب رونق اور چہل پہل کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ لیکن اگر مشکبار ذرا سی بھی ہوشیار ہوتی تو اس امر کو بظاہر تاڑ سکتی تھی کہ حویلی کی یہ رونق دن کے بجائے رات کو نظر آتی تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ لوگ باگ اب آنکھوں میں سونے لگے تھے۔ صحن اور چھتیں آباد ہونے لگی تھیں۔ حویلی کی چھت رات کو بقیعہ نور رہنے لگی تھی۔ ایسا گزشتہ چند روز سے ہی ہوا تھا۔

ادھر سانولی شام چھم سے اتری، ادھر حویلی کی چھت سولہ سنگھار کر کے بننے سنورنے لگی۔ سفید چاندنیاں یہاں سے وہاں تک بچھ جاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گھنگرو اور موسیقی کی محفل جم جاتی۔

مشکبار کو یہ نیا مشغلہ مل گیا تھا۔ وہ اکثر اماں کی نظر بچا کے رات کو کام سے فارغ ہو کر ادھر آنکلی اور جنگلے کے سوراخوں سے آنکھ لگا کر دوسری طرف کا منظر دیکھنے کی کوشش کرتی۔

اس روز ابامیاں گاؤں گئے ہوئے تھے۔

اور آج ہی یوں لگ رہا تھا جیسے محفل شباب پر ہے۔ کوئی خاص بات تھی۔ اماں عائشہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو مشکبار جس کا شام سے دھیان ادھر ہی لگا ہوا تھا، دلشاد اور شمشاد کو نیچے لٹا کر جلدی جلدی اوپر آگئی اور دبے پاؤں جنگلے میں جا چکی۔

محویت کے عالم میں اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ حالانکہ آج دلشاد کی طبیعت سرشام سے اچھی نہ تھی۔ مگر اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس ساز و آواز کی محفل کو چھوڑ کر نیچے اتر جائے۔

بیچ چھت پر ایک بنگلی سے کو ندر ہی تھی۔ گانے اور ناچنے کی محفل جو بن پر تھی اور چاندنیوں پر بیٹھے امیر زادے و نواب زادے داد پر داد دے رہے تھے، حقے اور پان چل رہے تھے۔

اس کو احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب اور کس وقت ابامیاں اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ جب وہ پوری قوت سے جینگھاڑے تو وہ کئی فٹ اچھل پڑی اور انہیں سر پر کھڑے دیکھ کر تھر تھر کاپنے لگی۔

وہ سخت غصے کی حالت میں چلا کر کہہ رہے تھے۔

”--- مردود--- نامعقول--- یہاں کیوں کھڑی ہے--- دیدوں کی شرم ڈھل گئی

ہے--- طوائفوں کی محفلیں دیکھتی ہے--- بے غیرت--- بے حیا---“

انہوں نے زندگی میں پہلی بار اسے ڈانٹا تھا اور وہ بھی اتنے شدید انداز میں--- اس

کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

ان کے غیر متوقع طور پر چلانے کی آواز سن کر اماں بی بھی باہر نکل آئیں ابامیاں کا روئے سخن ان کی طرف مڑ گیا۔

”تم اتنی لا پرواہ اور غافل ہو چکی ہو کہ تمہیں اچھے برے کی تمیز نہیں رہی۔۔۔۔۔ یہ بھی نہیں معلوم اور احساس کہ گھر میں سیانی بچی موجود ہے اور۔۔۔۔۔ مشتری بابائی کی محفل کا نظارہ کر رہی ہے یہاں سے۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوتہ۔۔۔۔۔“

مشکبار گرتی پڑتی نیچے بھاگی۔۔۔۔۔

اماں نے کیا جواب دیا۔۔۔ کیا نہیں۔۔۔ اس نے نہیں سنا، وہ تو بار بار توبہ توبہ کر رہی تھی۔ اپنے پر سو سودفعہ لعنت بھیج رہی تھی اب بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ یہ مشتری بابائی کی محفل ہے۔۔۔۔۔



رات شاید پہلا پہر طے کر چکی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں سے نیند کو سوس دور تھی۔ دوسری پریشانی یہ لاحق ہو گئی تھی کہ دلشاد کو ڈھیروں بخار چڑھا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنی غفلت پر ندامت ہونے لگی۔

بچے کی کیفیت سرسامی سی ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک دھڑک جا رہا تھا۔ اب اتنی ڈانٹ ڈپٹ کھا کر اوپر کیسے جائے؟ دلشاد کی حالت سے کیسے آگاہ کرے؟

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی پریشانی اور بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دلشاد کی حالت بگڑتی جا رہی تھی سارا پنڈا توے کی طرح دھک رہا تھا۔

بالآخر اس نے سوچا نہ بتانے پر صبح مزید شامت آسکتی ہے۔

”ٹھیک ہے۔ جا کر پہلے دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔۔۔۔۔ پھر دلشاد کے متعلق بتا کر بھاگ

آؤ گی۔ ابامیاں کے سامنے ہی نہیں پڑوں گی۔“

اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی۔ اور سچ سچ قدم رکھتی زینے چڑھ کر اوپر آگئی۔

اماں کے کمرے کی جی جل رہی تھی۔

اس کی ہمت بندھ گئی۔

اماں اباد و نونوں ہی باتیں کر رہے تھے۔ اماں تیز لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ وہ صاف لہجے میں کہہ رہی تھیں۔۔۔۔۔ ”تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ آپ غور نہیں کر رہے، بس اوپری انداز میں سوچ رہے ہیں، اس لئے غلط سمجھ

رہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ سوچئے۔۔۔۔۔ وہ شہر میں رہتا ہے یہیں کارہن سہن سیکھ گیا ہے، گاؤں دیہات میں اس کی شادی سراسر نا انصافی ہوگی۔ میں آپ کو یہ زیادتی ہرگز نہ

کرنے دوں گی۔۔۔۔۔ پھر سب میں بڑی بات یہ کہ۔۔۔۔۔ میں اسے ذاتی طور پر پسند کرتی ہوں۔ میں نے عرصہ ہوا دل ہی دل میں اسے اپنی بیٹی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ مجھے پسند ہے بس آپ کان کھول کر سن لیجئے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ مشکبار کی شادی

اگر ہوگی تو صرف گل سے ہی ہوگی۔۔۔۔۔ ورنہ کسی سے نہیں۔۔۔۔۔ خواہ اس کے لئے آپ کو اپنے پورے کنبے سے جنگ کیوں نہ کرنی پڑے۔۔۔۔۔ سن لیا آپ نے۔۔۔۔۔“

مشکبار کی آنکھوں کے نیچے اندھیرے پھیل گئے۔

کانوں میں سائیں سائیں بجنے لگی۔

وہ کلیجہ پکڑ کر بے اختیار فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔



اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی۔

نہ چیخنے کی ہمت رہی نہ دیکھنے کی بصارت۔ وہ چلانا چاہتی تھی۔ اپنا احتجاج اندر تک

پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔

اتنی رات گئے یہ تنہا اور کمزور سی لڑکی کمرے کی دہلیز سے باہر کلیجے کو تھامے بے سدھ پڑی تھی لیکن کوئی پرسان حال نہ تھا۔

اماں اور ابا میاں کو گمان تک نہ تھا کہ اس ننھی سی فاختہ پران کی زہریلی گفتگو سے کیا بیت گئی اور حساس دل پر کیسی گہری چوٹ پڑی ہے۔ وہ دونوں تو مسلسل اپنی باتوں میں مصروف تھے ان کے بولنے کی آواز اب تک کواڑوں کی اوٹ سے سنائی دے رہی تھی لیکن مشکبار کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آرہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ اب اسے کچھ سن کر کرنا بھی کیا تھا؟ جو کچھ سن لیا تھا، وہی پی جانا ممکن لگ رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر کہے۔

”یہ آپ لوگ کس نوعیت کی باتیں کر رہے ہیں، آپ کو نہیں معلوم، گل بھائی جان کو میں سچ مچ اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ وہ مجھے ایک بہن کی طرح چاہتے ہیں۔ لوگو! کبھی بہن بھائی کی شادی بھی ہوئی ہے! نہیں..... ایسا ہر گز نہیں ہونا چاہئے اور پھر وہ تو پرانی امانت ہیں۔ ان کی نسبت ان کی خاندانی روایات کے مطابق بہت پہلے بانو کے ساتھ طے ہو چکی۔“

بانو، کا خیال آتے ہی اس کی بند آنکھوں کے سامنے بانو کا شوخ اور معصوم چہرہ پھرے لگا۔ اس کی حسین آنکھیں، جو گل کا ذکر آتے ہی مست و بے خود ہو جاتیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کا خوبصورت پنچھی پنکھ پیارے آبیٹھتا تھا۔

وہ یہ سب کیسے اور کیونکر برداشت کر پائے گی! ہائے میں نے یہ کیا سنا۔ کاش! میں اس وقت یہاں تک آتی ہی نہ۔۔۔ کم از کم یہ جان لیوا بات چیت تو سننے سے بچی رہتی۔“

معلوم نہیں کتنی دیر تک وہ اسی طرح بے حس سی کچے فرش پر بیٹھی رہی۔ رات

کے ان بے چین گھنٹوں میں اسے اپنے وجود تک سے نفرت ہو رہی تھی۔ برابر کی حویلی سے گھنگھروں کی چھن چھن اور پائل کی جھنکار سنائی دینی بند ہو گئی تھی ہر طرف ایک طویل و عریض خاموشی اور سکوت کی چادر تنی تھی۔ اماں اور ابا میاں شاید کسی حتمی فیصلے پر پہنچے بغیر نیند کی وادی میں اتر چکے تھے اور کمرے میں تیز روشنی کے بجائے کم پاؤں کا بلب جل رہا تھا۔

مشکبار نے اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے وجود کو بمشکل سمیٹا اور ڈمگمگاتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں آگئی۔

کھلے کواڑوں کے پار دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر یکبارگی مشکبار کو یاد آگیا کہ وہ تو دلشاد کے متعلق اماں کو بتانے جا رہی تھی کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مگر اتنی دیر اسے ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ وقتی طور پر وہ اپنی الجھن بھول کر لپکتی ہوئی ننھے دلشاد کے پاس پہنچی اور اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

اس کے سیاہ بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔ جانے کس وقت اسے بھرپور طور پر پسینہ آکر بخار ہلکا ہو گیا اور سانس بھی اعتدال پر آگئی تھیں۔ نیند میں اس وقت وہ بے چین اور بے قرار کے بجائے پرسکون لگ رہا تھا۔

مشکبار کے بے تحاشادھڑکتے ہوئے دل کو جیسے قرار نصیب ہو گیا۔ اس نے سکون و اطمینان کی ایک گہری سانس کھینچی اور وہیں پلنگ پر بیٹھ کر بھائی کی پیشانی سے ننھے ننھے بالوں کے لچھے سمیٹنے لگی۔

باہر سیاہ اور بوجھل رات دھیرے دھیرے بیتے جا رہی تھی۔ لمحات دبے پاؤں آگے کا سفر طے کرتے جا رہے تھے۔ سونے والے میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔

ایک مشکبار تھی، جو چپ چاپ اپنی عجیب و غریب تقدیر پر غور کرتی سوچوں کے

آنگن میں ادھر سے ادھر بیٹابی سے نہلتی پھر رہی تھی۔

دلشاد کے بخار کی طرف سے قدر اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اس کی ازلی حرماں نصیبی کو جلنے اور کڑھنے کے نئے خیر وزن نظر آگئے تھے۔ اور وہ نئے سرے سے ماتم کناں ہو چکی تھی۔



ان پریشان لمحوں میں اسے ابامیاں کی ڈانٹ پھنکار بھی یاد نہیں تھی۔ بس رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے بانو اور گل کی صورتیں آ آگڈھ ہونے لگتیں۔

اماں کی بے حسی اور سنگدلی پر رنج بھی ہو رہا تھا۔ حیرت بھی تھی اور افسوس بھی کتنے مزے اور آسانی کے ساتھ وہ ابامیاں پر اپنے دل کا راز کھول بیٹھی تھیں۔ اور اس طرح بلا جھجک اظہار خیال کر رہی تھیں جیسے گل پر ان کا حق رہا ہو۔

مشکبار کو اس بات پر شدید تعجب تھا کہ اماں کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ بانو گل کی بچپن سے مانگ ہے ان کے خاندان کی لڑکی ہے اور یہ اہم فیصلہ ان کے بزرگوں کے سامنے ہوا تھا۔ اب بھلا اماں کی خواہش پر سب لوگ کیا سوچتے! انہیں ابامیاں سے ایسی بات کہتے ہوئے فاطمہ پھوپھو اور گھر کی دوسری عورتوں کی لاج بھی نہ آئی سب سے بڑھ کر بانو کے گھر والے اور خود بانو کا معصوم دل۔۔۔ وہ تو شاید یہ فیصلہ سن کر بند ہی ہو جائے۔

”اے اللہ پاک! ابامیاں کسی صورت بھی اماں کا یہ ناجائز مطالبہ پورا نہ کریں خواہ اماں کتنا ہی چلائیں غرائیں!“

مشکبار انتہائی بے کسی اور لاچاری کے عالم میں خدا کے حضور گڑگڑانے لگی۔۔۔

جب ہر طرف سے امیدیں ٹوٹ جائیں اور کوئی سہارا دکھائی نہ دے تو خدا کی قابل بھروسہ ذات کے سوا کسی کا آسرا نہیں ملتا۔ وہ بھی اپنی ذہنی پریشانیوں اور کوفت سے

گھبرا کر رو رو کے اپنے رب سے فریادیں اور آہ و زاریاں کرنے لگی۔ اب اس ایک راستے کے سوا اس کے پاس بھلا چارہ کار کونسا رہ گیا تھا! جب سگی ماں ہی دشمنی پر آمادہ ہو جائے تو پھر اس بھری پری کائنات میں کون سا تھ دیتا ہے؟

معالیٹے لیٹے اسے خیال آیا۔

”ارے..... کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ گل بھائی جانخ جن کی زندگی بھر کا سوال تھا وہ بھی اماں کی بات مان جائیں! ظاہر ہے منگنی کے بعد سے بانو کے ساتھ ان کو بھی ضرور کچھ نہ کچھ دلی تعلق اور انسیت پیدا ہو گئی ہوگی، آخر کو بانو میں برائی ہی کونسی تھی! پھر بھلا گل بھائی جان کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی سوتیلی ماں کی آرزو پر اپنی آرزوؤں کو قربان کرتے..... ظاہر ہے وہ ضرور انکار کر دیں گے بس پھر تو اماں اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں گی۔“

سوچوں میں یہ خیال ابھرتے ہی مشکبار کی جھلتی اور جلتی ہوئی روح کو جیسے قرار آگیا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور اب اس کے تھکے ماندے وجود اور دل و دماغ پر بھی سستی اور غفلت طاری ہونے لگی تھی۔

وہ جی ہی جی میں گل کے انکار کر دینے کی دعائیں مانگتی مانگتی سو گئی۔

اگلی صبح حسب معمول طلوع ہوئی۔

سب کچھ ویسے کا ویسے تھا۔ مگر مشکبار کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا تھا۔ جی ہول رہا تھا کہ جانے اب کیا ہو؟

وہ ڈرتے ڈرتے اوپر آئی اور سبھی سبھی سی کام میں لگ گئی۔ دل کو ہر پل یہی دھڑکا رہا کہ کہیں ابامیاں دوبارہ بلا کر ڈانٹ ڈپٹ شروع نہ کر دیں کہ رات حویلی کے آنگن میں کیوں جھانک رہی تھیں! لیکن خیریت ہی گزری۔ حتیٰ کہ وہ تیار ہو کے اپنے دفتر کے لئے بھی روانہ ہو گئے۔ خلاف توقع نامہ بیگم نے بھی اسے نونا نہ رات والی کوئی

”نامہ بیگم خدا گواہ ہے کہ تمہاری خواہش مجھے بہت عزیز رہتی ہے۔ یہاں بھی میرا مقصد تمہاری مخالفت کرنا ہرگز نہیں ہے تمہیں یہ بھی اچھی طرح علم ہے کہ میں ذاتی طور سے کنبہ برادری یا اپنے پرائے کی تخصیص کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ گل کا باپ ہونے کے ناتے میرے لئے بانویا مشکبار میں کوئی فرق نہیں ہے مگر میں صرف یہ سوچ کر تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا کہ گل کا یہ رشتہ بہت سارے لوگوں کے درمیان طے پایا ہے۔ سارے گاؤں کو اس رشتے کا علم ہے اور وہ لوگ ایسے معاملوں میں بہت حساس اور اپنی روایات کے پابند ہوتے ہیں ذاتی طور پر میں ان خرافات کا قائل نہیں ہوں مگر اب تمہاری اس اچانک ضد نے میرے لئے بہت مشکل حالات پیدا کر رکھے ہیں ایک طرف تمہارا دل بھی میلا نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری طرف گاؤں والوں کو خفا کرنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ خاص طور پر اپنی ہمشیرہ فاطمہ کا دل دکھانا میرے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔ کیونکہ انہوں نے یہ رشتہ بہت شوق اور چاہت کے ساتھ طے کروایا ہے لیکن بہر حال اب تمہاری مسلسل ضد کی وجہ سے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔۔۔ نامہ بیگم۔۔۔ ذرا ادھر میرے قریب بیٹھ جاؤ اور ذرا سکون و تخیل سے میری بات سنو۔۔۔ سنو! ابھی ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ کیوں نہ یہ معاملہ ہم گل کی مرضی پر چھوڑ دیں۔۔۔ اب دیکھو نا۔ اگر میں ہاں کر بھی دوں تو کیا خبر گل یہ سن کر کیا کہے! آخر کو وہ ایک باشعور، تعلیم یافتہ اور عاقل و بالغ نوجوان ہے میرے خیال میں اس سے دریافت کرنا تو ضروری ہے ویسے آگے تمہاری مرضی.....!“



نامہ بیگم نے اچانک ہی ان کی بات کاٹ ڈالی اور اطمینان کے لہجے میں بولیں۔
”خیر۔۔۔ اس بات کی فکر آپ جانے دیجئے۔ میں بھی کوئی زبردستی نہیں کئے دے رہی

بات دہرائی۔ بلکہ جب اس نے ڈرتے ڈرتے دلشاد کے بخار کا بتایا تو اسے جھڑک دینے کے بجائے ملازم بلوا کر دلشاد کی دولا لانے کی ہدایت کی۔

مشکبار نے اس خلاف امید صورت حال پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

لیکن اس دن ایک حیرت انگیز تبدیلی ضرور دیکھنے میں آئی اور وہ یہ کہ نامہ بیگم نے دوپہر کے کھانے پہ ذرا بھی اہتمام نہ کیا۔ صرف بکرے کے گوشت پالک کے سالن اور بھنوا آلوؤں تک اکتفا کر کے بیٹھ گئیں۔ یہ دونوں چیزیں بھی انہوں نے اشکبار سے پکوائیں۔۔۔ خود ہاتھ بھی نہ لگایا۔۔۔ تقریباً ایک ہفتے تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔

ابامیاں جیسے ہی دفتر سے واپس لوٹنے، نامہ بیگم کا منہ خود بخود پھول جاتا، کبھی عائشہ کو ڈانٹ رہی ہیں کبھی مشکبار کو کسی بات پر ٹوک دیا، یاد دلشاد و شمشاد کو جھڑکنے لگیں۔ جلد ہی مشکبار کو اندازہ ہو گیا کہ اماں بی اپنے ایجاد کردہ خاص حربوں سے ابامیاں کو زچ کرنا چاہتی ہیں اور اپنی ناراضگی جتنا مقصود ہے۔

ایساں کہاں تک ہوتا!

اور ابامیاں کہاں تک برداشت کرتے۔

ایک روز جبکہ چھٹی تھی اور ابامیاں گھر پر ہی تھے، دونوں میاں بیوی میں باقاعدہ طور پر جھڑپ ہو گئی مشکبار گھبرا کر دونوں لڑکوں کو نیچے اتار لے گئی اور خود میٹرھیوں میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

کیونکہ ظاہر ہے اس جنگ کا تعلق سراسر اسی کی ذات سے تھا۔

لیکن اس پر جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ اس معاملے میں ابامیاں میں ذرا بھی دم خم نہ تھا۔ وہ محض تھوڑی دیر اماں کے تابڑ توڑ حملوں کا جواب دیتے رہے مگر پھر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بالآخر مصالحانہ انداز میں کہنے لگے۔

رہتے ہو جیسے باپ کے گھر آنا بھی معیوب ہو!“

”استغفر اللہ۔“ گل کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب سے پریکٹس شروع کی ہے مصروفیت کی وجہ سے ہفتے عشرے میں آنے لگا ہوں ورنہ پہلے تو قریب قریب ہر شام حاضر ہو جایا کرتا تھا اور چند روز سے ایک کیس نے برابر الجھائے رکھا۔“

مشکبار نے یہ ساری گفتگو سل پر مسالہ پیتے ہوئے سنی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا وہی گل جنہیں وہ بڑی سادگی اور صفائی سے ”بھائی جان“ کہا کرتی تھی، اس وقت اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس میں یہ تبدیلی ماں کی گفتگو نے پیدا کر دی تھی۔ سل دھو کر وہ جلدی سے باورچی خانے میں گھس گئی اور کان لگا کر ماں بیٹے کی باتیں سننے لگی۔

آج کل اس کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ جہاں گھر میں طویل قسم کی گفتگو شروع ہوتی اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور دل میں سو طرح کے اندیشے ریگنے لگتے۔

اس وقت بھی وہ پوری توجہ کے ساتھ باہر کی گفت و شنید سننا چاہ رہی تھی۔ مگر مشکبار کے کام کی کوئی ایک بات بھی نہ تھی۔ گل نے ایک بار اسے پکار کر پینے کے لئے پانی بھی منگوایا۔ قریب گئی تو باقاعدہ اس کی خیر خیریت بھی دریافت کی۔

خاصی دیر کے بعد جب وہ شام کی چائے تیار کر کے باہر پہنچا چکی تھی اور اب جلدی جلدی چپاتیاں توے پر ڈال رہی تھی تو اسے نامہ بیگم کی آواز سنائی دی جو بڑے مر سری انداز میں گل سے پوچھ رہی تھیں۔

”تمہاری پریکٹس تو اب خوب اچھی چلنے لگی ہوگی گل!“

”ہاں..... آں..... مگر کچھ خاص نہیں۔“ گل نے لگی لپٹی کے بغیر جواب دیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میں نے کونسا باقاعدہ طور پر اپنی ذاتی پریکٹس شروع کی

ہوں۔ بات میں بات شادی کا تذکرہ چل نکلا تھا تو میں آپ پر اپن دل کی خواہش کا اظہار کر بیٹھی تھی۔ جسے آپ نے لے کر افسانہ بنا ڈالا۔ رشتے ملنے کو کیا ہے ایک آپ کا بیٹا ہی تو نہیں ہے۔ بیسیوں درجنوں مل جائیں گے۔“

ابامیاں جلدی سے بولے۔ ”بخدا میرے دل میں قطعی کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ اب شاید تم برا مان گئی ہو۔ مگر یہ تو سوچو میں نے کونسی غلط بات کہہ دی ہے، اگر تم ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر غور کرو تو یقیناً میری بات تمہیں ناگوار نہیں گزر سکتی۔ ہاں اگر گل کی نسبت نہ ٹھہر چکی ہوتی تو میں تمہارے سامنے اس کی مرضی کی پروا بھی نہ کرتا۔“

نامہ بیگم ذرا دیر کے لئے خاموش رہ گئیں۔ شاید دل ہی دل میں اپنی کامرانی پر خوش ہو رہی تھیں۔ بالآخر ان کا حربہ کامیاب ہو گیا تھا۔

مشکبار اس سے زیادہ نہ سن پائی۔ نیچے کے کمرے میں دلشاد اور شمشاد نے اودھم مچا رکھا تھا وہاں بھاگ بھاگ کر زینے تک آرہے تھے، ”آپا۔۔۔ آپا۔“ کا شور کر رہے تھے۔

مشکبار نے مزید رکنایا کر سمجھا اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ کمرے میں آگئی۔

”آپ بویکھو۔۔۔ بھائی جان۔۔۔ بھائی ہمیں مار رہا تھا۔“ چھوٹے دلشاد نے شمشاد کی شکایت پیش کر دی۔

جواب میں شمشاد نے اس کی شرارتیں بیان کرنی شروع کر دیں مشکبار کا دماغ ویسے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں کو ایک ایک چپت لگا کر سونے کے لئے لٹا دیا اور خود بھی وہیں لیٹ رہیں۔

اتفاق سے اسی شام۔۔۔

جبکہ ابامیاں اپنے کسی دوست کے ہاں گئے ہوئے تھے، گل میاں آگئے، نامہ بیگم انہیں دیکھتے ہی خوش ہو گئیں اور بڑی لگاؤ سے پوچھنے لگیں۔

”اوہو آج کدھر بھول پڑے۔۔۔ اسی شہرت میں رہتے ہوئے مصروف تو یوں

ہے۔ اس لئے نفع نقصان کا مسئلہ بھی نہیں ہے بس ایک مشہور ایڈووکیٹ کی نگرانی میں مقدمے کر رہا ہوں کیونکہ وکالت کا قاعدہ بھی یہی ہے۔ جب انشاء اللہ خوب اچھی طرح چل نکلے گا تو اپنی پریکٹس علیحدہ سے شروع کروں گا۔“

”اوہو..... تو یہ بات ہے۔“ نامہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے زور سے کہا۔ ”ایک نکل بیٹے! جب تم الگ سے پریکٹس شروع کرو گے تو تمہیں اپنی دوکان جمانے کے لئے کافی روپے کوڑی کی بھی ضرورت ہوگی۔ تب کیا کرو گے!“

”بیجے صاحب! یہ بھی کوئی بات ہوئی!“ گل نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”آپ بہت بھولی ہیں امی جان! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اب تک میری تعلیم کے اخراجات کیسے اٹھ رہے تھے! ظاہر ہے اسی طرح مجھے مزید عملی ترقی کے لئے بھی روپیہ فراہم کیا جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ ابامیاں نے کبھی میرے تعلیمی اخراجات نہیں اٹھائے اور نہ ایک محدود سی تنخواہ میں ان کے پاس گنجائش بچتی ہے۔ آخر ان کے اپنے ذاتی اخراجات بھی تو ہیں لہذا میں ہمیشہ اپنے اخراجات بڑے بھائی صاحب سے لیتا رہا ہوں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کبھی کسی طرح کی تنگی ترشی نہیں دیکھی۔ اب بھی انہوں نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جیسے ہی تم کو یہ ایڈووکیٹ علیحدہ پریکٹس کی اجازت دے دے تم فوراً جتنی رقم درکار ہو۔۔۔ مجھ سے لے سکتے ہو۔ اب بتائیے مجھے کیوں فکر و تردد ہونے لگا! بلکہ میں تو آج کل کسی بہترین محل وقوع والی دکان کی تلاش میں ہوں۔“

نامہ بیگم نے جی، جی، جی میں مطمئن ہو کر سر بلایا اور بولیں۔ ”اے ہاں۔۔۔ میں بھی بعض دفعہ سٹھیا جاتی ہوں۔ کونسی بے فضول بات پوچھ بیٹھی۔ سچ تو ہے کہ آخر وہ زمین جائیداد کس کی ہے! تم بھائیوں کی ہی تو ہے آخر آمدنی تم لوگوں کے کام نہ آئے گی تو کہاں جائے گی!“

گل ہنس کر چپ ہو گئے اور پاس کھڑی عاشری کو گدگدانے لگے۔

اچانک نامہ بیگم کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ چونک کر پوچھنے لگیں۔ ”ارے ہاں گل! نہاری شادی کب ہے۔ میں نے تو اس چاند میں سن رکھا تھا۔“

شادی کے تذکرے پر ان کے کانوں کی لوہیں جل اٹھیں۔ دھیرے سے جواب دیا۔

”معلوم نہیں..... مجھے کچھ خبر نہیں۔“



”لے لو نوشہ میاں کو ہی نہیں معلوم۔“ انہوں نے زوردار ٹھٹھا مار کر کہا۔ ”پچھلے دنوں جب سیکنہ یہاں علاج کروانے آئی تھیں میں نے اس وقت یہ تذکرہ سنا تھا اور اس ٹکی بانو کو بھی تبھی غور سے دیکھا تھا۔“ پھر بڑی دیدہ دلیری اور صفائی سے کہنے لگیں۔

”ایک بات ہے گل! خواہ تمہیں برا معلوم ہو۔ مگر وہ لڑکی مجھے تمہاری ہم پلہ نہیں ل۔۔۔ تم میں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔“

”باورچی خانے میں بیٹھی مشکبار کادل اچھل کر خلق میں آن پھنسا۔“

ہائے اللہ! اماں ایسی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئی ہیں۔۔۔! محض اپنی مطلب برآری کے لئے۔ اللہ میری توبہ۔۔۔“ وہ جی، جی، جی میں خود غرض ماں کو ملامت کرنے لگی۔

باہر گل، نامہ بیگم کی اتنی بڑی بات پر حیرت انگیز طور پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مناف معلوم ہو رہا تھا کہ نہ صرف انہیں یہ بات بری نہیں معلوم ہوئی بلکہ وہ نامہ بیگم کے ہم خیال بھی ہیں وہ بھی اپنے نائپ کی ایک جہان دیدہ انسان تھیں۔ ایک سیکنڈ کے می ہزارویں حصے میں سمجھ گئیں کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ گل کا خود بھی گاؤں شادی کا عندیہ نہیں ہے بس یہ سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ ہو گا مارے باندھے ہو گا۔

نامہ بیگم کے لئے اسی قدر اندازہ کافی ثابت ہوا۔ حالانکہ یہ اتنی بڑی بات انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر مگر جھجکتے ہوئے کی تھی، مگر اس کو کیا کیا جاتا کہ اندھیرے میں

تیرف بیٹھ گیا تھا۔

پھر وہ کافی دیر تک گل سے اسی موضوع پر گفتگو کرتی رہیں۔ اور بڑی کامیابی کے ساتھ ان کو شیشے میں اتارتی رہیں۔ حیرت انگیز طور پر گل بھی آج تقریباً کھل ہی بیٹھے تھے اور دبے دبے لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر گئے تھے۔

نامہ بیگم کے مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ چلا چلا کر ساری دنیا کو اپنی کامیابی اور بے پایاں خوشی کی خبر سناتیں ایک کانٹا جو عباس کے انتقال کے وقت وہاں چند عورتوں کی طعن آمیز باتیں سن کر ان کے سینے میں گڑ گیا تھا آج گل کا عندیہ لینے کے بعد خود بخود جیسے کھل گیا تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں سکھ کا گہرا سانس لے کر سوچا تھا۔

’اب ہو گا میرا انتقام پورا۔۔۔ اس دین کیسا ہنس ہنس کر میرا مذاق اڑا رہی تھیں اور کیا غلیظ باتیں کر رہی تھیں۔۔۔ میں نے تو اسی روز اپنے دل میں قسم کھالی تھی کہ اگر گل میاں کو بھی تم لوگوں سے نہ چھڑا دیا تو میں اپنے باپ سے پیدا نہیں۔۔۔‘

اور جب رات کا کھانا باپ کے ساتھ کھانے کے بعد گل ہنستے مسکراتے چلے گئے اور مشکبار دل پر منوں بوجھ لئے دونوں بھائیوں کے ساتھ سونے کے لئے نیچے کی منزل پر اتر آئی تو نامہ بیگم نے ایک بے ساختہ قسم کا قبضہ لگا کر ابامیاں کو گل کی بانو کے لئے ناپسندیدگی کا قصہ خوب بڑھا چڑھا کر اور نمک مرچ لگا لگا کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے بیٹھے۔



نہ ڈھولک بجی، نہ سکھیاں سہیلیاں اکٹھی ہوئیں، نہ سہاگ گیت گائے گئے، نہ دھوم دھڑکا ہوا۔

ہاں۔۔۔ بس مشکبار اور گل کا نکاح ہو گیا۔

دونوں انتہائی سادگی اور خاموشی کے ساتھ۔۔۔ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ اور وہ سادہ لوح اور کم نصیب لڑکی جو آج سے قبل گل کو بھائی جان کہہ کر پکارا کرتی تھی، اس موقع پر رو رو ہلکان ہوئی۔ اس کے اختیار میں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا سوائے اشکوں کی برسات بہانے کے۔

روتے روتے وہ نڈھال ہو گئی۔ آنکھیں اس حد تک متورم ہو گئیں کہ کھلنا محال اور ان بند آنکھوں میں رہ رہ کر بانو کا سر اپا گھوم جاتا۔۔۔ فاطمہ پھوپھو، ریمہ اور سیکینہ بھابی کی شکلیں اور آ آ کر گڈمڈ ہونے لگیں۔ یہ سب تصور کر کے وہ اور بھی زیادہ ہلک ہلک کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس نے تو دانستہ کبھی کسی بے زبان جانور تک کا دل نہ دکھایا تھا کجا وہ آج انسانی دل توڑنے کے گناہ کی مرتکب ہو چکی تھی اور وہ بھی اپنی ہی اتنی عزیز اور پر خلوص سہیلی کا!

نکاح کے وقت اس کا دل اندر سے پکار پکار کر ”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ کہہ رہا تھا۔ مگر

ہائے رے مشرقی لڑکی کی مجبوریاں!

دوسری طرف نائمہ بیگم کی کہنی اس کا پہلو پھیلے دے رہی تھی۔ جو خبر نہیں کس مصلحت کے تحت نکاح کے وقت اس کے کمر..... کے ساتھ لگ کر بیٹھ رہی تھیں۔

اور یوں اس کا نکاح ہو گیا۔

نہ بارات تھی۔ نہ باجانباجا۔ نہ لمبے چوڑے کھانے دانے ہوئے۔

آخری مرحلے اس کے دل کا سارا دکھ درد، رنج و غم اور روح کی دکھن ایک شدید قسم کے غصے میں تبدیل ہو گئی اور اس غم و غصے کا بہاؤ گل کی طرف ہو گیا۔ جنہوں نے نائمہ بیگم کے منصوبے پر بے چون و چرا سر جھکا دیا تھا۔ ایسی انہونی ہوئی تھی کہ سرخ ساٹن کے معمولی سے جوڑے اور شیفون کے کنارے والے دوپٹے میں ملبوس ہونے کے باوجود اسے بار بار خیال آتا تھا کہ ممکن ہے یہ سب ایک طویل اور بھیانک خواب کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ آنکھ کھلے تو کچھ بھی نہ ہو!

’اے کاش! ایسا ہی ہو.....‘

اس نے دکھے دل کے ساتھ ایک ٹھنڈا سانس کھینچا۔

کچھ بھی تو اہتمام نہ ہوا تھا اس بیاہ پر۔۔۔ نہ جہیز کا معلوم تھا نہ بری بارات کا۔ دونوں طرف سے مشترکہ طور پر ابا میاں نے چار جوڑے کپڑے چڑھائے تھے۔ زیور کے نام پر ناک کی کیل اور ایک انگوٹھی تھی۔ اور اسے دلہن بنادیا گیا تھا۔

اندھیر تھا اندھیر۔

ان سے زیادہ بہترین اور اعلیٰ جوڑے و زیورات بذات خود نائمہ بیگم کو چڑھے تھے اور مدتوں ان کے ہاتھوں کی مہندی نہیں چھوٹی تھی۔ دنوں ایسے چاؤ چونچلے ہوئے تھے کہ کیانی نویلی کنواری بیاہ کر جانے والی دلہنوں کے اٹھائے جاتے ہوں گے! مگر بیٹی کی تقدیر ایسی پھوٹی تھی کہ کہیں مثال ملنی مشکل تھی۔ اول تو نائمہ بیگم نے اتنی ذرا سی عمر

میں بیاہ ڈالی تھی اور دوسرے اپنی ہی پوری سسرال کی مخالفت مول لے کر ایک طرح سے زبردستی بیٹی دے دی تھی۔ گاؤں میں جیسا تہنکہ نہ چلتا، کم تھا۔

مشکبار سے جتنے بھی آنسو بہائے گئے۔ اس نے بہا ڈالے، جی بھر کے اپنی کم مائیگی اور بد قسمتی کا ماتم کیا۔ لیکن نائمہ بیگم کا کنٹرول نہ پیچھا۔ نکاح کی رسم ادا ہوتے ہی انہوں نے رسمی ہی انداز میں اسے ایک بار گلے لگا کر زبردستی ایک دو آنسو بہانے کی کوشش کرتے ہوئے چند آہیں بھریں اور خراں خراں چلتی ہوئی آکر باہر اپنی ان چند سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئیں جنہیں اس نکاح کی تقریب میں انہوں نے شامل کرنا ضروری سمجھا تھا۔

یہ عورتیں یہیں آس پاس کے رہنے والی تھیں۔ جن میں کئی ایک ابا میاں کے محلے والوں کی بیویاں تھیں اور..... کئی عملے والوں کی بیویاں تھیں جو نائمہ بیگم کی خوشنودی اور جی حضور کی ضروری خیال کرتی ہوئی اکثر وقتاً حاضری دیتی رہا کرتی تھیں۔

ان چند احباب کے لئے رات کا کھانا، جسے دعوتِ ولیمہ بھی سمجھا گیا اور لڑکی والوں کی طرف سے رخصتی کا کھانا بھی، بریانی، قورمہ اور تندوری روٹی پر مشتمل تھا۔

ایک مہمان بی بی کو سارے دن کی تاریک کوئے میں دہکی سہی مشکبار پر بھی ترس آگیا۔ ایک ٹرے میں کھانا سجا کر وہ اس کے سامنے رکھ گئیں۔

مشکبار کا جی جل کر خاک ہو گیا۔ مگر وہ ان بی بی کی رحم دلی کو قہر آلود نگاہوں سے گھور کر رہ گئی۔ حالانکہ ان بے چاری کا قصور تھا۔۔۔!

آج بنگامی حالات کی وجہ سے اس نے صبح سے دلشاد اور شمشاد کی خبر نہ لی تھی۔ اس وقت دونوں کو بلا کر اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔ چھوٹا دلشاد اس کے لال لال کپڑے دیکھ دیکھ کر خوش ہو تارہا۔

کھانے دانے اور خوش گپیوں میں خاصا وقت گزر گیا۔ نائمہ بیگم سارے وقت

پلنگ پر سرخ گٹھری کی صورت بیٹھی مشکبار کو دیکھ کر یہ احساس تو جاگتا تھا کہ یہ ایک دلہن کا کمرہ ہے مگر جملہ عروسی تو کسی طرف سے نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہی روزمرہ کا سامان اور بکھری سمٹی چیزوں کے ڈھیر۔ فالتو چیزیں ویسے بھی اسی کمرے کا مسکن رہتی تھیں کیونکہ چلی منزل پر یہ واحد ایک ہی کمرہ تھا۔ ہال نما بڑا سا طویل و عریض کمرہ، جس میں بچوں کے علاوہ نانہ بیگم راشن، اجناس اور دیگر فالتو اشیا رکھواتی تھیں۔ پورے کمرے میں نہ کہیں سجاوٹ کا اہتمام تھا۔ نہ ہار پھول گجروں، سہروں یا زرتار لڑیوں کا۔ کمرہ مہک رہا تھا نہ خوابناک ماحول کی فوسوں کا ہی تھی۔ نیلے کی کلیاں تھیں نہ کاغذی پھول۔ ہاں۔ یہ ضرور تھا کہ مشکبار ذرا دیر بعد پسینے میں نہا نہا جا رہی تھی۔

کافی رات گئے گل میاں کچھ تھکے، کچھ شرماتے کمرے میں داخل ہوئے۔ مشکبار کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ جی چاہا کمرے میں پڑی ہر چیز اٹھاٹھا کر ان کے منہ پر دے مارے۔

لیکن سوچ لینا آسان تھا۔۔۔ عمل انتہائی مشکل۔

گل دھیرے دھیرے چلتے ہوئے دوسری چارپائی پر، جس پہ دلشاد اور شمشاد سوتے تھے، آہستگی سے بیٹھ گئے، چارپائی ذرا اسی دیر کو چرمرائی، اور پھر ہر آواز سکون و سکوت کی آغوش میں سو گئی۔

اب پھر ماحول پہلے کی طرح خاموش ہو چکا تھا۔

دونوں اپنے اپنے مقام پر جانے کیا کیا سوچ رہے تھے۔۔۔!

گو کہ مشکبار دلہن بنی بیٹھی تھی مگر اس کے انداز تو دلہنوں والے ہرگز نہ تھے۔ نہ شرمارہی تھی نہ لجا رہی تھی۔ ایک گھبراہٹ سی ضرور طاری تھی وہ بار بار اسی دوپٹے سے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کا گھونگھٹ خود بخود اوپر اٹھ گیا تھا۔ اور یہی بات گل کے لئے الجھن کا باعث تھی۔

سب سے ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔ آج گاؤں والوں کو نچا دکھلا کر ان کا رواں رواں باغ باغ ہو گیا۔ ابامیاں قدرے خاموش خاموش سے تھے۔

تمام دن میں کئی مرتبہ انہیں اپنے عزیز رشتہ داروں کا خیال آیا تھا جن کو سرے سے اس اندوہناک خبر کی اطلاع ہی نہ تھی۔ مگر ابامیاں خوب آگاہ تھے کہ تاکے۔۔! ایک نہ ایک روز تو ظاہر ہے کہ ان کو پتہ ہی چلتا، پھر کیا ہو گا! یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان کئی مرتبہ ان کی نگاہوں کے سامنے لہرایا ضرور، مگر انہیں ایسی کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ اپنی بیوی کے لئے ان کا دل بہت وسیع اور کشادہ تھا وہ دانستہ ان کا کہنا کس طرح نہ مان سکتے تھے۔

رات کے کوئی دس ساڑھے دس بجے کے قریب دو مہمان بی بیان ہنستی مسکراتی انھیں اور مشکبار کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسری سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی، اسے چلی منزل پر اسی کے مخصوص کمرے میں پلنگ پر بٹھا گئیں۔ جس پر آج نئی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کا گھونگھٹ درست کر کے دونوں دوبارہ اوپر چلی گئیں۔

تھوڑی دیر میں یہ چند مہمان بھی رخصت ہو گئے اور پوری عمارت پر ایک گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔



آج کی رات۔

نانہ بیگم نے دلشاد اور شمشاد کو اوپر ہی روک لیا تھا۔ مصلحتاً نیچے کی منزل خالی رکھی تھیں اور وہ کمرہ جس میں یہ تینوں بہن بھائی سوتے تھے۔ آج فقط مشکبار کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ گویا یہی کمرہ اس کے میکے کی پناہ گاہ رہا تھا۔ یہی آج سسرال بنا دیا گیا تھا۔ اور یہی کمرہ آج جملہ عروسی کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

نی نوپلی دلہن کے تیور انہیں خاصے جارحانہ لگ رہے تھے۔
یہ ان کی توقع اور امیدوں کے قطعی خلاف تھا۔ مشکبار جیسی کم گو اور سہمی سہمی سی
رہنے والی لڑکی نے اس وقت حیرت، تعجب اور الجھن میں مبتلا کر ڈالا تھا ان کو۔۔۔ وہ تو
دل میں جانے کیسے کیسے ارمان اور امنگیں لے کر اندر آئے تھے۔۔۔

اس وقت کالی گرم شیر دانی اور علی گڑھی سفید پاجامے میں ان کی جامہ زیب اور
مکمل شخصیت خوب نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سچ مچ کے نوشہ میاں لگ
رہے تھے خوبصورت آنکھوں میں ہزاروں ان کہی کہانیوں کے سائے گڈمڈ ہو رہے
تھے۔ چہرے پر حد درجہ جاذبیت، نکھار، سنجیدگی اور بردباری تھی۔

لیکن مشکبار کے خلاف امید کڑے اور انوکھے تیور دیکھ کر ان کی اپنی فطری جھینپ
اور جھک حیرت اور تشویش میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک مشکبار کی قوت برداشت جواب دی گئی۔ اتنے دنوں کی سوچ اور کڑھن
الفاظ میں ڈھل کر ایک مضحکہ خیز جملہ بن گئی اور وہ بغیر سوچے سمجھے وقت اور حالات کا
لحاظ کئے بغیر بولتی چلی گئی۔

”بھائی جان..... گل بھائی جان..... یہ آپ نے کیا کر ڈالا؟ اماں کی بات کیوں مان
کر دی آپ نے۔ اللہ! کتنے کڑ ہیں آپ ﷺ آپ کو..... بانو کا بھی خیال نہیں آیا!!!“
گل جو چپ چاپ بیٹھے کچھ سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھے، اس کے خلاف
توقع بات سن کر اچھل پڑے۔

خاص طور پر اس اہم ترین رات میں اس کے منہ سے نکلے لفظ ”بھائی جان“ نے تو
قیادت ڈھادی۔

نتیجے میں وہ ہونٹوں کی طرح منہ پھاڑے اس کی صورت ٹکنے لگے۔

مشکبار ان کی معصومیت کے اس اظہار پر مزید جل بھن کر کباب ہو گئی۔ جھلاہٹ

میں وہ پلنگ کے سرہانے کھسک کر پٹی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور چمک کر بولی ”آپ
میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔ کیا اماں کی طرح آپ نے بھی مجھے پاگل اور
سڑی سمجھ لیا ہے؟ اب میں ایسی بے وقوف بھی نہیں۔“
گل ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔۔۔

وہ بڑی حد تک اس کے رویے اور غم و غصے کا سبب جان چکے تھے۔ حالانکہ آج سے
قبل وہ کبھی ان کے سامنے ایسی بد لحاظ نہیں ہوئی تھی۔
مشکبار کی بے صبری دیدنی تھی۔

اس دفعہ لہجہ اور تیور قدرے ہی کڑوے کڑوے اور ضدی تھے۔

”سنئے بھائی جان! میں آپ کو صاف صاف بتائے دے رہی ہوں کہ میں آپ کی
..... میں آپ کی بیوی بن کر..... ہر گز نہیں رہ سکتی..... یہ سراسر اماں کی زیادتی ہے اور
انہوں نے آپ کو بھی بہکایا ہے۔ مگر میں یہ سب خرافات بالکل برداشت نہیں
کر سکتی۔ آپ کو ہر صورت سے بانو سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ وہ اماں کی ضد تھی تو
یہ..... میری ضد ہے۔ اگر..... آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں آپ کو ”بھائی
جان“ بھی کہنا چھوڑ دوں گی اور..... گردن میں پھندہ باندھ کر..... مر جاؤں گی۔“

اس نے گویا اپنی دانست میں بہت زبردست قسم کی دھمکی دے ڈالی۔
گل کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

ہنستے ہنستے ان کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ آنکھوں میں ڈھیروں پانی بھر آیا۔
گویا یہ ان کی سہاگ رات تھی! جس کے بارے میں دنیا جہان میں سینکڑوں
داستانیں اور پچاسوں رومینک قصے دہرائے جاتے ہیں اور ان کی نکاحی بیوی بے خیالی
میں انہیں ”بھائی جان“ بھائی جان، کہہ کر پکارے جا رہی تھی۔
لیکن اب ان کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا تھا۔ لہذا انہوں نے بمشکل اپنی

ہی ضبط کی اور مسکراتے ہوئے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ بولے۔ ”بھئی مجھے تو بڑی خوشی ہوگی اگر تم مجھے ”بھائی جان“ کہنا چھوڑ دو گی۔ اور یوں بھی یہ الفاظ کہتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ سمجھیں!!“

”کیوں..... شرم کیوں آنی چاہئے؟ میں نے کوئی پہلی دفعہ کہا ہے۔“ وہ لڑنے والے انداز میں اور بھی زیادہ شور مچا کر بولی۔ ”شروع شروع میں اماں نے ہم تینوں بہن بھائی کو سکھایا تھا کہ تم لوگ چھوٹے ہو۔ اس لئے ان کو خالی گل، نہیں، بلکہ ”گل بھائی جان“ کہہ کر بلایا کرو۔ بڑوں کو نام سے پکارنا بد تمیزی کی علامت ہوتی ہے اور اب آپ.....“ اچانک اس کی بے تحاشا چلتی زبان میں بریک لگ گئے اور وہ دوپٹے کا آنچل دانتوں میں داب کر کچھ سوچنے لگی چہرے کے تاثرات میں سنجیدگی سی رچ گئی تھی۔

گل فوراً ہی بوجھ گئے تھے کہ وہ کس سوچ میں پڑ گئی ہے۔ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ”تمہارا کہنا بالکل درست ہے مشکبار! مگر..... اس وقت شاید تم یہ بھول رہی ہو کہ..... اللہ کے حکم سے آج سے ہمارے رشتے تبدیل ہو چکے ہیں اس میں میرا تمہارا کوئی قصور نہیں جو قدرت نے بہتر سمجھا دیا ہے۔“

”اونہ۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”یہ سب کا سب اماں کا کیا دھرا ہے انہوں نے جو سوچا تھا وہ کر دکھایا اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں سب سے زیادہ آپ کا ہاتھ ہے۔ اگر آپ چاہتے تو ایسا ظلم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ پہلے پہل بے چارے ابامیاں بھی بانو کے خیال سے انکار کر رہے تھے۔ مگر اماں نے ان کی ایک نہ چلنے دی معلوم نہیں انہیں بانو بے چاری سے کیا دشمنی تھی۔“

”ارے جانے دو اب اس ذکر کو!“ گل ایک ہی طرح کی باتیں سنتے سنتے ایک دم بیزار ہو گئے۔

”کیسے اور کیوں کر جانے دوں اس ذکر کو!“

جانے کیوں مشکبار کی آنکھیں خود بخود بھر آئیں۔ اور وہ تھوڑی دیر پہلے کی ساری چوکڑی اور غصہ بھلا کر رنجیدہ اور درد بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ ”آپ خود ہی سوچئے، کتنی خراب اور معیوب بات ہے یہ! جو کوئی بھی سنے گا تو بہ تو بہ کرے گا۔ کیا یہ باعث شرم بات نہیں ہے! میں تو کس شوق اور سچے دل سے آپ کو ”بھائی جان“ کہتی رہی کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مجھ پر جان بوجھ کر ایسا بے جاستم توڑا جائے گا! اور پھر..... وہ بانو بے چاری..... اسے تو میں منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہی۔“ اس کی آواز خود بخود گھٹ گئی اور باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

گل کو اس کی بھولی باتوں پر ہنسی بھی آئی اور رونے پر افسوس بھی ہوا۔ مگر وہ اپنے لہجے کو مزاحیہ بنا کر کہنے لگے۔ ”اب بھئی مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ تم مجھے سچا دل سے بھائی جان کہتی ہو یا جھوٹے دل سے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں کچھ نہ کچھ فتور ضرور تھا۔!“

”کیا کہا؟ فتور! اور وہ بھی میری نیت میں!“ وہ اچھل کر بولی ”آپ کو ذرا سا بھی لحاظ نہیں آ رہا۔ ایسی بے سرو پا بات کہتے ہوئے! آپ بھلا کیا جانیں میری نیت! بد نیت تو اصل میں خود تھے اسی لئے تو فوراً ہاں میں ہاں ملانے بیٹھ گئے تھے۔ پل بھر میں اپنے گاؤں والوں کی ساری رشتہ داریاں بھول گئے۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ بانو بے چاری سے بچنے کی منگنی تھی اور اس کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوں گے۔ اس نے آپ کے سوا بھی کسی دوسرے کے لئے سوچا تک نہ تھا۔ اسے تو جب یہ خبر ملے تو وہ مارے غم کے مر جائے گی.....“



گل نے اس کی بات کاٹ دی اور نہایت متانت سے بولے۔

”تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ وہ ہماری رشتے دار ہے اور ہم بہتر طور پر جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے رشتوں کی ہرگز کمی نہیں ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ جب اماں نے بذات خود مجھ سے بات کی، اپنی مرضی ظاہر کی اور بہت ساری باتیں کیں تو بھلا میں کیوں عذر کرتا! آج چونکہ موقع محل بھی ہے اور تم خود یہ باتیں کرید رہی ہو تو میں سچ سچ بتائے دیتا ہوں کہ حقیقت میں میری مرضی گاؤں میں شادی کرنے کی کبھی رہی نہ تھی۔ تم سے ملاقات تو بعد میں ہے۔ میں اکثر جب کبھی تنہائی میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا تھا تو میرا گھٹن اور بیزاری سے برا حال ہو جاتا۔ دراصل گاؤں اور وہاں کا رہن سہن میں کبھی بھی پسند نہیں کر سکا۔ یہ فقط میرے بزرگوں کا فیصلہ تھا اور خوشی کہ میں وہاں شادی کروں اور چونکہ اس وقت تک میرے سامنے کوئی واضح اور صاف راستہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی اور یہ سوچ کر صبر و تحمل سے کام لیتا رہا کہ میری قسمت میں یہی کچھ ہو گا۔ اور آخر کہیں تو شادی ہو نا ہی ہی تھی چنانچہ اگر اپنی کوئی واضح پسند نہیں ہے تو چلو والدین اور بزرگوں کی خوشی سہی۔“

آج میں تم سے قطعی طور پر سچ سچ بیان کر رہا ہوں مشکبار کہ مجھے اس رات کے تقدس کی قسم! تمہیں دیکھ کر بھی بلکہ آج سے ایک ڈیڑھ ہفتہ قبل تک میں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ میری شادی اگر ہو تو تمہارے ساتھ ہو۔ تمہیں دیکھ کر میری نیت کبھی ڈانوا ڈول نہیں ہوئی۔ ہاں! ایک بات ضرور ہے کہ اماں کا تمہارے ساتھ سخت رویہ دیکھ کر میں ضرور کڑھا کرتا اور قدرتی طور سے۔۔۔ تمہارے ساتھ دلی ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ مجھے تم پر بے طرح ترس اور رحم آیا کرتا تھا۔ بسا اوقات میرا جی چاہتا کہ تمہارے مظلوم وجود کو دنیا کی بے رحمی اور کٹر دلی سے چھپا کر کہیں دور لے جاؤں اور ہر ممکن طریقے سے تمہاری حفاظت اور غمگساری کروں تمہیں پھولوں اور کلیوں

کی طرح اچھوتا رکھوں۔ اور یہ صرف میرا جذبہ انسانیت اور ہمدردی ہوتا تھا۔ اس میں خراب نیتی کو قطعی دخل نہ ہوتا۔

لیکن..... جب اماں نے مجھ سے تمہارے بارے میں صاف صاف میرا عندیہ معلوم کیا اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا تو..... خدا کی قسم! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تم میرے لئے ایک عظیم ترین انعام ہو..... تحفہ ہو..... میری کسی خاص نیکی کا صلہ ہو۔ مجھے یوں لگا مشکبار! گویا میں ازل سے تمہاری ہی تلاش میں تھا اور تمہاری چاہت میری نس نس میں خوشبو بن کر دوڑنے ریگنے لگی۔ چنانچہ میں نے کفرانِ نعمت کی چنداں ضرورت نہ جانی اور صدق دل سے اماں کو ہاں کہہ دی۔

جہاں تک تعلق ہے بانو کا۔۔۔ تو شادی کے بعد نباہ تو یقیناً اس کے ساتھ بھی کرتا مگر۔۔۔ اس دلی پسند اور دلی خوشی کے ساتھ نہیں، جو مجھے تمہارا ساتھ پا کر ہو رہی ہے۔ یہ ایک روحانی مسرت اور..... بے پایاں خزانہ ہے مشکبار! جس کا کوئی مول نہیں کوئی تول نہیں۔ یہ تو دلوں اور روحوں کے بنوگ ہیں میں سمجھتا ہوں قدرت نے تمہاری صورت میں مجھے ایک نعمت عظمیٰ بخش دی ہے حالانکہ میں ایک بے مایہ شخص اس عظیم انعام کا مستحق بھی نہ تھا۔

میں تمہارا دکھ درد سمجھ رہا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ میں بانو کا دشمن ہوں۔ یا اسے غلط سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔ نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں نے یہ سوچا کہ تم ایک یتیم بچی ہو، تمہارا سہارا دنیا میں شوہر کے سوا کون ہو گا۔ جبکہ بانو کا سنگے خون اور رشتہ داروں سے کنبے کا کنبہ پڑا ہے۔ اس کے لئے ایک سے ایک بہترین رشتہ مل جائے گا۔ جبکہ تمہارا مسئلہ یہ تھا کہ جب اماں اس کمسنی میں تمہاری جان کی لاگو ہو ہی چکی تھیں تو میرے بجائے بھی جانے کس سے تمہارا مستقبل وابستہ کر سکتی تھیں۔

میرے لئے ایک طرف اماں کی رضامندی ایک خوش آئند مستقبل کی نشاندہی

کر رہی تھی تو دوسری جانب انہوں نے مجھے یہ دل خوش کن اطلاع بھی فراہم کر ڈالی تھی کہ ابامیاں بھی دلی طور پر اس نئے نائے کو پسند کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ اگر گل بذات خود بھی اس شادی کے حق میں ہے تو میں مخالفت ہرگز نہیں کروں گا۔ بلکہ مجھے دلی مسرت ہوگی۔

اب تم باسانی اندازہ لگا سکتی ہو مشکبار کہ جوش مسرت اور اپنی خوش بختی پر مجھے کس قدر بے اندازہ خوشی ہوئی ہوگی!

لہذا میں نے بھی اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے خدا کے بعد اپنے سارے معاملات اماں اور ابامیاں کے سپرد کر ڈالے۔۔۔ اور یوں بلا کھٹکے ہمارے نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ ظاہر ہے جب ابامیاں کو اپنے کنبے برادری اور بچپن کے رشتے کے ٹوٹنے کا خیال رہا اور نہ قلق ہوا تو مجھے کیوں ہوتا چھو تو میرے لئے گویا بس یوں سمجھ لو کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔۔۔۔۔

اتناسب کچھ کہہ کر گل خاموش ہو گئے۔



یہ سب باتیں انہوں نے بہت سنجیدگی، متانت اور ایک جذب کے عالم میں کہی تھیں۔ مشکبار جو پٹی سے پیر لٹکائے بیٹھی نہایت غور اور خاموشی کے ساتھ ان کی یہ طویل و عریض گفتگو سن رہی تھی، ان لمحات میں بہت تعجب اور حیرت کے شدید عالم میں چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

گل کی چچی، سیدھی اور کھری باتیں سن کر اس کے سیدھے سادے دل میں ان کے لئے خود بخود ایک نرم اور گداز گوشہ وا ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر اتناسب کچھ کہہ ڈالنے کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے گل ابھی کچھ مزید کہنے

کے لئے بے چین ہیں ان کی بے تابی اور بے قراری دیدنی تھی۔

مشکبار ان کی کیفیت سے بے خبر اپنے خیالات میں غلطاں تھی، ذہن زقندیں بھرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچا جا رہا تھا۔ کبھی وہ اماں کے متعلق سوچتی، کبھی اپنا دلفریب اور معصوم و بھولا بھالا بچپن یاد کر کے۔۔۔۔۔ دل مسونے لگتی۔ آج کو اگر اس کے بازندہ ہوتے تو کاہے کو ایسے ایسے واقعات اور حالات پیش آتے۔ معلوم نہیں وہ اپنے ان تینوں بچوں کی بہبودی اور بہتر مستقبل کے لئے کیا کچھ کرتے۔۔۔۔۔ تب مشکبار یوں اس کمسنی میں ماں کے ہاتھ کٹھ پتلی تو نہ بنتی۔۔۔۔۔ اور آج جو یہ شادی ہوئی تھی تو عین ممکن تھا کہ اپنے چچا کے ہاں بیاہ کر جاتی اپنوں کو چھاؤں میں بیٹھی ہوتی۔ کوئی فقر کوئی فاقہ اس کے قریب نہ بھٹک رہا ہوتا۔۔۔۔۔

بچپن کے مرغزاروں سے نکل کر اس کا خیال بانو کی طرف چلا جاتا۔ اور وہ بھی اور بھی زیادہ رنجیدہ ہو جاتی۔ اس نے بذات خود تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ بانو بے چاری کے حق پر ڈاکہ ڈالے گی۔ بچ پوچھو تو اب تک کی زندگی میں ایک بانو ہی تو اس کی سہیلی بنی تھی لیکن حالات ایسے پیدا کر دیئے تھے کہ مشکبار ہی اس کی چور بن بیٹھی تھی۔۔۔ اور۔۔۔ اب اس وقت۔۔۔ گل نے اپنے دلی احساسات کچھ دوسرے ہی رنگ میں سنائے تھے۔ ورنہ وہ تو آج سے قبل تک یہی سمجھتی رہی کہ گل کو بانو کے ساتھ بہت الفت اور انسیت ہوگی۔۔۔۔۔

وہ اپنے خیالات کی رو میں خود ہی الجھ رہی تھی، سلجھ رہی تھی کہ اچانک۔۔۔ چونک کر اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔

گل اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھے تھے۔ اور پلک جھپکتے میں اس کا چھونا سازم و نازک ہاتھ ان کے گرم گرم ہاتھ میں دبایا تھا۔

”مشکبار۔۔۔۔۔ مشکبار!“ انہوں نے دوبار دھیرے دھیرے اس کا نام لیا۔

لمحہ بھر خاموش رہے۔۔۔ پھر بلا تمہید کہنے لگے،

”جو کچھ میرے دل میں تھا، وہ میں نے بلا کم و کاست اور بغیر کسی بناوٹ و ملاوٹ کے تمہیں سنا ڈالا۔ اب تم اس پر کس حد تک یقین کرتی ہو۔۔۔! یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن۔۔۔ ابھی ذرا دیر پہلے کی تمہاری گفتگو مجھے الجھن میں ڈال گئی ہے۔ دیکھو مشکبار۔۔۔ شادی ایک دو دن ساتھ گزارنے یا ہنسی مذاق کا قصہ نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور باوقار مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اماں نے مجھ سے اس مسئلہ پر بات کی تھی تو اتفاق ہی سمجھو کہ میں ایک لمحے کے واسطے بھی یہ نہ سوچ سکا کہ اس سلسلے میں خود تمہاری کیا رائے ہوگی؟



یہی سبب ہے کہ اس دن سے آج تک میں اس معاملے میں مطمئن رہا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ تمہاری رائے وغیرہ کا مجھے خیال کیوں نہ آیا؟ اب سوچتا ہوں تو یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اول ہمارا ماحول اور تہذیب شاید ابھی تک اتنی آزاد اور کھلے ذہن کی نہیں ہے کہ لڑکی سے ضروری ہوتے ہوئے رضامندی لی جائے۔ ہمارا معاشرہ ابھی ایسا ایڈوانس کہاں ہے! لڑکی تو لڑکی اپنے یہاں تو لڑکے کو بھی ماں باپ کے سامنے اس معاملے میں بولنے اور چون و چرا کی اجازت نہیں ہوتی۔ دوسرا سبب ممکن ہے یہ رہا ہو کہ اماں کے منہ سے تمہارے حصول کا سن کر میں ایسا مگن اور خوش ہوا کہ باقی تمام مسئلے فراموش کر بیٹھا۔

لیکن آج۔۔۔ اس وقت تمہارے موجودہ رویے کی وجہ سے مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے۔۔۔ جیسے تم اس سبب پر خفا ہو۔۔۔ ناراض ہو۔۔۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو صاف یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ تم اپنی مرضی کے خلاف اس بندھن میں باندھ ہی گئی ہو۔

کیا یہ درست ہے مشکبار؟

تمہیں تمہاری سب سے عزیز ترین شے کی قسم۔۔۔ سچ سچ بتا دو۔۔۔ اپنے دل میں کوئی بات پوشیدہ مت رکھو۔

تمہیں کسی کا ذکر خوف، جھجک اور اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔۔۔

جیسا میں ان لمحات میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں، مجھے قسم ہے۔۔۔ میں بعد میں بھی تمہارا ایسا ہی غمگسار ہوں گا۔

میرے دل سے تمہاری قدر کم ہوگی نہ غیریت و اجنبیت کو جگہ ملے گی۔ پھر تم جیسا چاہو گی، جو کہو گی، میں تمہاری خاطر ضرور بالضرور کروں گا

بس میرے دل سے اپنی پسند ناپسند کا بوجھ اتار ڈالو۔۔۔ ورنہ میں اپنے ضمیر کی مار سے ہی مر جاؤں گا مشکبار۔۔۔ میں نے بانو کو نظر انداز کر کے تمہیں اپنایا ہے اور ایک بے حد قیمتی اور انمول انعام سمجھ کر اپنایا ہے، اب اپنی خاموشی سے مجھے بے موت مت مارو خدا جانتا ہے کہ تم بہر صورت اور بہر طور میری روح اور میرے دل سے نزدیک ترین رہو گی۔ خواہ ذاتی طور سے مجھے اچھا سمجھو یا نہ سمجھو۔۔۔۔۔

بولو۔۔۔!

جواب دونا مشکبار۔۔۔!!

گل کے لہجے میں التجا ہی التجا بھری تھی۔

ان کی آنکھوں میں ہزاروں سوال مچل رہے تھے۔

جن کی مرکز نگاہ صرف اور صرف مشکبار تھی۔۔۔ اور مشکبار۔۔۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی غش کھا کر گر پڑے گی۔ اس وقت حالات نے یکایک ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ دنگ رہ گئی تھی۔

ہوش و خرد جیسے دامن چھڑوا کر دور ہی دور بھاگے چلے جا رہے تھے۔ سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور گل کو ان کی باتوں کا کیا جواب دے؟

اور۔۔۔ اب تو وہ ایک دم ہی سے اس کی طرف سے بدگمان ہوئے جا رہے تھے۔ غلط فہمی کا شکار ہو رہے تھے۔۔۔

اب وہ کیا کرے؟

ان کو کیا جواب دے؟ کس طرح اور کیونکر مطمئن کرے!!

فکر، پریشانی، حیرت اور شرم و حیا سے مشکبار کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے کان میں سائیں سائیں بجنے لگی اور وہ ان کی ملائم سی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر بے اختیار چہرہ چھپا کر بیٹھ رہی۔

اس کا سارا وجود دھیرے دھیرے لرزنے لگا۔

یوں جیسے اپنے آشیانے سے اچانک ہچکھڑ جانے والی معصوم فاختہ ہو۔ جسے راستہ

بھائی نہ دے رہا ہو۔ خوفزدہ، لرزاں، اکیلی اور تنہائی کی مار کھائی ہوئی فاختہ۔۔۔

گل کو اس کی حالت پر بے حد ترس آ رہا تھا۔

وہ اس کی کیفیت کو خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ مگر اپنے دل کے ہاتھوں بھی بہت مجبور تھے۔ وہ ہر صورت میں اس کی زبان اس کا عندیہ سننا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ کسی کی لاچاری، بے بسی اور بے زبانی سے فائدہ اٹھانا انہیں سراسر اپنی مردانگی پر چوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سب ان کی نیک نیتی اور فطری شرافت کے خلاف ہوتا۔

”مشکبار!“..... انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسے بے حد ملائمت اور شہد آفریں لہجے میں مخاطب کیا۔ ”اگر تمہیں میری باتیں ناگوار گزری ہیں تو بخدا میں معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ تمہارا دل دکھانا ہرگز میرا مقصد نہیں ہے میں تمہیں خوش و خرم اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں بس۔۔۔ فقط اتنا ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ تم اس شادی پر خوش بھی ہو یا نہیں۔۔۔ بانو کا خیال دل سے نکال کر صاف ہاں یا نا میں جواب دے دو۔ بس پھر میں کچھ

نہ پوچھوں گا۔۔۔ مشکبار۔۔۔! مشکبار۔۔۔۔۔“

گل سے ضبط نہ ہو کا تو انہوں نے اپنا ایک ہاتھ دھیرے سے اس کے شانے پر رکھ دیا کیونکہ اب وہ بہت ہی واضح طور پر کانپنے لگی تھی۔

گل اس کی اس مسلسل کیفیت سے گھبرا گئے۔

ادھر ادھر دیکھا۔ کونے میں ایک اسٹول پر صراحی اور گلاس نظر آ گئے۔ انہوں نے دوڑ کر گلاس پانی سے بھرا اور۔۔۔

بشکل تمام اس کا منہ کھلوا کر پانی اس کے پگھڑی کی طرح لرزتے لبوں سے لگا دیا۔۔۔ شاید مشکبار کے جی کو کچھ تراوٹ محسوس ہوئی کیونکہ چند منٹ کے بعد اس کی گھبراہٹ اور خوف میں کمی ہو گئی۔ اور وہ گل کے بار بار کہنے اور اصرار کرنے پر پلنگ کے اوپر پاؤں کر کے تھکے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ان لمحات میں اس کے تیور خود بخود نرم پڑ گئے۔ جارحانہ انداز جانے کہاں جا سو یا تھا اور وہ بہت زیادہ شرمائی شرمائی اور لجائی سی لگ رہی تھی۔ گل کو بار بار اس پر جمیلی کی ڈالی کا گمان ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خوش رنگ پھولوں کی ٹہنی جھکی جھکی جا رہی ہو۔۔۔



گل کے سامنے جانے کیا سوچ کر اس کی پلکیں ہی نہیں اٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں مندی جا رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

گل کو اب اپنا سوال دہرانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر حقیقت یہی تھی کہ ان کے دل میں کھد بد برابر ہوئے جا رہی تھی اور وہ اس کی زبان سے کچھ سننا چاہ رہے تھے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غلطاں تھے۔

رات شاید اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ باہر آسمانوں سے شبنم گرنے لگی تھی۔ فضا نمناک اور بوجھل ہو رہی تھی۔

سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی بھاری بھر کم گاڑی زوردار دھکم پید کرتی ہوئی تیزی سے گزر جاتی۔ ذرا سی دیر میں پھر پہلے کی طرح سکوت طاری ہو جاتا۔

خاصی دیر تک دونوں دو لہاد لہن ہو نفوں کی طرح خاموش رہے۔

پریشان ہو کر گل نے ہی پلہ پہل کر دی۔۔۔

”مشکبار۔۔۔ برانہ محسوس کرنا۔ میں ایک دفعہ پھر اپنا سوال دہراؤں گا کہ۔۔۔ بانو کو نظر انداز کر کے تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔؟ میرا مطلب ہے اگر بانو درمیان نہ ہوتی یا یوں کہہ لو، میری متنگی نہ ہوئی ہوتی تو تم بخوشی مجھ سے شادی کر لیتیں؟“

مشکبار نے کسمسا کر بیٹھے ہی بیٹھے پہلو بدلا، اپنے تمام تر حوصلوں اور ہمتوں کو یکجا کر کے بالآخر مہین سی آواز میں بولی۔ ”مجھے دراصل بانو کے خیال سے ہی چین نہیں آرہا ہے۔۔۔۔۔ اسی کی فکر مجھے ڈسے جارہی ہے کہ۔۔۔۔۔ جب اسے یہ خبر ملے گی تو اس کا۔۔۔۔۔ اس کا کیا حال ہوگا۔۔۔۔۔ اور اس کے خیالات میری طرف سے کتنے خراب ہو جائیں گے۔“

گل کا چہرہ اس کی زبان سے اتنا ہی سن کر متمتا اٹھا تھا۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی قندیلیں سی روشن ہو گئیں چہرے پر بہاریں رقص کرنے لگیں۔

ان کی آواز جوشِ مسرت سے کانپ گئی مگر وکیوں والی جرح جاری رکھی۔

”بس۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟“

”بھائی جان۔۔۔۔۔ میں بانو کو۔۔۔۔۔“

مشکبار کی حیا میں ڈوبی ہوئی بوجھل آواز ابھری۔ اس نے ایک دفعہ بانو کی یاد دہانی کرانی چاہی مگر اس دفعہ گل کی پیار بھری ڈانٹ اس کی کمزور سی آواز پر حاوی ہو گئی۔

”تم نے پھر بھائی جان کہا۔۔۔! خبردار!“

رفتہ رفتہ مشکبار کی پریشان زندگی کو بھی کچھ سکون، کچھ ٹھہراؤ نصیب ہو گیا۔ پہلے ہر وقت کے سبے سبے رہنے والے احساسات میں کمی آگئی۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ دلی خوشی، آسودگی اور مسرت کسے کہتے ہیں۔

گو کہ نامہ بیگم کے رویے میں تو اسے بیاہ کر بھی کوئی چلک اور تبدیلی پیدا نہ ہوئی تھی وہی روزمرہ کے احکامات تھے، گھریلو کام کاج اور معمولات تھے۔ کوئی کام غلط معلوم ہوتا یا بگڑا ٹھتیس تو وہی پہلے کی طرح ہنگامہ آرائی اور ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتیں۔ خواہ گل میاں بھی سن رہے ہوتے۔ داماد کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھیں۔

بلکہ جب سے گل میاں، مشکبار کی وجہ سے یہاں رہنے لگے تھے، نامہ بیگم کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوتی گئیں۔ بعض اوقات ان سے بازار کا سودا سلف تک لانے کی فرمائش کر بیٹھتیں۔ کبھی اپنے اور عاشی کے کپڑے درزی سے سلوار ہی ہیں، کبھی اپنی کوئی پسندیدہ چیز لانے کو بھیج دیا اور تو اور انہیں اپنے پاندان کا سامان تک گل کا خریدنا ہوا پسند آتا۔

گل کی مجبوری یہ تھی کہ اب وہ ایک شادی شدہ مرد تو ہو گئے تھے مگر بیوی سمیت

کہیں رہنے کا بندوبست کرنے سے قاصر تھے۔ جس کی سبب میں بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک خود کفیل نہ ہو سکے تھے۔ ظاہر ہے اب سے چند ماہ قبل تو ان کا طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تھا۔ ابھی وہ اپنی ذاتی پریکٹس کہیں جمانے پائے تھے کہ شادی ہو گئی۔ کچھ نہ کچھ تو بیوی کے بھی اخراجات تھے۔ اپنے بھی شوق تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی دل میں ہزاروں ارمان اور آرزوئیں، حسرتیں بن کر تڑپ رہی تھیں۔ وہ مشکبار کو اچھے سے اچھا پہنانا چاہتے۔ خوب سیر و تفریح کروانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ہزاروں اقسام کے زیورات اور پسندیدہ چیزیں خریدنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جب ان کی ذاتی..... پریکٹس خوب چمک رہی ہوتی مگر وہ فی الحال اسی ایڈووکیٹ کے دست نگر تھے جس کی نگرانی میں سیکھ رہے تھے۔ جب کوئی مقدمہ خوب زور و شور سے کامیاب ہو جاتا تو وہ ایڈووکیٹ ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے نکلتا اور یہ اس روز خوب خوش خوش بیوی کے لئے کوئی چیز لئے ہوئے گھر پہنچتے۔

چنانچہ ایسے حالات میں یہ بہت غنیمت تھا کہ باپ کے زیر سایہ انہیں رہائش بھی ملی ہوئی تھی اور دال پانی روٹی کی فکر سے بھی آزاد تھے۔ بلکہ اس حد تک مراعات مل گئی تھیں کہ خود بھی تینوں وقت یہیں کھانا کھانے لگے تھے۔

دھیرے دھیرے بہت سے دن گزر گئے۔

ماں کی طرف سے تو مشکبار کو کیا سکون ملتا، ہاں گل نے جی بھر کے اس کا دامن اپنی چاہت کے پھولوں سے بھر ڈالا تھا۔

بس یہ سکون، یہ ٹھہراؤ اس کے حصے میں آگیا تھا۔

پہلے اکیلی تھی --- تنہائی کا زہر نس نس میں پھیلتا رہتا تھا۔ اب یہ فرق آگیا تھا کہ ایک آنسو پونچھنے اور پر خلوص تسلی دینے والا میسر آگیا تھا۔ جو نہایت خلوص اور نیک نیتی سے اس کے زخمی زخمی دل میں حوصلوں اور امنگوں کی فصل اگا جاتا۔ اور اس کے

انداز زندہ رہنے کی امنگ بڑھاتا۔

شب و روز انہی حوصلوں انہی امنگوں میں گزرنے لگے۔

شروع شروع میں کوئی ہفتہ بارہ دن نانہ بیگم نے دانستہ شمشاد اور دلشاد کو اوپر ہی سلایا تھا۔ پھر خود بخود ایک دن دوبارہ نیچے بھیج دیا۔ مشکبار تو مشکبار، گل نے بھی اعتراض نہ کیا۔ اعتراض کرنے کا دونوں کو حق بھی نہ تھا۔ مشکبار نے بسرو چشم معصوم بھائیوں کو اسی کمرے میں جگہ دے دی۔ ان کا بہن کے سوا تھا بھی کون؟ اور وہ خود بھی ان کے بغیر بے چین سی رہا کرتی تھی۔ بچپن سے اب تک عادی ہو چکی تھی۔ بھائیوں کو سنبھالنے اور دیکھ بھال کرنے کی۔



مشکبار کو اب بھی کبھی کبھی بانو کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا خیال آ جاتا تو پہروں رنجیدہ اور خاموش خاموش رہتی۔ مگر اب اس نے گل کے مسلسل سمجھانے سمجھانے سے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اکثر ایسا ہوتا کہ بانو اور گاؤں والوں کا خیال آتا تو وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں الجھالیتی اور بھول جانے کی کوشش کرتی۔

شادی کے شروع دنوں میں اکثر گل شام کو آتے تو وہ ان سے گاؤں والوں کے بارے میں کئی کئی بار استفسار کرتی کہ ان کو اس شادی کا معلوم ہوا ہے یا ابھی تک بے خبر ہیں! لیکن عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے کبھی اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا کہ وہاں کے کیا حالات ہیں اور وہاں اس اچانک شادی کا کیا رد عمل ہوا۔

چونکہ شادی کے بعد سے آج تک گاؤں والوں میں سے کوئی بھی دوبارہ آکر یہاں نہیں جھانکا تھا۔ اس لئے مشکبار نے از خود سوچ لیا تھا کہ ان کو ضرور کسی سے خبر مل چکی ہے اس لئے ان لوگوں نے آنا جانا قطع کر رکھا ہے اور خفا ہیں۔ ورنہ پھر بھی کبھی کبھی

”جی ہاں..... اب صورت حال تو ایسی ہی ہو چکی ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے اکیلا بھی عدالت میں کیس لڑ سکتا ہوں۔ لیکن..... سوال یہ ہے کہ بغیر پیسے بغیر کوڑی کہاں پر کاروبار جماؤں؟ دکانیں تو کئی ایک موقع کے لحاظ سے نظر میں ہیں مگر میں فی الحال کسی سے سودا بازی کرتے ہوئے کترابا ہوں۔ اس سلسلے میں میں خود بھی ابامیاں سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

انہوں نے صاف صاف بات کہتے ہوئے--- باپ کی طرف دیکھا۔ جو بظاہر کھانا کھا رہے تھے مگر بیٹے کی بات بھی توجہ سے سن رہے تھے۔

مشکبار بھی باورچی خانے میں بیٹھی ادھر ہی کان لگائے ہوئے تھی۔

نامہ بیگم نے گل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اے تم نے کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟ کیا پسند نہیں آیا کھانا؟ یہ چپاتی اور کوftے لئے ہوتے۔ دیکھو مشکبار نے کس محنت سے پکائے ہیں۔“

مشکبار کی تعریف سن کر وہ قدرے مسکرائے مگر متانت سے جواب دیا۔ ”نہیں اماں۔۔۔ کھانا تو ماشاء اللہ بہت لذیذ اور عمدہ ہے۔ مگر مجھے بس اتنی ہی بھوک تھی۔ اب گنجائش نہیں معدے میں۔“

حالانکہ آج بھوک تو انہیں بہت زوروں سے لگی تھی مگر نامہ بیگم کے بظاہر متحاسن بھرے لیکن درحقیقت طنزیہ انداز نے ایک دم طبیعت مکدر کر ڈالی تھی۔

”اوہو اچھا!“ وہ ایک طویل سانس کھینچ کر بولیں۔ ”میں ڈر گئی تھی کہ کہیں تمہیں میری کوئی بات بری نہ لگ گئی ہو۔“

”ارے واہ! آپ بھی بس کمال کرتی ہیں اماں۔“ گل ایک بناوٹی ہنسی ہنس کر بولے۔

ابامیاں جو دونوں ماں بیٹے کی باتیں سن رہے تھے کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ہاتھ دھوئے پھر خلال کرتے ہوئے گل سے کہنے لگے۔

عباس یا گوئی دوسرا رشتہ دار آہی نکلتا تھا۔ لیکن اب ادھر کئی ماہ سے تو وہاں سے ایک چڑیا کا بچہ کا بچہ بھی آکر نہ جھانکا تھا۔

ایک دن جبکہ سب لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، نامہ بیگم نے وہ بات چھیڑ دی، جو گزشتہ کئی روز سے ان کے دماغ میں آئے جا رہی تھی۔

آج اتوار کا دن تھا اور گل کے علاوہ ابامیاں بھی صبح سے گھر پر تھے، چھٹی کے دن یہ دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

مشکبار نے کھانے کی سینی لاکر تخت کے نیچ رکھ دی اور پانی کا جگ لینے کے لئے چلی گئی۔ اب گرمی کی رت خاصی بڑھ چکی تھی، اس لئے دوپہر کے کھانے میں چاولوں کا خشک ضرور ہوتا تھا۔ چاول گل کا بہت پسندیدہ کھانا تھا۔ انہوں نے مہکتی ہوئی گرم گرم چپاتیوں کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے اپنی پلیٹ میں چاول ہی نکالے اور دھلی ہوئی ماش کی مسالے دار دال ڈال کر کھانے لگے۔

نامہ بیگم قدرے مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”گل میاں! کبھی تمہیں اپنے گاؤں کی دال یاد نہیں آئی جو تمہارے گھر میں پکتی ہے! خدا جانتا ہے اس ہنڈیا میں ہر مسالے کی خوشبو نہایت آسانی سے الگ الگ شمار کر لو۔“

گل نے ان کے اچانک تبصرے پر کوئی جواب نہ دیا بلکہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ ابامیاں کے سنجیدہ ہونٹوں پر بھی تبسم ریگ گیا تھا۔

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد نامہ بیگم سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

”ویسے..... تم اپنی ذاتی پریکٹس کب سے شروع کرو گے؟ میرا تو خیال ہے اب تم اکیلے کیس حل کرنے کے قابل تو ضرور ہو گئے ہو گے! کئی مہینے تو گزر چکے۔“

گل کے چہرے سے ایک سایہ سا گزر گیا۔

انہوں نے چند گھونٹ پانی پیا اور چاول کی پلیٹ اپنے سامنے سے ہٹا کر جواب دیا۔

اسی وجہ سے وہ بار بار اس تذکرے کو چھیڑ بیٹھتی تھیں اور گاہے گاہے میاں کے کانوں میں بھی یہ بات پھونکنے لگی تھیں۔ چنانچہ آج ابا میاں نے کھلے الفاظ میں بیٹے کو بڑے بھائی سے پریکٹس کے لئے رقم لینے کی رائے دی تھی بلکہ گاؤں جا کر خود معاملات طے کرنے کا حکم دیتا تھا۔



مشکبار کو تو وہ کسی قطار شمار لاتی ہی نہ تھیں۔ خوب اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ کسی مسئلے میں دخل انداز نہیں ہو سکتی۔ جو یہ ماں کی حیثیت سے کہیں گی وہ بے چون و چرا سر جھکا کر کرے گی۔ اس کے سوا اس نے ماں سے سیکھا ہی کیا تھا! اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ گل کو اپنی راہ پر لگا کے مال وصول کر لیں اور جب تک ممکن ہو سکے خوب بہتے دریا میں ہاتھ دھوئیں۔

”اب موقع ہاتھ آگیا ہے کہ تم گاؤں جاؤ اور جا کر عباس سے اس سلسلے میں بات کرو۔ اس سے صاف صاف کہو کہ اب کم از کم اتنی رقم کا بندوبست کر کے دو دے کہ میں فکری اور سکون کے ساتھ اپنی پریکٹس جماسکوں۔ اس سلسلے میں میں خود تمہاری مدد کرتا مگر میری پوزیشن اس حد تک نہیں ہے۔ پنشن وغیرہ کا پیسہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اس لئے میری طرف سے تو مدد کا کوئی امکان ہی مت سمجھو۔ میں خود بھی گاؤں جاتا مگر آج کل کچھ گرمی کی وجہ سے طبیعت گری گری سی رہتی ہے۔ اس لئے فی الحال تو جانے کا ارادہ نہیں ہے مگر تم کو تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے آخر کو وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس سے نہ لو گے تو پھر کس سے لو گے۔ میرا تو یہ ہے کہ سال کے سال ہی حساب کتاب لیتا ہوں اس سے۔“

لیکن گل کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ گاؤں جاتے ہوئے وہ بہت ہچکچا رہے تھے، اس لئے مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔

گوکہ اپنی دانست میں گل نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ اپنے کئے پر پشیمان تھے۔ مگر تھا بہر حال یہ اقدام ان کی خاندانی روایات کے برسرِ خلاف ہی۔۔۔ بس جواب دہی کے خیال سے گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی ان پر۔

ادھر نامہ بیگم کو گل کا بغیر پیسے کوڑی کے رہناب خار کی طرح جھپنے لگا تھا۔

یہاں گل کمرے میں تنہا لیٹے چھت کی کڑیاں گن رہے تھے۔ دلشاد اور شمشاد کہیں باہر کھیل رہے تھے۔

مشکبار کو دیکھ کر وہ نیم دراز ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگے۔

”میں..... سوچ رہا ہوں مشکبار! کہ یہاں چھت پر ایک عدد برقی پنکھا ضرور لگنا چاہئے۔ اب تو موسم بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ رات کو کافی گھٹن اور گرمی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ چند دنوں میں باقاعدہ گرمی آجائے گی۔“

اس نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ”زیادہ تردد کی کوئی بات ہے ابامیاں کے کمرے سے اتار لائیے پنکھا۔“

”تم..... گویا میری غربت کا مذاق اڑا رہی ہو!“ وہ قدرے افسوس کے لہجے میں بولے۔

”ارے میری توبہ..... ہزاروں بار توبہ۔“ وہ جلدی سے کلمے پیٹ کر کہنے لگی۔
”میں تو محض مذاق میں کہہ رہی تھی اور آپ..... برامان گئے..... افوہ بھی..... یہ لیجئے! معافی مانگتے لیتے ہیں۔“ مشکبار نے بدستور ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیئے۔

گل نے مسکرا کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور نارمل لہجے میں کہنے لگے۔ ”یہ تو خبر مجھے بھی معلوم ہے کہ تم مذاق کر رہی تھیں لیکن میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں کہ خدا نے چاہا تو جلد از جلد اپنی کمائی سے اس کمرے میں پنکھا ضرور لگواؤں گا۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں ہے بس نیت ہونی چاہئے۔“

”آمین۔ ثم آمین.....“ مشکبار نے اس دفعہ نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”میری دعا ہے خدا تعالیٰ آپ کے نیک ارادے میں برکت دے، اسے پورا کرے اور ہمارے کمرے میں چھت کا پنکھا لگ جائے..... ہائے..... ایمان سے کتنے مزے کا کام ہو گا کم از

کم نیند تو چین کی آیا کرے گی۔ ہم تینوں بہن بھائی ہر سال اتنی اتنی سڑی گرمی میں گدھوں کی طرح پڑے ہانپتے رہتے تھے۔ آپ سے چلو فائدہ تو ہو گا کہ گرمی سے نجات مل جائے گی اور میرے معصوم بھائیوں کو بھی آرام ملے گا۔“

”اچھا جی..... تو گویا ہم سے اور کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔“ گل نے شوخی اور شرارت سے پوچھا۔

”نہیں جی..... اور بھی بہت سارے فوائد ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ گوشت اور ترکاری بہت عمدہ لاتے ہیں اور خود نہایت کم کھاتے ہیں۔ اماں کے لئے ذلی تمباکو اور پان جتنے اماں پیسے دیں، ان سے زیادہ لا کر دیتے ہیں ان سب فائدوں کے علاوہ مزید فائدے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کبھی سائیکل کا کرایہ وصول نہیں کرتے، نیز بلا تنخواہ یہ سب کام سرانجام دیتے ہیں، دھوبی، درزی، جولاہے، کپڑے والے، پرچون والے، ترکاری والے تقریباً ہر طبقہ خیال کے افراد سے آپ کی واقفیت اور دوستی ہے جن کی مراعات سے براہ راست اماں کو مالی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ کبھی کبھی نہایت سنجیدگی سے ملازم کو ہٹا دینے کا منصوبہ بنانے لگتی ہیں۔“

گل اس کے شوخ لہجے اور شرارت بھرے انداز پر کھسیانے ہو کر ہنسنے لگے۔ دل ہی دل میں اس کی باتوں سے قائل بھی ہو رہے تھے۔

”پھر..... کب لگوار ہے ہیں پنکھا؟ مجھے اشتیاق ہونے لگا ہے۔“ مشکبار نے جھوٹ موٹ سنجیدہ بن کر پوچھا۔

”جب میرے مولا کو منظور ہو گا۔“ گل نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ”خدا کے ارخانے میں دیر ہے اندھیر تو نہیں۔ میں تمہاری طرح مایوس نہیں ہوں۔“

”وہ سچ سچ سنجیدہ ہو کر بولی۔“ خیر..... یہ تو آپ سراسر غلط کہہ رہے ہیں کہ میں یس رہتی ہوں۔ جناب! مایوسی اگر میری فطرت میں ہوتی تو جانے کب سے..... اس

بیکار اور فالتوز ندگی سے پیچھا چھڑا چکی ہوتی!“

گل جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور ملامت بھرے لہجے میں کہنے لگے۔ ”یہ آج تم کیسی اوندھی سیدھی باتیں کہتے جا رہی ہو! کیا ہو گیا ہے تمہاری زندگی کو؟ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ والدین تمہارے سر پر موجود۔۔۔ بھائی خدا نے تمہیں دیئے۔ جیسا کیسا بھی ہوں میں تمہارا شوہر بھی دلجوئی کرنے کو تیار رہتا ہوں۔ اور تمہیں کیا چاہئے، آرام و سکون سے بسر کئے جاؤ۔ ناشکری تو خدا کو بھی ناپسند ہے۔“

مشکار صرف مسکرا کر رہ گئی۔ جانے کیوں اس نے گل کی بات کا جواب نہیں دیا۔ گل خود ہی دوبارہ کہنے لگے۔

”بس اب تو خدا سے دعا کرو کہ ہمارے بھی مصیبت اور غربت کے دن کٹ جائیں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کتنے ارکان اور نیک جذبات ہیں یہ وہی جانتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے قدموں میں دنیا جہان کی نعمتیں ڈھیر کر دوں۔ اور تمہاری ہر خواہش ہر آرزو کہنے سے پہلے پوری کر دیا کروں۔ اب ابامیاں نے علیحدہ پریکٹس کا مشورہ دیا ہے۔ سوچ رہا ہوں کبھی روز عباس بھائی صاحب سے جا کر اس معاملے میں بات کر ہی لوں۔ تاکہ جلد از جلد ٹھکانے سے بیٹھ جاؤں۔ کم از کم اپنی ذاتی آمدنی کی آس تو بندھے گی۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔“ وہ بھی جلدی سے خوش ہو کر بولی۔ ”میں نے جب سے ابامیاں کے منہ سے یہ بات سنی ہے مجھے خوشی کا احساس ہو رہا ہے۔ جب آپ الگ دکان کھولیں گے اور آپ کی پریکٹس خوب چمک اٹھے گی تب کیسا مزہ آئے گا۔ سب لوگ مجھے کہا کریں گے کہ دیکھو! یہ وکیل صاحب کی بیوی ہیں۔“

وہ بے ساختہ ہنس دیئے۔

خوشی و سرمست کے اندرونی احساس سے ان کا چہرہ چمکنے لگا اور پیار سے اسے دیکھ

کر بولے۔

”انشاء اللہ..... تمہاری یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ بس ذرا ایک بار گاؤں کا چکر لگاؤں پھر تو چند ماہ کے اندر راندہ ہمارے دن پھر جائیں گے۔“

”کب جائیں گے آپ گاؤں!“ مشکار نے جلدی سے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

”دیکھو..... ہفتے ایک میں ارادہ باندھ تو رہا ہوں۔ آگے جو بھی میرے رب کو منظور ہو۔ تم بھی ہر نماز کے بعد دعا کیا کرو۔“

”ادھر..... بانو کے گھر بھی جائیں گے کیا؟“

”اچھا.....! ادھر کیا جلتی پر تیل چھڑکنے جاؤں!“ ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

وہ ایک دم ہی چپ ہو گئی اور سوچنے لگی۔

”سچ تو ہے..... اب وہاں یہ کس منہ سے جائیں گے..... یہ لوگ سوچیں گے بھلا! ہو سکتا ہے بات تک نہ کریں اور خود بانو کے دل پر کیا گزرے گی ان کو دیکھ کر.....؟ ہائے محض ایک میری وجہ سے یہ بے چارے اپنے سارے کنبے خاندان سے بچھڑے گئے لیکن..... اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب کچھ تو اماں کی مرضی اور خواہش پر ہوا ہے..... اور اللہ کی شان دیکھو! وہی اب اچھا نہیں جان رہیں۔“

”یہ کس سوچ میں پڑ گئیں مشکار؟“

گل نے اسے اندر ہی اندر کسی سوچ میں گھلتے دیکھ کر ملامت سے پوچھا۔

”کسی بھی نہیں۔“ وہ چونک کر جلدی سے ہنس دی۔ ”میں بھلا کیا سوچوں گی۔ یونہی ذرا بانو کا خیال آگیا تھا۔“

”بانو کا..... خیال؟“ وہ متحیر رہ گئے۔ مگر پھر فوراً ہی ایک گہرا سانس لے کر ہنس لگے۔

”ارے ہاں..... میں تو بھول ہی چکا تھا کہ کچھ عرصہ تک تمہارے سر میں ایک

لڑکی بانو کا سودا بھی ہوا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے..... آج پھر وہ جنون تازہ ہونے کا دن آگیا ہے۔“

وہ ان کے مذاق پر کھیا کر مسکرانے لگی مگر خاموش رہی۔

گل شاید کچھ مزید تبصرہ کرتے مگر اسی وقت دلشاد اور شمشاد آپس میں کسی بات پر جھگڑتے ہوئے آگئے۔

گل نے دونوں کو ایک ایک ڈانٹ پلائی پھر انہیں اسکول کا کام کرانے لگے۔ مشکبار دوسری طرف چارپائی پر منہ موڑ کر لیٹ رہی۔ آج کل وہ بہت سستی رہنے لگی تھی۔



”اے پیٹے..... آپ کسی صورت مان ہی نہیں رہیں۔ حالانکہ میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں۔ اچھا!..... یہ بتائیے! مشکبار کے نکاح کو کتنے مہینے ہو گئے ہیں؟“

ماسٹر صاحب کی بیوی نے کسی بات پر مسلسل بحث کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ خاصی دیر سے نائمہ بیگم کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ نائمہ بیگم کی اچھی ملنے والیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اس وقت دونوں ایک ہی پلنگ پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ درمیان میں پاندان کھلا رکھا تھا ماسٹر صاحب کی بیوی بے حد آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ خود ہی پان بنانا کرکھائے جارہی تھیں اور بحث کر رہی تھیں۔

نائمہ بیگم نے ان کی بات سن کر ذرا دیر انگلیوں پر حساب لگایا۔ منہ ہی منہ میں بد بداتی رہیں پھر سوچ کر بولیں۔

”ہاں..... میرے حساب سے آٹھ ماہ تو ہو گئے اس بیاہ کو۔“

”بس تو پھیر ٹھیک ہے۔“ ماسٹر صاحب کی بیوی مطمئن ہو کر کہنے لگیں۔

”آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے لیکن دیکھ لیجئے گا میرا کہنا کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ مشکبار کو کم سے کم بھی چار ماہ ہیں۔ بس اب تو خیر سے نانی بننے کی تیاری شروع کر دیجئے۔ اچی ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں آپ کی طرح۔“

نائمہ بیگم ان کے مذاق پر ہنس نہ سکیں۔ سوکھا سامنہ بنا کر بولیں۔ ”اے آج کل تو دن لگتے دیر ہی نہیں لگتی۔ مجھ کو گڑ ماری نے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ نہ کبھی اس سے دریافت کیا۔“

”اے لو۔“ ماسٹر صاحب کی بیوی ایک اور پان منہ میں رکھ کر گویا ہوئیں۔ ”اس میں پوچھنے دریافت کرنے کی کون سی بات ہے۔ شادی بیاہ ہو جائے تو پھر یہی دھندے شروع ہو جاتے ہیں۔ کہیں لگاتار..... تو کہیں وقفوں کے ساتھ۔ کیا ہمارے آپ کے بچے نہیں ہوئے؟“

نائمہ بیگم جواب تک سنبھالا لے چکی تھیں مسکرا کر بولیں۔ ”ہاں ہوئے کیوں نہیں۔ مگر میں حیران ہوں کہ تم نے پہچانا خوب..... میرے سامنے تو وہ چو بیس گھنٹے رہتی ہے اور مجھے پتہ نہ چل سکا۔“

انہوں نے تجربہ کار انداز میں آنکھیں چلا کر کہا۔ ”اے ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن کر بنا ڈالیں۔ وہ تو اتنے عرصے سے آنا نہ ہو اور نہ پہلے ہی بتا دیتے۔ اس وقت بھی محض اتفاق سے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس کے کمرے میں جھانک لیا۔ بے خبر بڑی سو رہی تھی۔ بس فوراً اندازہ ہو گیا۔“

”ہاں..... سستی سی لگی تو بہت دفعہ مجھے بھی تھی۔“ نائمہ بیگم پاندان اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سوچ بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔ ”ایک دن کہہ رہی تھی چکر آ رہے ہیں..... کبھی کبھی کمر میں درد بھی بتاتی ہے۔“

ماسٹر صاحب کی بیوی قدرے افسوس کے لہجے میں بولیں۔ ”کمزور بہت ہے نا! اس لئے چکر دو کر آجاتے ہوں گے۔ اے کیسی دھان پان سی تو رکھی ہے۔ ورنہ آپ جانتی ہیں پہلے پہل کے بچے کا تو تندرست لڑکیوں کو پتہ تک نہیں چلتا، ادھر سے ادھر بھاگی بھاگی پھرتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے کہنے سے بھی اچھل پھاند سے نہیں چوکتیں۔“

نامہ بیگم کچھ قائل ہو کر کہنے لگیں۔ ”ہاں۔ اس کی اٹھان ہی نازک سی ہے۔ اب اس قدر ترقی کی کو کیا کیا جائے۔ اے اسے تو وغیرہ بھی کرتے تو نہیں دیکھی میں نے!“

”خیر یہ کوئی لازمی نشانی نہیں ہے۔“ وہ اگلدان میں پیک تھوکر اطمینان سے بولیں۔ ”ہمیں ہی دیکھ لیجئے..... گیارہ بچوں کی اماں بن گئے ماشاء اللہ۔ مگر کسی دفعہ بھی قے تو درکنار..... کبھی معمولی سے ابکائی تک نہیں آئی۔“

نامہ بیگم ہنسنے لگیں۔ ”اے بہن! آپ نے تو اپنی ساری سوانح عمری سی دہرا ڈالی۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ کبھی کچھ محسوس نہیں کیا۔“

ماسٹر صاحب کی بیوی کو ایک دم پھر مشکبار کا خیال آگیا۔ اب آپ اپنی بیٹا کا ذرا احیال رکھئے گا۔“ بالی عمر کی بچی ہے اور کمزور سی۔ کہیں خدا نخواستہ اونچا نیچا پاؤں نہ پڑ پڑا جائے۔ دوسرے آپ کے اتنی بہت سی میٹرھیوں کا زینہ ہے۔ سمجھاتی رہئے گا ذرا۔“

نامہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ فقط سر ہلا کر رہ گئیں۔

یہ دونوں بہت دیر تک اسی نوعیت کی باتیں کرتی رہیں اور چونکہ ایک موضوع ہاتھ لگ گیا تھا اس لئے اپنی اپنی عادات اور مزاج بھی ایک دوسری پر عیاں کرتی جا رہی تھیں۔ اسی دوران نامہ بیگم نے اٹھ کر شربت تیار کیا۔ خود بھی نوش جان کیا اور انہیں بھی پلایا۔ کچھ دیر بیٹھی وہ مزید باتیں کرتی رہیں پھر رخصت ہو گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد نامہ بیگم نئے سرے سے سوچ میں غرق ہو گئیں۔ وہ سر سے پاؤں تک فکر میں مبتلا تھیں۔

انہیں پریشانی اس بات کی تھی کہ بیٹھے بٹھائے ایک خرچ مزید بڑھنے والا تھا۔ جبکہ گل کی آمدنی وغیرہ کا ابھی کسمہ معلوم نہ تھا۔

انہوں نے اپنے دل کو سمجھانے کے لئے ایک بار پھر حساب جوڑا پھر از خود بولیں۔ ”ہاں! اگر گل آج کل ہی میں گاؤں سے رقم لا کر اپنی پریکٹس شروع کر دیں تو ممکن ہے بچے کی پیدائش تک خود کفیل ہو جائیں۔ اس طرح اپنے اخراجات خود اٹھائیں گے..... ہاں تو اور کیا! بھلا میں کہاں سے لاؤں گی؟ کوئی ایک آدھ روپیہ تو خرچ ہوتا نہیں اس موقع پر۔ اللہ خیر کرے سینکڑوں ہی کا خرچہ پڑ جاتا ہے.....“

نامہ بیگم نے واقعی اب تک مشکبار کے حلے پر توجہ نہیں دی تھی۔ مگر جب انہوں نے غور کیا تو۔۔۔ انہیں بھی ماسٹر صاحب کی بیوی کے انداز کی داد دینی پڑی اور انہیں بھی یقین آگیا کہ مشکبار امید سے ہے۔

گلے۔۔۔

جب ابامیاں اور گل ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر چلے گئے اور یہ دونوں ماں بیٹی گھر پر اکیلی رہ گئیں تو نامہ بیگم نے موقع پا کر مشکبار سے دریافت کیا۔

”تم..... دوسرے جی اسے ہو کیا مشکبار!“

”جی!“ وہ حیران رہ گئی، اگر کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی صورت تکنے لگی۔

نامہ بیگم کو سخت الجھن ہوئی، مگر سمجھا بھجا کر پوچھنے لگیں۔

ماں کے منہ سے یہ کھلی کھلی باتیں سن کر مشکبار کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑ گئی۔ ہونٹ پل بھر میں۔۔۔ کھ کر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے اور وہ ماں کے سامنے بحر موں کی طرح سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

یو نہی لگ رہا تھا جیسے اس نے چوری کر لی ہو۔۔۔

اس کی یہ کیفیت دیک کر نامہ بیگم ٹپٹا کر رہ گئیں۔

آخر کو ماں تھیں۔ دل ہی دل میں اسے پشیمان اور پریشان دیکھ کر خود بھی بڑی شرمندہ ہوئیں۔ سوچنے لگیں۔

’اے ہے۔ میں نے ناحق لڑکی کو کچا کیا۔ کیسی چوروں کی طرح سر جھکا کر کھڑی ہو گئی ہے جیسے کوئی انہونی سر زد ہو گئی ہو.....‘

تھیں نہایت جہاندیدہ۔۔۔ بات بدل کر جلدی سے بولیں۔

”اپنی طبیعت کا دھیان رکھا کرو بیٹی۔۔۔ ابھی شروعات ہے اس لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے کوئی وزن وغیرہ مت اٹھانا سیرھیاں سنبھل سنبھل کر اترا کرو۔ کچے کچے دنوں کی ذرا سی بے پروائی بعد کو ساری عمر کا روگ بن جاتی ہے..... اور ہاں دیکھو! میں گل سے بات کروں گی ذرا وہ تمہاری صحت کا خیال رکھے۔ کوئی فروٹ وغیرہ منگوا کر دوپہر کو کھا لیا کرو..... اور جب تک وہ پیسے کا انتظام نہیں کرتا، تم رات کو ہمارے دودھ میں سے ایک پیالہ دودھ لے کر پی لیا کرو.....“

ماں کی غیر متوقع اور غیر معمولی ہمدردی کی باتیں سن کر مشکبار کا دل بھر آیا اور جانے کیوں اپنے کمرے میں آکر وہ کتنی ہی دیر روتی رہی اور سوچتی رہی۔

’ہائے اللہ! اماں کو ہمارا کتنا خیال ہے!‘



ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔
اور شدید گرمی کا عالم۔۔۔

باہر دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ سنسار ہی تھی۔ جس کی وجہ سے دم گھٹتا ہوا سالگ رہا تھا۔ موسم کی اس قہر سامانی نے آوارہ گھومتے رہنے والے کتوں کو بھی ٹھنڈے اور سایہ دار مقامات پر دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بازار اور گلی کوچے سنسان پڑے تھے۔ ویران سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا۔ لوگ باگ بند کمروں میں گھسنے کو زیادہ ترجیح دے رہے تھے۔ امیر یا غریب، جی سب کا اس گھٹن اور شدید گرمی میں صرف آرام کرنے کو چاہ رہا تھا۔

ابامیاں آج سویرے سے ہی دفتر نہیں گئے تھے۔ اس وقت ان کے کمرے کے دروازے بھی بند تھے اندر سے برقی پچکھے کی گھوں گھوں کے سواہر آواز ناپید تھی۔ آنگن میں پیلی پیلی تیز دھوپ بکھری تھی۔ آنکھیں چندھیادینے والی۔۔۔

مشکبار نیچے اپنے کمرے میں کھری چارپائی پر لیٹی پسینے سے تر بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس گرمی اور گھٹن میں اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی، نیند کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

دوسری چارپائی پر شمشاد اور دلشاد بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ پسینے میں وہ بھی سر سے پاؤں تک شرابور تھے۔

کسی کسی وقت مشکبار ہاتھ بڑھا کر انہیں بھی پکھا جھل دیتی۔

ادھر بہت دنوں سے اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ اپنی ناتجربہ کاری اور کمسنی کی وجہ سے اسے پوری طرح احساس نہیں تھا ورنہ خون کی ایک دم کی نے اس کے جسم کی ساری توانائی کھینچ لی تھی اور وہ چوبیس گھنٹے کمزوری اور دل بیٹھنے کی شکار رہنے لگی تھی۔ چلتے چلتے ایک دم آنکھوں کے آگے گہرے اندھیرے آجاتے، کمر میں درد اٹھتا تو دن بھر ہوتا رہتا۔ اب تو ہاتھ پیروں پر بے معلوم سا درم بھی آنے لگا تھا۔

نامہ بیگم بیٹی کی حالت کو خوب سمجھ رہی تھیں، آخر کوماں تھیں۔ ایسا ماما سے خالی دل بھی نہ تھا۔

جی، جی میں اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کبھی کبھی کڑھنے لگتیں۔ گل پر بے تحاشا غصہ آجاتا۔ جو پیسے کے تھے نہ کوڑی کے۔

وہ آج کل صرف اسی وجہ سے چپ سا دھسے ہوئے تھیں کہ چلو یہ روپیہ بھائی سے لے کر آئیں گے تو کاروبار کر ہی لیں گے۔ پھر پیسے کی ریل پیل ہو جائے گی۔

حتی الامکان مشکبار سے محنت طلب کام کم لینے لگی تھیں لیکن تاکے..... آخر کو اتنے بڑے رہتے بستے گھر کا دھندا تھا۔ خود کام کاج کی عادت تقریباً چھٹ چکی تھی تاہم بیٹی سے انہوں نے اپنا رویہ خاصی حد تک نرم اور ہمدردانہ کر لیا تھا۔ سوچتی تھیں میں نے خود ہی تو آگاہیچھے دیکھے بغیر محض اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں یہ نکاح کر دیا ہے۔ اب کچھ کہوں بھی تو کس زبان سے کہوں! اور لڑکی کا تو اس میں سرے سے ہی کچھ قصور نہیں ہے۔

خود ان کے اپنے گھر کا خرچ اتنا بڑا اور پھیلا ہوا تھا کہ وہ مشکبار کے دوا علاج، قیمتی دواؤں، فروٹ یا غذا پر اپنے پلے سے خرچ نہ کر سکتی تھیں۔ اب آج کل تو ان کی نگاہیں گل پر لگی تھیں کہ وہ کب گاؤں جائیں اور وہاں سے ایک خطیر رقم وصول کر کے لائیں۔ گل کو آج گاؤں گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔

مشکبار کو ایک ایک بل ان کا انتظار تھا۔

جب سے شادی ہوئی تھی۔ اس دفعہ پہلی بار وہ اتنے دنوں کے لئے اس سے دور ہوئے تھے۔ یوں بھی مشکبار کو سر سے پیر تک فکر لگی ہوئی تھی کہ دیکھو گاؤں میں سب لوگ ان سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ یہ بات تو پکی تھی کہ انہیں گل اور مشکبار کی شادی کی اطلاع ملی چکی ہوگی۔ لیکن خود گل شادی کے بعد بالکل پہلی بار گئے تھے اور مشکبار نے صاف محسوس کیا تھا کہ بہت جھجکتے ہوئے گئے ہیں۔

اپنی واپسی کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے ہی بھائی صاحب نے رقم کا انتظام کر دیا وہ لے کر واپس چلے آئیں گے۔

مشکبار اس بلا کی گرم دوپہر میں سوچتی سوچتی جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی مگر نیند اس پر مہربان نہیں ہو سکی تھی۔

’اللہ..... گل جلدی سے پیسے لے کر واپس آجائیں۔ پھر یہاں ہمارے کمرے کی چھت پر بھی ایک عدد برقی پنکھا لگ ہی جائے گا!‘

اس نے کروٹ بدل کر بڑی بے تابی سے سوچا، تصور میں ابامیاں کے ٹھنڈے ٹھار کمرے کا منظر گھوم گیا جہاں چوبیس گھنٹے برقی پنکھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھینکتا رہتا تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

اور جی جی جی میں کوفت کھا کر جلدی جلدی پنکھا جھل کر خود کو سکون پہنچانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر گرمی کی تہی اور ٹھنڈی آمیز دوپہر میں بھلا آرام اور سکون کہاں۔

اچانک --- خاموش دوپہر کے اس جامد سناٹے میں کسی نے باہر کے دروازے پر کھٹکا کیا۔

پہلی آہٹ کو مشکبار اپنا دواہمہ سمجھی۔

لیکن دوسری آواز پر وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس دستک کو وہ خوب اچھی طرح پہچانے لگی تھی

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح بھاگ کر گئی اور پلک جھپکتے میں دروازے کی زنجیر گرا دی۔ توقع کے عین مطابق گل اس کے سامنے کھڑے تھے۔

بیوی کو دیکھ کر انہوں نے مسکرا۔ تہ کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

ان تباہ حال حلیہ دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گاؤں سے یہاں تک پیدل چلتے ہوئے آئے ہوں۔

جو کپڑے یہاں سے پہن کر گئے تھے، اس پسینہ بہاتی گرمی میں بھی وہی جوڑا ان کے جسم پر چپکا نظر آ رہا تھا۔ جو چکیٹ ہو چکا تھا جگہ جگہ پسینے اور مٹی کے داغ تھے۔ ایڑی سے چوٹی تک محاورے والا پسینہ بہہ رہا تھا۔ ہونٹوں پر چڑیاں جھی تھیں۔ شیو بڑھی ہوئی اور آنکھیں اندر کود دھنسی دھنسی چہرے پر فاقہ مستوں والی بے بسی کے سائے۔۔۔ مشکبار کے پیروں تلے کی مٹی سرک گئی۔

یہ تو اصلی گل میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہو گیا تھا۔

مشکبار نے ان کا وہ ہاتھ جو چوکھٹ پر کھا ہوا تھا پکڑ کر کھینچنا چاہا اور لرزتی آواز میں

بولی۔

”اندر آئیے نا۔۔۔ یہ باہر کیا کھڑے دیوانوں کی طرح دیکھ رہے ہیں!“

ہاتھ پر ہاتھ پڑتے ہی جیسے کسی نے اسے آگ کے دریا میں دھکا دے دیا۔ گل کا

ہاتھ انگاروں کی طرح تپ رہا تھا۔ بخار جیسے ان کی رگ رگ سے ٹپک رہا تھا۔

مشکبار کا اپنا آپ ڈوبنے لگا۔

بیابان بدن ہو لے ہو لے کا پنے، تھر تھرانے لگا۔

مگر اس نے حوصلے سے کام لیا اور کسی نہ کسی صورت اپنا ناتواں سہارا دے کر شوہر کو اندر لے جانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

گل اس بجا کی حدت اور گرمی کی شدت میں کسی طرح گھر تک تو پہنچ گئے تھے مگر یہاں پہنچ کر انہیں کچھ ہوش نہ رہا۔



کمرے میں آکر چارپائی پر وہ دھڑام سے گر گئے۔ مشکبار کے کمزور ہاتھ پیر میں اتنا دم کہاں تھا کہ انہیں سنبھالے رہتی۔ اوپر سے وہ آگ کی طرح دھک رہے تھے۔ آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور تنفس تیز تر ہو تا جا رہا تھا۔ گرتے ہی ان پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

مشکبار سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گل کے دشمنوں کی یہ مردہ حالت دیکھ دیکھ کر اس کا دل پہلو سے نکلا جا رہا تھا۔ کہاں تک ضبط کرتی! گل ہوش میں رہتے تو قدرے تسلی بھی رہتی۔ اپنی بیٹا میں وہ ابامیاں کا رعب اور اماں کا تیز مزاج بھی بھول گئی۔

دوپہر کی خاموشی اور سکوت میں اس کی بلکتی ہوئی آواز کمرے سے باہر نکل کر زینے بھی پار کر گئی لیکن مشکبار کو احساس نہ ہو سکا۔

اس کے رونے کی آواز سن کر شمشاد اور دلشاد اٹھ بیٹھے اور حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

عین اس وقت نامہ بیگم ہانپتی، کانپتیں غرارہ دونوں ہاتھوں سے سنبھالیں کمرے

کے اندر داخل ہوئیں۔ گھبراہٹ اور پریشانی سے ان کی جان پر بنی تھی۔

”کیا ہو گیا..... کیا ہو گیا مشکبار؟“ انہوں نے بدحواسی کے عالم میں دریافت کیا۔
روتی بلکتی مشکبار نے گل کی طرف اشارہ کر دیا۔ جو اپنے آپ سے بیگانے چارپائی پر
آڑے ترچھے پڑے تھے اور بخار کی تیزی میں ہاتھ پیر پٹخ رہے تھے۔
”ارے یہ گل کو کیا ہوا..... اور یہ گاؤں سے کب آگئے؟“ نامہ بیگم کے منہ سے
بے اختیار نکلا۔

باہر سے ابامیاں کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کیا پریشانی ہے نامہ بیگم! میں اندر آسکتا ہوں۔“

وہ شاید بیوی کے ساتھ ہی بھاگتے ہوئے نیچے آئے تھے۔ مگر معاملے کی نوعیت نہ
سمجھتے ہوئے اور آج کل مشکبار کی حالت کے پیش نظر باہر ٹھہر گئے تھے۔

”بھئی یہ گل یہاں مدہوش سے پڑے ہیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔“ نامہ بیگم
نے پریشانی کے لہجے میں جواب دیا۔ گل کا سن کر ابامیاں اندر داخل ہو گئے اور جھک کر
بیٹے کی نبضیں ٹٹولنے لگے۔

روتی ہوئی مشکبار کی آواز میں یلکھت بریک لگ گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ابامیاں اس کے سامنے اس کمرے میں آئے تھے۔ یوں بھی ان
کی بارعب شخصیت کے سامنے سب کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔ اس نے بھی جلدی سے
اپنے آنسو خشک کر لئے اور سر جھکا کے ایک طرف کھڑی ہوں گی۔

ابامیاں نے بیٹے پر جھکے جھکے اس سے دو تین سوال کئے۔ جن کا وہ منمنّا کر جواب
دیتی رہی۔ بات میں کوئی تفصیل تھی بھی نہیں۔ بیوی کو وہیں موجود رہنے کا اشارہ کر
کے وہ باہر چلے گئے۔

شاید --- ڈاکٹر کو بلانے گئے تھے ---



گل نے ایک ہفتے تک پلنگ پکڑے رکھا۔

انگریزی دوائیں اور پرہیزی کھانا کھا کر ان کا ناک میں دم آگیا۔ تب کہیں جا کر
ان کا بخار ٹوٹا اور ڈاکٹر کی ہدایات سے جان چھوٹی۔

مگر اتنے ہی عرصے میں نامہ بیگم ان سے بری طرح خار کھانے لگی تھیں۔ ان کا
بس چلتا تو وہ انہیں ایک وقت کی بھی دوا مہیا نہ ہونے دیتیں اور نہ پرہیزی کھانا پکھنے
دیتیں لیکن اپنے میاں کے سامنے مجبور تھیں۔ جو کم از کم جان بوجھ کر تو بیٹے کو مسلسل
بیمار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ ایک قدرتی امر تھا۔

نامہ بیگم کڑ پڑ اور نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گل جیسے خالی ہاتھ گاؤں
گئے تھے، ویسے ہی خالی جھولی لئے لوٹ آئے تھے۔

کسی وقت ابامیاں نے ان سے تفصیل معلوم کی ہوگی -- بعد میں یہ قصہ ان سے
نامہ بیگم نے سنا اور تبھی سے انہیں ہر ہر بات پر گل پر تاؤ آنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا ایسے
داماد کو کچا چبا جائیں جو بقول ان کے نہ کمائی کا تھا نہ کجائی کا۔

دوسری طرف مشکبار نے گل کی بیماری کے دوران ان کی خدمت اور تیمارداری
کرنے میں اپنی کمزور سی ہستی لڑا ڈالی تھی۔ شروع کے دورات تو اس نے آٹھوں پہر
ان کی پٹی سے لگ کر آنکھوں آنکھوں میں گزار ڈالے تھے۔ اور پھر ان کا پرہیزی کھانا،
وقت پر دوا اور اپنے آرام کو آرام نہ سمجھ کر ان کی ایسی رکھوالی کی کہ نامہ بیگم کڑھ کڑھ
کر کباب ہو گئیں۔ مارے غصے کے بھنا بھنا کر انہوں نے کئی بار مشکبار کو ٹوکا اور اس
قدر تیمارداری پر لعن طعن بھی کی، سمجھایا بھی کہ اس قدر ایک نکھٹو شوہر کو سر پر مت
بٹھاؤ۔ مگر وہ اپنے دل سے مجبور تھی کس طرح انہیں تڑپتا ہوا چھوڑ دیتی!

ایک ہفتے کے دوا علاج کے بعد گل چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دوبارہ اسی وکیل کے ہاں حاضری دینے لگے۔

دیکھتے دیکھتے ان کی عادات اور مزاج میں زمین و آسمان کے فرق حائل ہو گئے تھے۔ اول تو گاؤں سے ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور منحوس ترین ذلت اٹھا کر لوٹے تھے اور اس ناکامی نے اندر سے ان کا کلیجہ چاٹ ڈالا تھا۔ مرے پر سودرے یہ کہ نامہ بیگم نے صحیح صورت حال کا اندازہ ہوتے ہی طوطے کی طرح نظریں پھیر لی تھیں۔ ہر وقت جلی کئی باتوں اور طعن آمیز لہجے کے سوا ان کے پاس کے پاس کچھ بھی نہ رہا تھا۔ گل سخت مجبور تھے۔ بڑی بے کسی اور لاچاری کے عالم میں ان کی جلی کئی سنتے رہتے۔

ان میں اور پہلے کے تروتازہ و خوش باش گل میں کوئی قدر مشترک نہ رہ گئی تھی۔ اماں سے تو اب وہ قدرتی طور پر سہمے سہمے سے رہنے لگے تھے۔ بعض اوقات وہ سوچتے۔ مشکبار غریب کا کوئی قصور نہیں ہے مگر اسے اپنا کر معلوم نہیں میں نے اچھا کیا یا برا کیا ہے! سوائے دکھ اور پریشانیوں کے کچھ بھی تو اسے نہ دے سکا۔ مجھ سے اماں کے بغض اور ناز انصافی کی یہی وجہ ہے۔ کاش! میں کچھ آمدنی کے لائق ہوتا! لیکن مجھے تو کہیں کوئی ملازمت بھی نہیں ملتی، ایسے حالات میں ماسوائے نفرت اور حقارت کے کیا مل سکتا ہے؟ بغیر کام تو پتھر بھی بھاری لگتا ہے!



یہ زہریلی سوچیں اور فکریں گل..... کو ہر وقت اندر ہی اندر چاٹتی رہتیں۔ انہوں نے اوپر جانا بہت کم کر دیا تھا اور اگر ایسا کوئی اتفاق ہو بھی جاتا تو اماں کی پیشانی کے سینکڑوں بل دیکھنے کے قابل ہوتے۔ چہرے سے خشونت نکلنے لگتی۔

اماں کا رویہ مشکبار کی حساس اور غیور فطرت پر تازیانے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ بھی

سب کچھ کھلی آنکھوں دیکھ اور سن رہی تھی۔ مگر وہ تو گل سے بھی زیادہ عاجز اور بے بس تھی۔ گل تو پھر بھی دن کا ایک بڑا حصہ باہر گزار کر رات کو گھر آتے لیکن وہ تو چوبیس گھنٹے سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ کبھی کبھی اماں جھلا کر اس پر پلٹ پڑتیں اور ایک سانس میں سو سو صلو تیں سناڈالتیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے مجرموں کی طرح سنتی رہتی۔



وقت وقت کی بات ہے۔ ورنہ یہی گل تھے، جن کی خاطر تواضع اور عزت و توقیر کرتے نامہ بیگم تھکتی نہ تھیں۔ دیسے تو ان کا سلوک شروع ہی سے بہت اچھا رہا تھا۔ مگر جب سے الیاس کے انتقال کے بعد وہ گاؤں سے لوٹی تھیں اور انہوں نے دل ہی دل میں مشکبار کو گل سے بیانے کا منصوبہ بنا لیا تھا، تب سے تو گل قطعی طور پر ان کی آنکھوں کے تارے بن گئے تھے۔ ہر کام میں انہیں اہمیت دیتیں۔ پیش پیش رکھتیں غرضیکہ گل کو پہلے تو انہوں نے عرشِ معلیٰ پر بٹھایا۔ اور پھر۔۔۔ پل بھر میں عرش سے فرش پر دے پٹھا تھا۔

اس صورت حال سے گل دل برداشتہ تو بہت تھے مگر درحقیقت بے بس اور مجبور تھے۔ ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا وہ ایک سیدھے سادھے اور شریف النفس انسان تھے۔ دنیا کے چھل فریب سے فطری طور پر بہت دور۔۔۔ بچپن سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ باپ کی حوصلہ افزائی اور بڑے بھائیوں کی مہربانی کی وجہ سے اتنے عرصے تک آزادی، خود مختاری اور بے فکری سے تعلیم حاصل کرتے اگر تعلیم کی خاطر شہر نہ پڑے رہتے تو کم از کم گاؤں میں اپنی زمینداری کے کام کاج سیکھے ہوتے۔

اب حقیقت یہ تھی کہ وہ ادھر کے رہے تھے نہ ادھر کے ع نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم نہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اتنا سرمایہ مل سکا کہ کہیں ڈھنگ سے بیٹھ کر کچھ کما

سکتے۔ اور نہ گاؤں میں رہن سہن اختیار کر سکے۔ اوپر سے افتاد یہ پڑی کہ نامہ بیگم نے اپنی ضد کے پیچھے وقت سے پہلے شادی کے بندھن میں..... بندھوا ڈالا۔ اگر یہ شادی بجائے مشکبار کے بانو سے ان کے بزرگوں کی حسب مرضی ہوتی تو یقیناً یہ حالات بھی نہ ہوتے۔ وہ لوگ ضرور اپنے بیٹے کا ساتھ دیتے۔ اسے حسب وعدہ کاروبار کرتے، اور اب تو محض ایک نامہ بیگم کی جہالت نے کئی طرف آگ لگادی تھی۔

ایک رات --- جبکہ دلشاد اور شمشاد سوچکے تھے مشکبار نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔
 ”آپ نے گاؤں سے آنے کے بعد بتایا نہیں کہ..... وہاں آخر ہوا کیا؟“
 گل کچھ دیر خاموش لیٹے سوچتے رہے پھر بڑی آہستگی سے جواب دیا۔ ”اتنے دن ہو گئے تمہیں خود اندازہ نہیں ہو سکا! میرا خیال ہے ایسی بے وقوف تو تم بھی نہیں ہو کہ..... کچھ نہ سمجھو۔ کم سے کم اماں کے سلوک نے تو بہت کچھ..... بتا ڈالا ہو گا..... کیوں؟“

وہ شرمندہ سی ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

گل اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

”میرا مطلب تمہیں شرمندہ کرنا نہیں ہے۔ میں نے تو ایک سرسری سی بات کہہ دی۔ گاؤں کے متعلق تمہیں کیا بتانا، کوئی حوصلہ افزا بات ہوتی تو تمہیں خوشی خوشی بتاتا بھی۔ وہاں کے مایوس کن حالات میں نے فقط ابامیاں کو بتلائے تھے۔ وہ بھی ان کے دریافت کرنے پر، انہی نے شاید اماں کو بتا دیئے ہیں۔ اسی لئے وہ مجھ سے برگشتہ ہو چکی ہیں۔ اور بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔“

”کیا عباس بھائی صاحب نے آپ کو برا بھلا کہا تھا؟“ ان کے خاموش ہوتے ہی

مشکبار نے جلدی سے پوچھا۔

گل نے ایک نظر اسے بغور دیکھا پھر رنجیدہ لہجے میں بتانے لگے۔ ”تمہاری دل شکنی اور رنج کرنے کی وجہ سے میں بتاتا تو کبھی نہ۔ مگر تم بھی ہاتھ دھو کر پیچھے ہٹ گئی ہو اور ویسے بھی سوچتا ہوں کہ آئندہ حالات معلوم نہیں کیسے ہوں۔ اس لئے تمہیں صحیح حالات سے آگاہ رکھوں تو بہتر ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رک گئے۔ مشکبار کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”سنو مشکبار!“ وہ اس سے نگاہیں چار کئے بغیر گویا ہوئے۔ ”وہ لوگ ہمیں اس قدر..... حقیر اور کمتر سمجھنے لگے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ وہاں جا کر مجھے ایسے ذہنی عذاب اور کوفت سے دوچار ہونا پڑا جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، اگر میری جگہ تم ہو تیں تو روتی ہوئی واپس آتیں۔۔۔ میں یہاں سے یہ سوچتا ہوا گیا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی سب چھوٹے بڑے میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ چپکے سے شاید کر لینے پر جانے کیسے کیسے طعنے دیں۔ شکوے شکایات کے دفتر کھول دیں۔ بھائیوں سے جان چھڑانی تو قطعی مشکل ہوگی۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ بڑوں کے سامنے جواب دہی ہوگی۔ تب میں کیا کروں گا؟ اپنی مرضی کا مالک ہونے کے باوجود ان کے روبرو ان کے سوالوں کے جواب دینا بہت دشوار لگ رہا تھا۔ اگر میرا جانا از حد ضروری نہ ہوتا تو شاید ہرگز نہ جاتا۔ یا کم از کم جاتا تو اماں کے ساتھ جاتا۔ اب ساری سوچوں کی وجہ سے میں بہت ڈرتا جھجکتا اور قدرے خوف زدہ سا وہاں گیا تھا۔

مگر --- تمہیں سن کر تعجب ہو گا مشکبار! کہ --- میرے ساتھ وہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ کسی نے لعن طعن کی۔ نہ شکوے شکایت کے دفتر کھلے۔ نہ بھائیوں نے چھیڑا۔۔۔ حتیٰ کہ میری اتنی پیار کرنے والی فاطمہ پھوپھو تک نے کوئی سوال جواب نہ کیا۔ سب کے لبوں پر ایک ایسی خاموشی، ایسی جامد چپ کی مہر لگی تھی، جسے میری کوئی..... کوشش نہ توڑ سکی۔ یہ ایک ایسی اذیت ناک سزا تھی جس نے میرے دماغ کا



دسمبر کی ایک بے حد بخ بستہ دوپہر تھی۔
جب دودن کی مسلسل تکلیف کے بعد مشکبار کو قدرت نے ایک عدد تندرست اور
پیارے سے بیٹے کی ماں بنا ڈالا۔

نائمہ بیگم نے سکھ اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ورنہ ان کی جان تو ہولوں میں ہی
ختم ہوئی جارہی تھی۔ خون کی کمی اور کمزوری کی وجہ سے مشکبار کی جان بس خدا خدا کر
کے ہی بچ پائی تھی۔ گھبراہٹ ہی گھبراہٹ میں نائمہ بیگم نے ماسٹر اس معاملے میں وہ
بہت چھوٹے دل کی ثابت ہوئی تھی۔

ماسٹر صاحب کی بیوی نے جب انہیں ہنستے ہوئے نائی بننے کی مبارکباد دی تب ان
کی جان میں جان آئی اور انہوں نے بے اختیار پوچھ لیا تھا۔ ”کیوں بہن! مشکبار تو ٹھیک
ہے نا؟“

”بالکل بھلی چنگی۔“ انہوں نے کھکھلا کر جواب دیا تھا۔

اتفاق۔۔۔ یا خوبی تقدیر سے اسی دن گل کو ان کے وکیل نے کوئی کیس جیتنے کی
خوشی میں کچھ روپے دے دیئے۔ ایسا کافی دنوں کے بعد ہوا تھا۔
رات کو وہ خوش خوش گھر آئے۔ یہاں آکر بیٹے کی خوش خبری ملی۔ جوش مسرت

جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے دن میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں دل سے
خواہش کرتا تھا کہ کاش! یہ لوگ مجھے طعن طعن کریں۔۔۔ مجھے گالیاں دیں۔ برا بھلا
کہیں۔ مجھ سے سوال کریں پوچھیں کہ ان سب سے کیوں کٹ کر رہ گیا ہوں۔ مگر.....
ان کے ٹھنڈے رویے نے مجھے اندر سے برف کر دیا۔ بظاہر کوئی بات ایسی بھی نہ تھی
کہ جس کی پکڑ کی جاسکتی۔ یا مجھے شکایت کرنے کا موقع ملتا۔۔۔ یا میں اپنی صفائی میں کچھ
کہہ سکتا۔ بغیر مانگے بھابھیاں کھانا سامنے رکھ دیتیں، جس چیز کی ضرورت ہوتی بلا کہے
مل جاتی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب مجھے بھول چکے ہیں۔ یا میرا شمار ان سب میں نہیں
ہوتا۔ وہ پہلے کی سی فضا تھی نہ ماحول۔ کم سے کم میرے لئے سب کچھ بدل چکا تھا۔
بالآخر میں نے عباس بھائی کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔

میری طرف براہ راست دیکھے بغیر انہوں نے بغیر بحث و تمہید کے جواب دیا۔
”ہمارے پاس تمہارے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ کسی مغالطے میں یا خوش
فہمی میں مبتلا مت رہنا۔ نہ ہی زندگی کے کسی بھی موڑ پر آئندہ یہاں کچھ لینے دینے کی
نیت سے آنے کی زحمت گوارا کرنا۔ بے شک قانون طور پر یہاں زمینوں کی آمدن
وغیرہ میں تمہارا حصہ ہے مگر اب اس وقت کہ جب قانون کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اگر اس
سلسلے میں ابا میاں نے تمہاری حمایت کی تو میں از خود ان سے بات کر لوں گا۔“
اس سے زیادہ نہ انہوں نے کچھ کہا، نہ میں سن سکا اس کو رے جواب نے باقی کوئی
گنجائش نہ چھوڑی تھی۔“

اتنا کہہ کر گل خاموش ہو گئے۔

مشکبار کسی گہری سوچ میں ڈوبی سامنے دیوار کی طرف دیکھے جارہی تھی۔

آنکھوں میں شفاف آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔۔۔ جانے کیوں!

سے وہ تو گلزار ہوا ٹھے اور سارے روپے بڑی سعادت مندی سے اماں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ تو سمجھے تھے اماں بہت خوش ہوں گی مگر انہوں نے منہ بنائے بنائے کہا تو یہ کہا۔

”دیکھو میاں! بچے کا باپ بنا کھیل تماشہ ہے نہ ہنسی مذاق۔۔۔۔۔ ان روپوں میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا کہ دائی کے اخراجات پورے ہو جائیں یا میں ہاتھ کھینچ کھانچ کر تھوڑا سا اچھوانی (حریرہ) کا سامان منگوالوں۔ مگر گوند کا سارا سامان، گھی اور میوہ جات تو آنے سے رہے۔ اس لئے جتنی جلد ممکن ہو سکے مجھے روپے کا بندوبست کر کے دو۔۔۔۔۔

اوپر سے جاڑے آچکے ہیں۔ ماں بیٹا دونوں کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ اب آنکھیں بند کر کے کام نہیں چل سکتا۔ وہ تو میری بھولی بھالی لڑکی ہی تھی جس نے کبھی تم سے کوئی فرمائش کی نہ اچھا پہننے اوڑھنے اور کھانے کو مانگا۔ جیسا بھی ہوا تنگی ترشی سے گزر اوقات کرتی رہی۔ لیکن..... میں تو یہ سب برداشت نہیں کر سکتی! بہت دنوں سے چپ ہوں۔ مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میری مظلوم بچی جس طرح خون کی کمی اور مسلسل بیماری کی وجہ سے مر رہی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔“

آج نانہ بیگم نے بہت دنوں کی تھمی ہوئی بھڑاس نکال ڈالی تھی۔

گل سر جھکائے چوروں کی طرح سناکے۔ اس کے سوا ان کے اختیار میں کیا تھا! یہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ اب اماں کے ہاتھوں عزت محفوظ رہنی ممکن نہیں۔ مگر ان کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بیٹے کا باپ بننے کی جتنی خوشی ہوئی تھی سب کر کری ہو گئی۔ مشکبار بے چاری کو ڈھنگ سے مبارکباد دے سکے نہ بچے کو دل کھول کر پیار کر سکے۔ دل میں تو ساس جی کی باتوں نے پھانسا چبھا ڈالی تھی۔ روح میں شگاف کر دیئے تھے۔۔۔

چھٹی تب تو نانہ بیگم نے کسی نہ کسی طرح بکتے جھکتے، سو سو باتیں بناتے مشکبار کو اچھوانی پیس پیس بگھار بگھار پلائی۔ مگر پھر ہمت ہار دی۔ وہ بھلا اس مشقت کی کہاں

عادی تھیں۔ وقتی طور سے مشکبار سے ہمدردی تو بہت ہو گئی تھی مگر جب اسے چارپائی پر پڑے سب کچھ پہنچانا پڑا تو بگڑا انھیں۔

یوں بھی وہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ انسان تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گل سے مزید بد ظن اور برگشتہ ہوتی چلی گئیں۔

ان کا خیال تھا کہ گل میں ہی کوئی ڈھنگ نہیں ہیں ورنہ یہ حالات نہ ہوتے۔ پہلے پردھلایہ ہوا کہ گل باوجود ہزار کوشش کے مشکبار کے لئے گوند کا سامان مہیا کر سکے نہ مزید پیسے کا بندوبست..... کہ نانہ بیگم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بیٹی کو گوند بنا کر کھلا سکتیں۔

ان کا کہنا تھا کہ جو مرد زچہ کے اخراجات نہ اٹھا سکے، وہ شوہر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ ایسے نکٹھو مرد بچے ہی مت پیدا کرو۔

کئی دفعہ انہوں نے ابامیاں سے بھی کھلم کھلا کہا۔

”گل کے ساتھ شادی ہو کر۔۔۔ میری بچی کا نصیبہ پھوٹ گیا۔“

غرض یہ کہ حالات بدستور یہی رہے اور مشکبار نے چارپائی چھوڑ کر کام پکڑ لیا۔ وہ ایک صابر اور حساس لڑکی تھی۔ وقت اور حالات نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایک طرف بے قصور شوہر کی عزت بھی عزیز تھی تو دوسری طرف اس امر کا بھی شدید احساس تھا کہ وہ حالات کے ستم اور اپنی کم نصیبی کی وجہ سے ماں اور سوتیلے باپ کے ٹکڑوں پر پڑی ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن تھا، اپنی ہڈیاں چلائے جاوے۔



کڑا کے کا جاڑا۔ اور اوپر سے سارا دن گھر کا کام دھندا، ننھا سا معصوم بچہ، مشکبار کو دن میں جیسے ہی فرصت ملتی بچے کو چھاتی سے چمٹا کر بیٹھ جاتی۔

آج کل دن ایسے بوند بھر کے ہو گئے تھے کہ کام نمٹاتے ٹھنڈی بخ بستہ رات سر پہ آجاتی۔ اس کا بیٹا بالکل باپ کا ہمشکل تھا۔ ننھی سی عمر میں ماں بن گئی تھی۔ اسے کلیجے سے چٹا چٹا کر جی رہی تھی۔ بعض اوقات اسے لگتا جیسے دنیا بھر میں بس یہ ایک خوشی قدرت نے اس کی تار تار جھولی میں ڈال دی ہو۔

دلشاد اور شمشاد بھی اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔

مگر قدرت ہر کسی کو تو ایسی خوشی راس نہیں آنے دیتی۔ مصلحت وہی نیلی چھتری والا جانے۔

حرارت تو اسے کئی دن سے تھی۔

لیکن مشکبار نے اماں کے گل پر بگڑاٹھنے کے خیال سے ظاہر نہ کیا۔ ایسی تجربے کار بھی نہ تھی کہ بچے کی صحیح حالت کو سمجھ پاتی۔ سر شام ہی اس کا ننھا سا پنڈا بخار کی شدت سے تپنے لگا تھا۔ گل کے آتے آتے ہلکی ہلکی کھانسی بھی اٹھنے لگی۔

دونوں میاں بیوی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی گل کی جب میں حسب دستور پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی رات کے اس سے بغیر پیسے کے کس ڈاکٹر حکیم کو جا جگاتے! اماں سے کہتے لحاظ آ رہا تھا، وہ کہتیں کھاپی تو مفت کار ہے ہیں۔ اب ان کا دوا علاج بھی کراؤ۔ سوچا صبح تک خود ہی اتر جائے گا بخار ہی تو ہے!

اگلی صبح اتوار تھی۔۔۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اوپر کی منزل میں دن چڑھے تک الو بولتے رہے۔ آج کے دن ابا میاں دیر تک آرام کیا کرتے تھے۔ اور ان کے آرام میں خلل نہ پڑنے کے مارے نانمہ بیگم کا حکم تھا کہ اتوار کے دن کا آغاز دیر سے کیا کرو۔ اس لئے مشکبار دھوپ نٹپنے کے بعد اٹھ کر کام سنبھالتی۔

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اس نے اپنے طاہر بیگ کی خبر لی۔ جو اس کے پہلو میں لیٹا سو رہا تھا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ننھے طاہر بیگ کی آنکھیں کھلی تھیں مگر سانسیں بہت تیز تیز لے رہا تھا۔ مشکبار نے گھبرا کر گل کو جگایا۔ وہ بھی اس کی کیفیت دیکھ کر بدحواس ہو گئے۔

”اف! میرے خدا! اب میں کیا کروں؟“

انہوں نے بے چارگی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ مشکبار بچے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑی لجاجت سے کہنے لگی۔

”اماں اور ابا میاں! تو ویسے بھی آرام کر رہے ہوں گے۔ خدا کے لئے آپ ہی کہیں جائیے اور کسی جاننے والے سے قرضہ مانگ لائیے، اسے حکیم جی کو دکھا دیں!“ گل نے کوئی جواب دیئے بغیر جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ماں بیٹے پر ایک الوداعی نظر ڈال کر باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے کافی دیر بعد نانمہ بیگم کو جانے کس کام سے نیچے آنا پڑا۔ شاید آج جلدی ناشتہ تیار کروانا تھا۔

یہاں مشکبار طاہر بیگ کو گود میں لئے چپکے چپکے زار و قطار رو رہی تھی۔ نانمہ بیگم بچے کی حالت دیکھ کر بھونچکی رہ گئیں۔ ان کی تجربہ کار آنکھوں نے پل بھر میں اس کی پہلی چلتے محسوس کر لی تھی۔

”اس کی یہ حالت کب سے ہوئی؟ تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟“ انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

”ہائے اللہ جی! رات کو تو بالکل ٹھیک تھا۔۔۔ بس تھوڑا تھوڑا گرم لگ رہا تھا۔“ اس نے رو کر جواب دیا۔

”اور..... یہ گل کہاں غائب ہے؟ رات کو آیا ہی نہیں کیا آوارہ کہیں کا۔“ انہوں نے جلتے جلتے لہجے میں پوچھا۔



وہی بات جس کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹر نے ڈبل نمونیہ بتا کر دوا دے دی۔

لیا۔ لڑکا بیمار ہوا تو دوا نہ علاج۔۔۔ نہ پیسہ نہ کوڑی۔۔۔ حتیٰ کہ اسی عالم میں چل بسا۔۔۔ اور اگر ہم انتظام نہ کرتے تو بے گور و کفن پڑا ہوتا۔“

”استغفر اللہ۔“ ابامیاں سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ پہلو بدل کر بے اختیار بول اٹھے۔
 ”تمہاری زبان کے سامنے بھی مل چلتے ہیں نائمہ بیگم..... آخر کو وہ میرا پوتا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ بے گور و کفن پڑا ہوتا! بات سوچ سمجھ کر زبان سے نکالا کرو۔ اسی زبان سے تم نے ایک دن ان دونوں کی شادی کا مطالبہ کیا تھا اور آج اسی زبان سے ’طلاق‘ کی ضد کر رہی ہو! کیا یہ شریفوں کا قاعدہ ہے؟“

”تو گویا، ہم رذیل ہو گئے؟“ وہ غصے سے بے قابو ہو کر مزید زور سے چیخیں۔ ”آپ کا وہ..... لڑکا بہت شریف ہے جس نے میری ہیرا اسی لڑکی کی قدر نہ جانی۔ جسے کڑھا کڑھا کر پچاس بیماریاں لگا ڈالیں۔ اپنے کھٹوپن میں گود تک اجڑا ڈالی۔ جس کو مانگے سے کہیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ جو بیوی کا خرچ نہ اٹھا سکے، اسے بیوی رکھنا کیا فرض ہے! دیکھئے! میں صاف صاف کہہ دے رہی ہوں کہ میری لڑکی کو صرف اور صرف طلاق چاہئے۔ یہ میری فاش غلطی تھی کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اور ظاہری ستھرائی دیکھ کر مشکبار کی قسمت پھوڑ دی۔ لیکن۔۔۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ طلاق دلو اگر میں اس کی کسی ڈھنگ کی جگہ شادی کروں گی اور جہاں تک ممکن ہو اپنی غلطی کا ازالہ کروں گی۔“
 اوپر یہ خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی اور زینے کے بیچ کھڑی مشکبار تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جس کے بچے کا ابھی کفن بھی اجلا تھا اور ماں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ گویا مشکبار اور گل کی کوئی مرضی ہی نہ تھی۔ جب چاہا، جس سے چاہا بیاہر چا دیا۔ اور جب جی چاہا طلاق مانگ لی۔

”اماں..... اماں! یہ کیا کر رہی ہیں آپ! ہائے اللہ کیا ہونے والا ہے؟“ وہ روئے جا رہی تھی۔ ساری جان کانپنے جا رہی تھی اور اپنے آپ سے کہے جا رہی تھی۔

”..... طلاق..... اور صرف طلاق..... یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔“ نائمہ بیگم غصے سے لال بھھو کا ہو رہی تھیں۔

اس وقت وہ ابامیاں کے سامنے بیٹھی تھیں اور انہوں نے یہ جملہ اپنے تئیکے پر ایک زوردار مکار سید کر کے ادا کیا تھا۔ ان کے لہجے میں ایک عجیب سی ضد اور کھٹکتا ہوا تحکم تھا۔

ابامیاں کو بے اختیار وہ دن یاد آ گئے، جب بالکل اسی لہجے، اسی انداز، اسی تحکم کے ساتھ نائمہ بیگم نے ان سے گل اور مشکبار کے نکاح کا مطالبہ کیا تھا!

”سنا آپ نے!“ وہ ایک دفعہ پھر آپے سے باہر ہو کر چلائیں۔ ”میں اپنی لڑکی کو اب ہر گز بھی مزید تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ آپ کا کھٹو لڑکا بیوی کے لائق ہی نہیں ہے۔ اس سے تو سورنگ کی باتیں بنالو۔ جس روز سے یہ شادی ہوئی ہے، اس نے کسی دن بھی مشکبار کو کوئی شوق کی چیز لا کر دی! اس کا دل رکھا! سوائے فاقہ مستیوں اور غربت کے ہے اس کے پاس کچھ؟ ایسا کیا اندھیر کچھ کما کجا ہی نہیں سکتا۔ ہاتھ پیر مفلوج ہیں کیا! میں مشکبار کو مزید جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔ غضب خدا کا..... کن خرابیوں سے بچے کے باپ بنے۔ سب کچھ میری مظلوم لڑکی نے اپنی ہڈیوں پر جھیل

اسی دن سے

نائمہ بیگم کو جیسے رٹ لگ گئی تھی۔۔۔ طلاق۔۔۔ طلاق۔۔۔ طلاق۔۔۔ گھر کیا تھا ایک اکھاڑا بن چکا تھا۔ انہیں ایسی اپنی فطری ضد سوار ہوئی تھی کہ اپنی گھریلو زندگی میں بھی آگ لگانے پر تل بیٹھی تھیں، گل کی اتنی جانی دشمن ہوئیں کہ ان کے قدموں کی چاپ تک سے بھڑک اٹھتیں۔



ابامیاں جتنا چاہ رہے تھے کہ ناپسندیدہ مطالبہ نہ دہرائیں۔ گھر کا سکون غارت نہ کریں وہ اتنی ہی آپے سے باہر ہوتی گئیں۔ ہر لمحہ تلوار بے نیام رہنے لگیں۔ کئی بار ابامیاں نے ٹھنڈے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں عباس سے بات کر چکا ہوں وقتی اختلاف ہے سب ختم ہو جائے گا۔ اس فصل پر نہیں تو آئندہ فصل پر وہ گل کو ضرور کاروبار کے لئے رقم مہیا کرے گا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ نائمہ بیگم کے دماغ کو چڑھ چکی تھی۔ 'طلاق' کا بھوت سر چڑھ کر بول رہا تھا پورے زوروں سے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ۔۔۔ نائمہ بیگم نے جاہل اور پھوہڑ عورتوں کی زبان کا آزادانہ استعمال شروع کر دیا اور اٹھتے بیٹھتے پکارتیں۔

”طلاق نہ دینے والے کتے کی موت مریں۔۔۔“

”خدا کرے سب پر بجلی کا گولہ ٹوٹے۔۔۔“

”سب کے سب بے موت مارے جائیں۔۔۔“

ایسی اور اس سے بھی بدتر گالیاں اور کوسنے ایجاد کر کے باپ بیٹے کو سناتیں۔

اور حرامی کالفظ ابامیاں کے لئے کائنات کی سب سے بڑی گالی تھا۔

ایک رات۔۔۔

نمازِ عشا کے بعد وہ گل کو کان سے پکڑ کر مسجد میں لے گئے۔

اور وہیں پر۔۔۔۔۔ مشکبار کو طلاق دلوا دی۔

اللہ اللہ۔۔۔۔۔ کس درجہ مجبور اور بے بس تھی مشرق کی وہ بیٹی جس کا دل اندر ہی اندر اس سانحہ عظیم پر کراہ رہا تھا۔ مگر زبان پر چپ کی مہر لگی تھی۔۔۔۔۔ کتنا صابر، مظلوم اور نیکس تھا وہ بیٹا۔۔۔۔۔ جسے لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی طلاق دینی پڑی۔۔۔۔۔

دونوں کو یہ قطع تعلق نامنظور تھا۔۔۔۔۔

مگر دونوں ہی کو۔۔۔۔۔ 'ہاں' کرتے بنی۔

ایک ماں کی طرف سے مجبور تھی تو دوسرے فریق کو باپ نے بے بس کر ڈالا تھا۔



سننے میں یہی آ رہا تھا کہ وہ۔۔۔۔۔ بہت بڑا آدمی تھا۔

امیر کبیر اور دھن دولت والا۔۔۔۔۔ روپیہ پیسہ اس کے گھر کی باندی اور مالی سکھ چین اس کی دہلیز کے دست بستہ غلام۔۔۔۔۔

تھوک پر چون کی بڑی دوکانیں تھیں۔ وہ عام لوگوں کو اس کنٹرول کے زمانے میں ولایتی چینی اور مٹی کا تیل سپلائی کرتا تھا۔ اور کئی طرح کے کاروبار اس کی مٹھی میں تھی۔ غرضیکہ روپے پیسے کی اس کی ہاں کوئی کمی اور محرومی نہ تھی۔

نائمہ بیگم اور کیا چاہئے تھا۔ وہ بار بار کہیں،

”ارے یہ سب میری مشکبار کا کھلنے والا اونچا مقدر ہے کہ اتفاق سے اس کے ماموں جان ادھر آنکے اور یہ شاندار اور بڑھیا رشتہ بتادیا۔ اللہ انہیں سکھی رکھے۔

اور حقیقت میں یہ رشتہ ذاکر حسین نے لگایا تھا۔ جو خدا جانے کس طرح گھومتے

پھرتے ایک دن ادھر آنکے تھے، یہ وہی دن تھے جب مشکبار کی طلاق ہوئی تھی اور نائمہ

بیگم ادھر ادھر ملنے والوں سے کسی اچھے اور پیسے والے 'بر' کی تلاش کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ ہو۔۔۔ لڑکارو پے پیسے والا ضرور ہو۔

طلاق کے بعد گل نے یہاں رہنا چھوڑ دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں رہ رہے تھے! ابامیاں کو نامہ بیگم کی سرگرمیوں سے کوئی واسطہ تعلق نہ تھا۔ سیاہ و سفید کی مالک وہی تھیں۔ مشکبار کو دوبارہ بیاہتیں، یا نہ۔۔۔ ان کی مرضی ضرور منحصر تھا۔ لڑکی ویسے ہی اللہ میاں کی گائے تھی۔ اب چاہے جس بھی کھونٹے سے باندھ دی جاتی!

انہیں حسب مرضی 'بر' مل گیا تھا۔ ساری تفصیلات ذاکر حسین نے مہیا کی تھیں ایک مدت کے بعد دونوں بہن بھائی میں دوبارہ گھٹ گھٹ کر باتیں ہوئیں۔ اندر ہی اندر معاملات طے ہوئے، رسموں اور شرائط پر تبادلہ خیالات ہوا۔ غرض یہ کہ ہر مسئلے پر تفصیل سے بات چیت ہوئی لڑکے کی طرف سے ہر ذمہ ذاکر حسین نے اپنے سر قبول کیا تھا اور ہر طرح سے بہن کو اطمینان دلایا تھا اور بار بار بے فکر رہنے کی تاکید کی تھی۔ ایک روز بہن کے اصرار پر ذاکر حسین اس لڑکے کو اپنی کار پر ذرا سی دیرو کو لائے بھی نامہ بیگم نے دیکھا اور پسند بھی کیا چند ضروری قسم کی باتیں بھی طے کر لیں۔

اور اس طرح۔۔۔

مشکبار کی رائے لئے بغیر ایک بار پھر نامہ بیگم نے اس کے دو بول پڑھوا دیئے۔ رخصتی کے وقت اس کا کیا حال ہو، دلشاد اور شمشاد نے کیسی کیسی چچھاڑیں کھائیں اور اس کا سرخ زرتار آنچل پکڑ پکڑ کر نہ جانے کی التجائیں اور فریادیں کیں۔۔۔ دیکھنے والوں کے کلیجے شق ہوتے تھے۔

گھونگھٹ کی اوٹ میں اس مظلوم و یتیم لڑکی کو غش آ گیا۔۔۔ مگر رخصتی مسلم تھی۔۔۔ وہ کسی دوسرے کے نام کی ہو چکی تھی۔ بھائیوں کے پاس کیسے رہ جاتی؟ کون رہنے دیتا۔

نیچے کا وہ کمرہ جو ایک زمانے سے اس کے دم سے آباد تھا جہاں اس نے بھائیوں کے ساتھ بچپن کا ایک حصہ گزارا۔۔۔ جس کمرے کو میکہ بھی سمجھا۔۔۔ سرال بھی جانا۔۔۔ گل کو ایک نئے روپ میں بھی دیکھا، جہاں ماں بھی بنی، گود بھی اجڑی، طلاق بھی پائی، سزا بھی کھائی۔۔۔ اس کے جانے کے بعد وہی کمرہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ اس رات۔۔۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے چٹ کر خوب روئے۔

ان کی آپا بچھڑ گئی تھی، آج وہ سچ بچ تھا ہو گئے تھے۔۔۔ جیسے بن ماں باپ کے بچے! صحیح معنوں میں مشکبار اس دن بھائیوں سے جدا ہوئی تھی۔

ورنہ کسی نہ کسی صورت ایک دوسرے سے بچھڑنے تو نہیں پائے تھے۔ ان دونوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی آپا کن کالے کوسوں بیاہ کر گئی ہے! کونسا دیس تھا وہ! دونوں کہاں ڈھونڈھنے جاتے اسے۔ انہیں مزے مزے کی کہانیاں سنا سنا کر سلانے والی جاچکی تھی۔۔۔ ان کی بے ضرر ضدیں اور شرارتیں سہنے والی جانے کہاں چھپ گئی تھی! اب ان کے اسکول کے بے کون ٹھیک کرے گا! اماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے کون بچائے گا۔ پیار سے ماتھا چوم کر گود میں کون بھرے گا۔

اور پھر وہ سچ بچ اپنے بھائیوں سے ایسی بچھڑی کہ پھر کبھی نہ مل سکی۔ دل اندر ہی اندر گئے خون کے رشتوں کو پکارا تارہا۔

وقت کے سرد و گرم میں سال، صدیاں بن کر بیت گئے اور وقت کا پیچھی اپنے نوکدار بچوں میں لمحوں کی ڈور تھا مے کہیں سے کہیں جا پہنچا، مگر مشکبار کا میکہ لوٹ کر نہ آتا ہوا۔ اسے ایک دیو کی قید سے رہائی نہ نصیب ہو سکی۔ وہ اپنی قسمت پر شاکر تھی۔ سارا دن کام دھندے میں نمٹ جاتا تو رات کو لیٹ کر گئے دنوں کا شمار کرنے لگتی۔۔۔ دلشاد اور شمشاد کتنے بڑے بڑے ہو گئے ہوں گے! ابامیاں اور اماں کس حال میں ہوں گے۔۔۔ گل خبر نہیں کہاں۔۔۔ اور کیسے ہوں گے؟



اس آدمی، سعید خان کے جتنے بھی قصبے اس نے وہاں اپنے گھر میں سنے تھے، سب حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے تھے، بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی کھانا پیتا اور امیر آدمی تھا۔ بڑے بڑے کاروبار میں اس کا ہاتھ تھا۔ سامان سے بھری بھرائی دکانیں، یہ بڑا عظیم الشان گھر تھا۔ اور گھر میں بہت سارے لوگ تھے۔

جی ہاں۔۔ بہت سارے لوگ۔ کئی ایک اس سے کہیں بڑی اس کی سوتیلی بیٹیاں تھیں۔۔ ایک شادی شدہ سوتیلی بیٹا تھا۔ اسی ترتیب سے ایک بہو اور چند پوتے پوتیاں بھی۔۔ اور۔۔ ایک عدد بھاری بھر کم سوت بھی تھی۔

سعید خان کی امارت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

کسی زمانے میں وہ بہت حسین اور رعنائی کا مجسمہ رہا ہو گا۔ مگر اب پچاس پچپن کے پینے میں آکر زمانے کے سرد و گرم کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ یوں بھی وہ ایک سخت گیر اور تند خور مرد تھا لہجے میں کاٹ سرکشی، دولت کا غرور، اپنی بڑائی کا زعم۔ بات کرتا تو طنز کے پیرائے میں۔ عورت در حقیقت اس کے نزدیک پیر کی جوتی تھی۔ اس نے مشکبار سے شادی محض بیٹے کے ارمان میں کی تھی۔

پہلی بیوی نے اسے پہلا بیٹا دینے کے بعد آگے پیچھے سات عدد ایک سے ایک حسین لڑکی کا باپ بنادیا تھا تاہم یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ کم سے کم ایک بیٹا تو اس نے پیدا کر ہی دیا تھا جس کے صلے میں سعید خان نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکالنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مگر دو چار بیٹوں کا ارمان اس کے دل میں گویا گڑ کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مشکبار سے سب سے پہلی بات بیٹے کی دہرائی تھی اور وہ بے چاری فکر فکر اس اپنی عمر سے کئی گنا بڑے شوہر نامدار کی صورت تکتی رہ گئی تھی جو اس

کی اماں اور ماموں کے بقول 'لڑکا' تھا۔۔۔

اور بیٹے کا مطالبہ کچھ ایسے رعب سے کر رہا تھا جیسے مشکبار کے اختیار میں ہو۔ سال بھر کے بعد۔۔۔

مشکبار کے ہاں پہلی بیٹی نے جنم لیا۔۔۔

سعید خان نے اسے بھرے گھر کے سامنے پیٹ ڈالا۔ اس کی حالت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ دائی پیسے لئے توبہ توبہ کرتی بھاگ گئی، یہاں باقی سب سوتیلے رشتے تھے۔ کون بچاتا؟ کون حمایت و ہمدردی جتاتا۔ وہ اس وحشی کے ہاتھوں پٹتی رہی اور ہسنے والے خوش ہوتے رہے۔ سوتیلی لڑکیاں ٹھنھے لگایا کیں۔ سوت کے دل میں اس ناکردہ گناہ کی توہین اور پنائی سے منوں ٹھنڈک اتر گئی۔

بعد میں تو گویا یہ سلسلہ چل ہی نکلا، ذرا ذرا سی بات پر روئی کی طرح دھنک کر ڈال دی جاتی۔ جوں جوں اس کے ہاں بیٹیوں کا اضافہ ہوتا گیا سعید خان کو گویا اس سے عداوت اور چڑبڑ ہتی گئی۔

تین بیٹیوں کا باپ بن جانے کے بعد جب چوتھی بار مشکبار کا پاؤں بھاری ہوا تو سعید خان نے صاف صاف اسے جتا دیا۔

”اگر اس دفعہ بھی۔۔۔ لڑکی پیدا کی تو تجھے تین طلاقیں کھڑے کھڑے۔“ مشکبار اس مدت میں اپنی جان تک سے بیزار ہو چکی تھی۔ اس نے گڑ گڑا کر دعا مانگی۔ ”اے رب پاک تجھ سے کچھ طلب نہیں کرتی بس عزت کی موت چاہئے۔“ مگر منہ مانگی موت بھی مقدر والوں کا حصہ ہوتی ہے۔

مشکبار بھی زندہ رہی۔۔۔ اور چوتھی بیٹی بھی نوبہ تندرست پیدا ہو گئی۔ یہ وہ یادگار زمانہ تھا جب تقسیم ہند کے آثار مکمل ہو چکے تھے اور گلی کو چپے محبت وطن افراد کے پر جوش نعروں سے گونجنے لگے تھے۔۔۔

”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔۔۔۔۔

لے کے رہیں گے پاکستان۔۔۔۔۔ پاکستان زندہ باد۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔ اتفاق دیکھئے کہ جس رات مشکبار کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی، وہ تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی رات تھی، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی عہد آفریں رات، جب پورا ہندوستان ریڈیو پر کان لگائے بیٹھا تھا، سعید خان بے چینی سے اپنے گھر کے آنگن میں ٹہل رہا تھا۔ کان دائی کی آواز پر لگے تھے۔

چوتھی لڑکی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ بیٹی مبارک ہو خان صاحب۔“

اس کی پہلی بیوی نے ہندو رواج کے کی اوٹ سے سر نکال کر طنزیہ اطلاع دی۔

سعید خان نے ایک سانس میں پچاس گالیاں دے ڈالیں۔ اس نے کھلے ریڈیو کی بات بھی نہ سنی جو اس علاقے کے ہندوستان میں شامل ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

سعید خان نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ۔۔۔۔۔ ایک زوردار ٹھوکر مار کر ہندو رواج ہلا ڈالا اور کمرے میں گھس کر پوری قوت سے دھاڑا۔

”نکل جا میرے گھر سے۔۔۔۔۔ جس دن سے آئی ہے لڑکیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ میں تجھے سات طلاقیں دیتا ہوں۔ جا تجھے طلاق ہے۔ طلاق ہے۔ طلاق ہے۔ میں نے تجھے تیری ساری لڑکیوں سمیت چھوڑا۔۔۔۔۔“

یہ کہتے کہتے اس نے مظلومیت کی تصویر بنی پڑی مشکبار کے بال مٹھی میں پکڑے اور گھسٹتا ہوا گلی میں پٹخ آیا۔ پھر یکے بعد دیگرے ابھی کی پیدائش سمیت چاروں لڑکیوں کو بھی مشکبار کے پاس بٹھا آیا اور خود اندر گھس کر کنڈی لگالی۔

ظلم و ستم اور بربریت کی انتہا ختم ہو چکی تھی۔ نہ کوئی سننے والا تھا نہ ساتھ دینے والا۔ لڑکیاں بلک بلک کر رو رہی تھیں مگر مشکبار کی آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس کی ویران اور سنسان آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ گر سکا۔۔۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

یہ مسلمانوں کا محلہ۔ یہاں سب سے اونچا اور بڑا مکان سعید خان کا تھا۔ وہ یہاں کا سب میں امیر ترین آدمی تھا۔ جو رات کے سناٹے اور ان بوجھل لمحات میں بیوی بچوں کو باہر نکال کر شاید سکھ کی میٹھی نیند سو بھی چکا تھا۔

رات کے اس بھر۔۔۔ جبکہ دنیا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی ان ماں بیٹیوں پر ادھر ادھر گلی کوچوں کے آوارہ گھومنے والے کتے بلے ٹوٹ پڑے۔ کبھی کوئی کتا آکر ستانے لگتا۔ تو کبھی کسی بلے بلی کو شرارت سوجھ جاتی۔ لڑکیاں سہم سہم کر ماں سے چٹ جاتیں۔

مشکبار کے ہوش و حواس تو ویسے ہی معطل ہو چکے تھے اور کچھ تو کر نہ سکی۔ لڑکیوں کو لے کر گلی سے بہت پیچھے ایک۔۔۔ کھنڈر پڑے ہوئے مکان کے سائے میں بھکاریوں کی طرح جا پڑی۔۔۔ مگر گھر کا بند دروازہ اس نے بھی نہیں کھٹکھٹایا۔۔۔۔۔ وہ طلاق کی اہمیت کو سمجھتی تھی۔ وہ پہلے بھی یہ بول سن چکی تھی اب اس میں مزید ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ سعید خان کے جو رستم سہہ سکے۔

بچیاں اونگھ اونگھ کر سو رہیں۔۔۔۔۔ خود اس پر بھی جیسے غشی طاری ہو گئی۔۔۔ تب جیسے۔۔۔ اس کے حواس بیدار ہو گئے۔

اس نے دیکھا شعلوں کی روشنی میں بہت سارے لوگ کلباڑیاں، بلم اور کرپانیں لئے سعید خان کا اونچا گھر گھیرے کھڑے ہیں اور زور زور سے چلا رہے ہیں۔

”ست سری اکال۔۔۔ گرو جی کی جے۔۔۔ ست سری اکال۔۔۔“

”ہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھیں مل ڈالیں۔

”قدرت اتنی جلدی انصاف نہیں کر سکتی! سعید خان کو قیامت کے بورے گھسیٹنے ہیں۔“

لیکن انصاف کی گھڑی واقعی آن پہنچی تھی۔

سعید خان پر توبہ کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ سارے علاقے کے سکھوں کا جتھا اس کے بلند و بالا گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ہر کسی کو مال کی کشش کھینچ لائی تھی۔

انہوں نے اندر سے چوہے کا ایک بچہ بھی نہ نکلنے دیا۔ مشکبار کے دیکھتے ہی دیکھتے ظلم و ستم کا گہوارہ وہ گھر جل کر خاک ہو گیا۔ روپیہ پیسہ اور عزتیں وہاں لے نکالنے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے سکھوں نے چاروں طرف سے اس میں آگ لگا دی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان کی خبر لانے لگے۔ اندر بند کمروں کے مکینوں کی چیخیں گونجتی رہیں اور صبح ہونے تک یہ سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ سعید خان کی دولت، روپیہ اور زندگی راکھ کا ایک بلند و بالا ڈھیر بن گئی۔

مشکبار نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے حق و انصاف کا بول بولادیکھا۔ وہ تو ستم سہتے سہتے ایسی بے حس ہو چکی تھی کہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ خدا کی لائٹھی بے آواز ہوتی ہے اور جب ظالموں کا حساب لینے کے لئے گرتی ہے تو تہہ و بالا کر ڈالتی ہے۔۔۔ ذرا سی دیر میں وہاں دوبارہ سناٹا طاری ہو گیا۔ لوٹنے والے فتح کے نعرے لگاتے ہوئے کسی دوسری طرف حملہ کرنے چلے گئے اور اس محلے میں الو بولنے لگا۔

خدا کے اس آنکھوں دیکھے انصاف پر مشکبار ہنستی، کبھی روتی اس کھنڈر سے باہر نکلی اور اپنی نجات دہندہ چھوٹی بچی کو سینے سے چٹائے گھسٹتی ہوئی اسی گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئی جہاں ایک دن سرخ جوڑا پہن کر اتری تھی۔ اور آج۔۔۔ طلاق باکر نکلی تھی۔۔۔



صبح صادق کا وقت تھا۔ ہر طرف مدھم اجالے بکھرنے لگے تھے اور اندھیرے

اجالے کے اس سنگم میں سعید خان کا گھر ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ جیسے ایک ڈرانا خواب۔ ایسے میں اچانک۔۔۔ ایک ٹرک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس سے کچھ فاصلے پر آکر رکا۔ اور اس میں بلوچ رجسٹ کے چند سپاہی کود کود اس کے گرد جمع ہو گئے اور ان میں سے ایک نے مشکبار سے مخاطب کر کے کہا۔

”چلو بی بی۔۔۔ چلو۔۔۔ دیر مت کرو۔ یہ ٹرک پاکستان جا رہا ہے۔ ہم تمہیں پہنچائیں گے۔“

”پاکستان۔۔۔!“ مشکبار کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر کلیاں سی چپک اٹھیں۔

”ہاں پاکستان۔۔۔ مشکبار پاکستان۔۔۔ جو ہم سب کی آخری پناہ گاہ ہے۔“

اتنی مدت کے بعد گل کو سامنے یوں اچانک پا کر مشکبار کی نگاہیں جھپک گئیں۔ مگر آج۔۔۔ معجزوں کا دن تھا، آج قدرت ہر نظارہ دکھانے کو تھی۔ گل نے اس کا گھر دیکھ کر کہا۔

”مشکبار! مجھے معلوم تھا یہ علاقہ ہندوستان میں جانے کو ہے۔ یہ ٹرک مہاجرین کو لے کر پاکستان جا رہا تھا میں نے محض شیعے میں یہاں رکوا لیا۔ بس اب فوراً چل دو۔“

”امی! ہم کہاں جا رہے ہیں!“ مشکبار کی بڑی بیٹی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

”سایہ گل میں بیٹا!“ مشکبار نے گل کی طرف دیکھ کر بے اختیار جواب دیا۔

اس ٹرک میں لئے پٹے مہاجرین کی خاصی تعداد ٹھنسی تھی۔ مشکبار اور اس کی بچیوں کو بھی بٹھالیا گیا۔۔۔ وہیں دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستان سنائی۔

بعد میں گل کی شادی بھی بانو سے کر دی گئی تھی جو اسی برس بیٹھے کی وبا میں چل بسی تھی۔ ایک لڑکا تھا جو گل اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اماں ابا لکھنؤ میں تھے۔ وہاں فساد نہیں ہوا تھا۔

اگلی شام۔۔۔ جبکہ سورج ڈوبنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہ ٹرک لاہور کی

کے سامنے جارکا۔ یہاں لٹ لٹ کر آنے والے مہاجرین کے قافلے کے قافلے پڑاؤ ڈالے تھے۔ کوئی خاندان کے خاندان لٹا کر آیا تھا۔ کوئی رو رہا تھا کوئی بین کر رہا تھا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں گل نے ان سب کو نیچے اتارا۔ اپنے لڑکے اور مشکبار کی بچیوں کو ترتیب سے کھڑا کیا اور سامنے شہر لاہور کی چمکتی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

”یہ سرزمین پاک ہے مشکبار۔۔۔ جس کے خواب ہماری آنکھوں میں بے ہوئے تھے۔ جس کی خاطر اتنی قربانیاں دی گئیں۔۔۔ تم نے ہندوستان سے چلتے وقت کہا تھا نا مشکبار کہ ہم سایہ گل میں جا رہے ہیں۔ تمہارے منہ سے نکلا ہوا یہ جملہ بہت قیمتی ہے۔ میرے نام کی مناسبت سے اسے مت جوڑو۔ یہ کہو کہ پاکستان واقعی ہم لئے پئے مہاجرین کے لئے سایہ گل ہے۔ ہم سب اس کی چھاؤں میں نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ یہاں محنت مزدوری کریں گے اور صاف نیت سے زندگی کے بقیہ دن گزاریں گے۔ پاکستان سایہ گل ہے۔“

مشکبار کی اشکبار نگاہیں لاہور پر جمی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ پاکستان سایہ گل ہے۔“

جرم کے بارے میں سب سے پہلے کی باتیں کرنا
0301-7283296
نیشنل سروسز
نیشنل سروسز

المدينة
کشیہ کاری
نزد مکتبہ مکرملہ
0301-7283296
0334-9630911

آسمین پبلک لائبریری
نزد مکتبہ مکرملہ
0301-7283296
0334-9630911